روحانیت کے تاجدار

پروفیسر اویس لطیف عبداللہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

پاکستان ورچوئل لائبریری پر موجود تمام کتابیں قارئین کے مطالعے اور دعوتی و اصلاحی مقاصد کے لئے اپلوڈ کی جاتی ہیں۔

تنبیہ

کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی سخت ممانعت ہے، اور ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔



فہرست

عنوانات	صفحہ نمبر

پیش لفظ

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْکَرِیْم. اَمَّابعد اَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم.

اَلَا اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ o اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْا یَتَّقُوْنَ o لَهُمُ الْبُشْرٰی فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا فِی الْاٰخِرَةِ ط

ترجمہ:۔ یاد رکھو جو لوگ اللہ کے دوست ہیں انہیں نہ خوف اور نہ ہی وہ غمگیں ہوں گے یہ وہ لوگ ہیں جو اہل ایمان ہیں اور ڈرتے رہے۔ ان کے لیے دنیاوی زندگی میں بھی خوشخبری ہے اور آخرت میں بھی۔

آیات مذکورہ میں اولیاء اللہ کے مخصوص فضائل اور ان کی تعریف اور پہچان اور دنیا و آخرت میں ان کے لیے بشارت کا ذکر ہے۔ اولیاء اللہ کو نہ کسی ناگوار چیز کے پیش آنے کا خطرہ ہوگا اور نہ کسی مقصد کے فوت ہوجانے کا غم۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو صاحب ایمان ہوتے ہیں اور تقویٰ و پرہیز گاری اختیار کرتے ہیں۔

اولیاء ولی کی جمع ہے لفظ ولی عربی زبان میں قریب کے معنی میں بھی آتا ہے اور دوست و محبت کے معنی میں بھی۔ اللہ تعالیٰ کے قرب و محبت کا ایک عام درجہ تو ایسا ہے کہ اس سے دنیا کا کوئی انسان و حیوان بلکہ کوئی چیز بھی مستثنیٰ نہیں، اگر یہ قرب نہ ہو تو سارے جہان میں کوئی چیز وجود میں ہی نہیں آسکتی۔ ولایت و محبت اور قرب کا ایک دوسرا درجہ بھی ہے جو اللہ تعالیٰ کے مخصوص بندوں کے ساتھ ہے یہ قرب محبت کہلاتا ہے۔ جن لوگوں کو یہ قرب خاص حاصل ہو وہ اولیاء اللہ کہلاتے ہیں۔ جیسا کہ ایک حدیث قدسی میں ہے کہ میرا بندہ نفل عبادت کے ذریعے میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ میں بھی اس سے محبت کرتا رہتا ہوں

اور جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں ہی اس کے کان بن جاتا ہوں وہ جو کچھ سنتا ہے میرے ذریعے سنتا ہے۔ میں ہی اس کی آنکھ بن جاتا ہوں وہ جو کچھ دیکھتا ہے۔ مجھ سے دیکھتا ہے۔ میں ہی اس کے ہاتھ پاؤں بن جاتا ہوں۔ وہ جو کچھ کرتا ہے مجھ سے ہی کرتا ہے مطلب اس کا یہ ہے کہ اس کی کوئی حرکت وسکون اور کوئی کام میری رضا کے خلاف نہیں ہوتا۔

اس ولایت خاصہ کے بے شمار درجات ہیں جس میں اعلیٰ درجہ انبیاء علیہم السلام کا ہوتا ہے کیونکہ ہر نبی اللہ کا ولی بھی ہوتا ہے اور ان میں سب سے اونچا مقام سید الانبیاء نبی رحمت ﷺ کا ہے اور ادنیٰ درجہ اس ولایت کا وہ ہے جسے صوفیائے کرام کی اصطلاح میں درجہ فنا کہا جاتا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ انسان کا قلب اللہ تعالیٰ کی یاد میں ایسا مستغرق ہو کہ دنیا میں کسی کی محبت اس پر غالب نہ آئے وہ جس سے محبت کرتا ہے اللہ کے لیے کرتا ہے جس سے نفرت کرتا ہے اللہ کے لیے کرتا ہے۔ اس حالت کی علامت ہے کثرتِ ذکر اور اطاعت دوام یہ دو صفات جس شخص میں موجود ہوں وہ ولی اللہ کہلاتا ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی اسے دوست رکھتا ہے۔

ولایت کا یہ درجہ صحابہ کرامؓ کو بلاواسطہ حاصل تھا اسی وجہ سے ان کا درجہ ولایت تمام امت کے اولیاء و اقطاب سے بالاتر ہے بعد کے لوگوں کو یہی فیض چند وسیلوں سے حاصل ہوتا ہے۔ جتنے یہ وسائل بڑھتے جاتے ہیں اتنا ہی اس میں فرق پڑتا جاتا ہے۔ یہ واسطہ صرف وہی لوگ بن سکتے ہیں جو رسول کریم ﷺ کے رنگ میں رنگے ہوئے ہوں اور آپ ﷺ کی سنت کے پیرو ہوں۔ یہ نسخہ ہے درجہ ولایت حاصل کرنے کا جو تین اجزاء سے مرکب ہے یعنی کسی ولی اللہ کی صحبت، اس کی اطاعت اور ذکر اللہ کی کثرت۔

حضور اکرم ﷺ کے وصال کے بعد نبوت اپنے کمال کو پہنچ کر اختتام پذیر ہوئی لہٰذا آئندہ کوئی نبی یا رسول لوگوں کی ہدایت کے لیے نہیں آ سکتا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ صحابہ کرامؓ، تابعین اور تبع تابعین کے ادوار بھی ختم ہو گئے لیکن اصلاح امت اور ہدایت انسانی کے لیے ایسے افراد کی ضرورت تھی جو حضور اکرم ﷺ کے مشن کو ہمیشہ جاری رکھ سکیں۔ یہ فریضہ اولیائے امت اور علمائے کرام نے سرانجام دیا۔ جن میں سے علماء کے گروہ نے اسلامی شریعت کے تمام ظاہر پہلوؤں کو زندہ رکھا اور اولیاء کرام نے باطنی اور روحانی معاملات کی تبلیغ کر کے عامتہ الناس کا تزکیہ اور تصفیہ کیا۔ برق رفتار فتوحات کے زمانے میں جہاں عساکر اسلام نے اقوام وممالک کو فتح کیا وہاں اولیاء کرام اور صوفیائے عظام نے لوگوں کے قلوب و اذہان کو اپنی شیریں بیانی، کردار و سیرت کی سادگی اور اپنی پرکشش شخصیتوں سے مسخر کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور کے بعد اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا جتنا حصہ اولیاء کرام کا ہے اور کسی گروہ کا نہیں۔ ابن خلدون اپنے مشہور ''مقدمہ'' میں تصوف کے باب میں لکھتا ہے کہ جس قدر دور نبوت اور دیار رسولؐ سے مکانی اور زمانی فاصلہ بڑھتا گیا۔ اسی قدر اس ادارہ ولایت، تصوف، کشف کی نشوونما ہوتی گئی۔

اولیائے کرامؒ تصوف کے تین عناصر ترکیبی بتاتے ہیں۔ کامل توحید، کامل تقویٰ اور کامل محبت اور یہ تینوں عناصر قرآن کریم سے لئے گئے ہیں۔ اسلامی نقطہ نظر سے قرآن کریم کی تمام تر غایت تلقین خدا ہے اور اس میں صاحب تقویٰ لوگوں کی ہدایت کا سامان ہے اور بمطابق آیت ''اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا'' (۱۲۸:۱۶) اللہ تعالیٰ صاحب تقویٰ لوگوں کے ساتھ ہے۔

ان دو عناصر کے بعد تیسرا عنصر محبتِ الٰہی ہے۔ یعنی محبت ہی حصولِ مقصود کا ذریعہ ہے یا حریم ناز تک پہنچنے کا راستہ ہے۔

''وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ''

ترجمہ:۔ اور جو لوگ مومن ہیں وہ سب سے زیادہ محبت اللہ سے کرتے ہیں۔ (۱۲۵:۳)

اس اجمال کی تفصیل اس آیت میں ہے۔

''قُلْ اِنْ کَانَ اٰبَآؤُکُمْ وَاَبْنَآؤُکُمْ وَاِخْوَانُکُمْ وَاَزْوَاجُکُمْ وَعَشِیْرَتُکُمْ وَ اَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْھَا وَتِجَارَۃٌ تَخْشَوْنَ کَسَادَھَا وَمَسٰکِنُ تَرْضَوْنَھَآ اَحَبَّ اِلَیْکُمْ مِّنَ

اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِیْ سَبِیْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ط (۹ : ۲۴)

ترجمہ :- اے رسول! مسلمانوں سے کہہ دیجئے کہ اگر تمہیں اپنے باپ دادا اور بیٹے اور بھائی اور بیویاں اور رشتے دار اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں ۔ اور وہ تجارت جس کی مندی سے تم خائف ہو اور وہ مکانات جنہیں تم بہت عزیز رکھتے ہو۔ اگر ان میں سے کوئی چیز بھی تمہیں، اللہ کے اور اس کے رسولؐ کے اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ محبوب ہے تو پھر انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ صادر ہو جائے۔

ان تینوں عناصر کو زینہ بنا کر اولیائے کرامؒ نے نہ صرف تصوف کی جملہ منازل طے کیں بلکہ یہی محبت اور تقویٰ و پرہیز گاری کی تلقین دوسرے لوگوں کو بھی کی۔ ابتدائی دور میں جب اسلامی قلمرو میں علم کا دور دورہ تھا۔ علم اور تصوف دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہے لیکن جب غیر مسلم عناصر کے امتزاج سے فلسفہ، الٰہیات، منطق، مابعد الطبیعات اور دیو مالائی تصورات اسلامی معاشرہ میں داخل ہوئے اور مسلمان علماء علم کلام کی وجہ سے آپس میں ایک دوسرے کے خون سے ہولی کھیلنے لگے تو اس نظریاتی انتشار سے بچنے کے لیے اولیاء کرامؒ نے مناظروں، مذاکروں اور مباحثوں سے الگ تھلگ، خانقاہوں اور اپنے آستانوں میں انسانوں کے تزکیہ کے ساتھ ساتھ ان تک سیدھا سچا اسلام پہنچانے میں بے پناہ خدمات سرانجام دیں۔

ان اولیائے کرامؒ اور صوفیائے کرامؒ میں اہل تصوف عام طور پر سرفہرست حضرت خواجہ حسن بصریؒ کا نام رکھتے ہیں جو بصرہ کی جامع مسجد میں درس دیتے تھے۔ ان کا شمار گروہ تابعین میں ہوتا ہے۔ ان کے بعد حضرت ابو عبداللہ حارث المحاسبیؒ اور ابو سعید خرازؒ کے نام آتے ہیں جنہوں نے علم الکلام کے ساتھ ساتھ تصوف کی ترقی میں بہت حصہ لیا۔ تیسری صدی ہجری کے معروف صوفی سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ اول الذکر کے شاگرد، غوث وقت حضرت معروف کرخیؒ کے عقیدت مند، سری سقطیؒ کے بھانجے اور حضرت ذوالنون مصریؒ، بشیر بن حارثؒ اور نباجیؒ کے ہم عصر تھے۔ ان کے شاگردوں میں ابو محمد الحریری شبلیؒ، جعفر الخلدی

ابو سعید اعرابی اور ابوبکر محمد بن قحطانی خاص شہرت کے حامل ہیں۔ ان سب نے اپنے اپنے حلقہ ارادت میں اسلام کی اشاعت میں بڑا کام کیا۔ ان کے علاوہ خواجہ عبدالواحد بن زید، خواجہ فضیل ابن عیاضؒ، خواجہ سدید الدینؒ، ابوالخیر حمادؒ کے اسمائے گرامی بھی خاص طور پر قابل ذکر ہیں کہ انہی کے دامنِ تربیت میں گلشن تصور کے معطر و معتبر پھول کھلے اور آسمانِ ولایت کے سورج، چاند اور ستارے روشن ہوئے جن کی ضیاء سے لاکھوں انسانوں نے اکتساب فیض حاصل کیا۔ ان میں آخر الذکر حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کے شیخ طریقت تھے۔

سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کا دور نہایت پرآشوب تھا۔ لوگ فلسفہ، منطق اور علم الکلام کی بھول بھلیوں سے تنگ آ چکے تھے۔ انہوں نے ایک طرف مجاہدہ و ریاضت سے تقویٰ کی انتہائی بلندیوں کو چھولیا اور دوسری طرف اسلام کو اس کی اصل صورت میں پیش کر کے لاکھوں مسلمانوں کی اصلاح کی۔ بہت سوں کو مسلمان بنایا اور متعدد افراد کا تزکیہ کر کے تصوف کی صحیح داغ بیل ڈالی اور باقاعدہ سلسلہ قادریہ عالیہ کے بانی موسوم ہوئے۔

یہی وہ دور تھا جب مسلمانوں کی سیاسی سیادت گہنا چکی تھی۔ اس لیے بعض اولوالعزم مسلم حکمرانوں نے شرق اوسط کے بجائے جنوب مشرقی ایشیاء کو اپنی جولانگاہ بنایا۔ ان کشور کشاؤں اور فاتحین کے ساتھ بہت سے اولیاء کرامؒ نے بھی برصغیر کا رخ کیا۔ سیدنا مخدوم علی بن عثمان ہجویریؒ نے لاہور کو منتخب کیا اور یہاں اسلام کی تبلیغ کی۔ ان کے بعد یکے بعد دیگرے متعدد اولیاء کرامؒ نے سرزمین ہند کو تبلیغی مشن کے لیے پسند فرمایا۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ نے پنجاب اور دہلی میں اپنا نام روشن کیا اور اجمیر شریف تک جا پہنچے۔ ان کی وجہ سے سلسلہ چشتیہ کی یہاں پر داغ بیل پڑی اور پھر ان کے دم قدم سے حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ، حضرت خواجہ مسعود فریدالدین گنج شکرؒ، خواجہ نظام الدین اولیاءؒ اور شاہ نصیر چراغ دہلویؒ جیسی عظیم ہستیاں افق تصوف پر روشن ہوئیں۔ جن کی بدولت لاکھوں انسان مشرف بہ اسلام ہوئے۔ دوسری طرف شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے مریدوں نے خطہ کشمیر میں اسلام کو پھیلایا۔ حقیقت یہ ہے کہ کشمیر

جنت نظیر میں اسلام کی نشوونما کا تمام تر سہرا ہمدانی سادات کے سر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ تصوف تمام رزائل اخلاق سے پاک کرتا ہے، تمام انسانی عیوب کا ازالہ کرتا ہے اور تمام تر زور عمل پر دیتا ہے۔ ایک صوفی اپنے ارادتمندوں سے کہتا ہے کہ میرے پاس آؤ۔ میری صحبت میں بیٹھو۔ میں بالفعل تمہارے نفس کا تزکیہ کروں گا۔ جب طالب حقیقی کسی مردحق کی قسمت اختیار کرتا ہے تو اس پر رنگ چڑھنے لگتا ہے اور یہ رنگ اللہ تعالیٰ کا رنگ (صبغۃ اللہ) ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے تصوف مذہب کی روح ہے۔ یعنی زندہ خدا کے ساتھ زندہ رابطہ پیدا کرنے یا اسے اپنے باطن کی گہرائیوں میں مشاہدہ کرنے کا دوسرا نام ہے۔

تصوف کا پہلا سبق یہ ہے کہ سب انسان اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں۔ اس لیے مجازاً عیال اللہ ہیں۔ اس لیے صوفیاء کرامؒ تمام انسانوں سے محبت کرتے ہیں۔ ان کی محبت کے جواب میں اگر کوئی ان کا راستہ یا مسلک اختیار کرتا ہے تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کا دوست بن جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی دوستی کی وجہ سے اس پر کوئی غم زمانہ، غم زیست اور غم دنیا طاری نہیں ہوتا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی محبت اور ولا کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

وماعلینا الاالبلاغ المبین۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آج سے قریب چودہ سو برس پہلے عرب کے مشہور شہر مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے۔ پیر کا دن صبح صادق کا وقت اور ربیع الاول کا مہینہ تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے والد ماجد کا نام جناب عبداللہ اور والدہ ماجدہ کا نام بی بی آمنہ تھا جناب عبداللہ کے والد عبدالمطلب تھے جو عرب کے سب سے زیادہ مشہور اور معزز قبیلہ قریش کے سردار تھے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے والد ماجد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیدا ہونے سے پہلے ہی وفات پا چکے تھے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چھ سات برس کے ہوئے تو والدہ ماجدہ کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا۔ اب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے دادا عبدالمطلب کے پاس رہنے لگے۔ دو برس کے بعد وہ بھی انتقال کر گئے۔ مرتے وقت انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پرورش کا انتظام اپنے بیٹے ابو طالب کے سپرد کر دیا۔ ابو طالب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے بیٹوں سے زیادہ چاہتے تھے۔ اور ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے تھے۔

بچپن ہی میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کھیل کود اور فضول باتوں سے نفرت تھی۔ کبھی کسی شخص نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لڑتے جھگڑتے جھوٹ بولتے اور کھیل تماشوں میں شامل ہوتے نہ دیکھا۔ جوان ہوئے تو نیک کاموں میں حصہ لینے لگے۔ گلی کوچوں میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعریفیں ہونے لگیں۔ ایمان داری اور سچائی کی وجہ سے لوگ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ''امین'' یعنی امانت والا کہہ کر پکارتے تھے۔

اس زمانے میں حضرت خدیجہؓ مکہ معظمہ کی ایک مالدار بی بی تھیں۔ وہ تجارت

کرتی تھیں۔ انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایمان داری کی تعریف سنی تو اپنا مال دے کر شام کی طرف تجارت کے لئے بھیجا۔ اس تجارت میں بہت نفع ہوا۔ حضرت خدیجہؓ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایمان داری اور محنت سے اتنا زیادہ خوش ہوئیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نکاح کا پیغام بھجوایا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چچا سے مشورہ کرنے کے بعد قبول فرما لیا۔ اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شادی حضرت خدیجہ کے ساتھ ہوگئی۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں عرب کے رہنے والوں کا بہت برا حال تھا جوا کھیلنا۔ شراب پینا۔ لڑائی جھگڑا کرنا اور اسی قسم کی بری عادتیں ان کے بچے بچے میں موجود تھیں۔ سب سے بُری بات یہ تھی کہ پتھروں کے بت بنا کر انھیں پوجتے تھے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان سب برائیوں کو دل سے ناپسند کرتے تھے۔

مکہ معظمہ سے تین میل کے فاصلہ پر ایک پہاڑ ہے جسے کوہ حرا کہتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس پہاڑ کے غار میں جا بیٹھتے اور خدا تعالیٰ کی عبادت کیا کرتے تھے جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر ۴۰ سال کی ہوئی تو ایک دن اس غار میں حضرت جبرائیل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس وحی لے کر آئے اور کہا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پڑھئے آپ نے کہا میں لکھنا پڑھنا نہیں جانتا۔ تب حضرت جبرائیل علیہ السلام نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے سینے سے لگایا اور تین بار زور سے بھینچا اور سورۂ علق کی پہلی آیتیں پڑھائیں۔

یہ پہلی وحی یعنی اللہ تعالیٰ کا پہلا پیغام تھا جو حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ذریعہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا۔ اس کے کچھ دنوں کے بعد پھر وحی آئی اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا کلام اسی طرح تھوڑا تھوڑا کر کے آخر زندگی تک اُترتا رہا۔ ان سب کے مجموعہ کو قرآن شریف کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے جو حکم آتے رہتے انھیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جوں کا توں لوگوں کو سناتے رہتے تھے۔ اس طرح جو تعلیم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دی اسی کا نام

''اسلام'' ہے جو لوگ اس تعلیم پر ایمان لائے انھیں مسلمان کہا گیا۔ عورتوں میں حضرت خدیجہؓ مردوں میں حضرت ابوبکرؓ۔ لڑکوں میں حضرت علیؓ سب سے پہلے ایمان لائے۔ پھر دھیرے دھیرے دوسرے لوگ مسلمان ہونے لگے۔

شروع شروع میں آپ اسلام کا پیغام چپکے چپکے لوگوں کو پہنچاتے رہے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ کا یہ حکم آیا کہ کھلم کھلا اسلام پھیلاؤ۔ اس وقت سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کھل کر اسلام کی تبلیغ کرنے لگے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کو بُرے کاموں سے منع کرنے کے علاوہ بتوں کی پوجا سے بھی روکتے تھے۔ یہ بات مکہ والوں کے کان میں پڑی تو انھیں بڑا غصہ آیا۔ اس میں وہ اپنے دین کی بے عزتی اور اپنے باپ دادا کے معبودوں کی توہین سمجھتے تھے۔ ایک دفعہ سب مل کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا ابو طالب کے پاس آئے اور کہا کہ تمہارا بھتیجا ہمارے دین کو برا کہتا ہے اور ہمارے باپ دادا کے معبودوں کی بے عزتی کرتا ہے اسے سمجھا دو نہیں تو ہم بری طرح پیش آئیں گے۔

جب ابو طالب نے یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ۔ ''اے چچا! لوگ چاہے میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند لا کر رکھ دیں تب بھی میں اپنے فرض سے باز نہ آؤں گا۔'' چچا نے جب بھتیجے کے اس پکے ارادے کو دیکھا تو بولے ''میرے پیارے بھائی کے بیٹے! تو اپنا کام کئے جا، کسی کی مجال نہیں جو تجھے جھڑک سکے۔''

جب مکہ والوں کو یقین ہو گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے کام سے باز نہ آئیں گے۔ اور یہ بھی دیکھا کہ لوگ مسلمان ہوتے چلے جارہے ہیں تو وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھیوں کو طرح طرح کی تکلیفیں پہنچانے لگے۔

جب مسلمانوں پر سختیاں بڑھ گئیں اور ان کو اللہ تعالیٰ کی عبادت سے بھی روکا جانے لگا تب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کچھ مسلمانوں کو مکہ معظمہ سے چلے جانے

کی اجازت دے دی۔ چنانچہ ۱۲ مرد اور ۴ عورتیں ہجرت کر کے ملک حبش میں چلے گئے۔

حبش کی ہجرت کے بعد مکہ کے دو مشہور آدمی مسلمان ہوئے۔ ایک حضرت حمزہؓ اور دوسرے حضرت عمرؓ۔ اب مکہ والوں کے غصہ کی آگ اور زیادہ بھڑک اٹھی۔ اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اور دوسرے مسلمانوں پر پہلے سے زیادہ سختیاں کرنے اور ظلم ڈھانے لگے۔

عرب میں ہمیشہ سے یہ دستور چلا آتا تھا کہ سارے ملک کے لوگ ایک خاص زمانہ میں خانہ کعبہ میں حج کے لئے آتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس موقع پر لوگوں کے پاس جاتے اور ان کو اسلام کا پیغام پہنچاتے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیغمبری کے گیارہویں سال حج کے موقع پر مدینہ منورہ شریف کے چھ آدمی مسلمان ہو گئے۔ انھوں نے واپس جا کر مدینہ منورہ میں ان حالات کی خبر دی۔ دوسرے سال ۱۲ آدمی آئے۔ اس طرح تیزی کے ساتھ مدینہ میں اسلام پھیلنے لگا۔

اب مدینہ منورہ کے مسلمانوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مدینہ منورہ تشریف لے چلنے کی درخواست کی اور اس بات کا عہد کیا کہ سب جان و مال سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ساتھ دیں گے۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کو اجازت دے دی کہ مکہ چھوڑ کر مدینہ منورہ چلے جائیں۔ اب مسلمان آہستہ آہستہ مدینہ منورہ پہنچنے لگے۔ آخر میں خود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی مدینہ تشریف لے آئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مکہ چھوڑ کر مدینہ منورہ چلے جانے کے واقعہ کو ''ہجرت'' کہتے ہیں۔ اسی سال سے سن ہجری شروع ہوتا ہے۔ مدینہ منورہ والوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھیوں کی بڑی خاطر مدارات کی۔ ان مدینہ منورہ والوں کو انصار اور مکہ معظمہ سے ہجرت کر کے آنے والوں کو مہاجر کہتے ہیں۔ انصار کے معنی ہیں مددگار اور مہاجر ہجرت کرنے والے کو کہتے ہیں۔

مکہ معظمہ چھوڑ کر مدینہ منورہ چلے آنے پر بھی کافروں کی دشمنی کچھ کم نہ ہوئی۔ وہ طرح طرح سے مسلمانوں کو تنگ کرنے اور ستانے میں لگے رہے۔ یہاں تک کہ لڑائی پر

آمادہ ہو گئے اور تلوار کے زور سے اسلام اور مسلمانوں کو ختم کر دینے پر تل گئے۔ انھوں نے بہت سی لڑائیاں لڑیں مگر اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ مسلمانوں کو فتح دی۔ یہاں تک کہ مکہ معظمہ کو بھی مسلمانوں نے فتح کر لیا۔ مکہ معظمہ کی فتح کے بعد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سب کا قصور معاف کر دیا۔

اب ملک کے ہر حصہ سے لوگ مدینہ منورہ آ آ کر مسلمان ہونے لگے۔ یہاں تک کہ تھوڑے ہی دنوں میں سارے عرب میں اسلام پھیل گیا۔

جب پورا قرآن شریف اتر چکا اور اسلام کی تکمیل ہو گئی تو ہجرت کے گیارہویں سال یعنی ۱۱ھ میں قریب دو ہفتہ بیمار رہ کر بارہویں ربیع الاول کو ۶۳ سال ۵ دن کی عمر پا کر آپ کی وفات ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مزار اقدس مدینہ شریف میں ہے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آخری پیغمبر بنا کر بھیجے گئے تھے۔ یعنی اب آپ کے بعد اللہ تعالیٰ کا کوئی پیغمبر نہیں آئے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی قرآن شریف کا نمونہ تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یتیموں سے محبت رکھتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق نہایت اعلیٰ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عادتیں نہایت عمدہ تھیں۔ غریبوں اور بے کسوں کی مدد کرتے، مظلوموں کی فریاد سنتے، بیماروں کی عیادت، پڑوسیوں کی خبر گیری اور مہمانوں کی خاطر مدارات کرتے تھے گھر کا سب کام کاج خود اپنے ہاتھ سے کر لیتے۔ اپنے پھٹے کپڑے خود سی لیتے۔ جوتا پھٹ جاتا تو خود گانٹھ لیتے۔ بکریوں کا دودھ دھو لیتے۔ مجلس میں سب کے برابر بیٹھتے۔ سب سے نہایت مہربانی اور شفقت کا برتاؤ کرتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں عرب کا بہت بڑا علاقہ مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا تھا اور بے شمار دولت مدینہ شریف میں آنے لگی تھی، مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ساری عمر غریبی کی زندگی گزاری۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام

حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے ایک بہت مشہور پیغمبر ہوئے ہیں۔ اب سے کوئی چار ہزار برس پہلے آپؑ ملک عراق میں پیدا ہوئے تھے۔ آپؑ کے والد کا نام آزر تھا۔ آزر پتھروں کو تراش کو بت بنایا کرتا تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب چاروں طرف بت پرستی کا زور تھا۔ حضرت ابراہیمؑ بچپن ہی سے بتوں کی پوجا کو ناپسند کرتے تھے۔ انھیں یہ دیکھ کر تعجب ہوتا تھا کہ جن معمولی پتھروں کو گھڑ کر ان کا باپ بت بناتا ہے لوگ اسی کو پوجتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں نمرود نامی ملک عراق کا بادشاہ تھا۔ وہ بڑی شان وشوکت کا مالک تھا۔ اسے اپنی طاقت پر بڑا غرور تھا۔ یہ غرور اتنا بڑھ گیا کہ اپنے آپ کو خدا بتا کر لوگوں سے اپنی پوجا کرانے لگا۔

حضرت ابراہیمؑ کے دل میں شروع ہی سے خدا پرستی تھی۔ وہ جب دیکھتے تھے کہ ان کی قوم بلکہ خود ان کا باپ بت پرستی میں مبتلا ہے تو انھیں بہت رنج ہوتا۔ وہ لوگوں کو سمجھاتے اور اپنے والد سے بھی کہا کرتے کہ تم بے جان بتوں کو خدا کیوں بناتے ہو، جو نہ سن سکتے ہیں، نہ دیکھ سکتے ہیں، نہ بول سکتے ہیں اور نہ کسی کو نفع نقصان پہنچا سکتے ہیں۔

اس کے جواب میں قوم کے لوگ اور ان کا باپ ان کو برا بھلا کہتے اور طرح طرح سے دھمکاتے رہتے تھے۔ مگر آپؑ حق کا راستہ دکھانے سے باز نہ رہے۔

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ راستے میں آپؑ چمکتے ہوئے تارے کو دیکھ کر سوچنے لگے کہ شاید یہی ہمارا رب یعنی پیدا کرنے والا ہو۔ اتنے میں چاند نکل آیا اور تاروں کی روشنی مدھم پڑ گئی۔ حضرت ابراہیمؑ نے خیال کیا کہ چاند تاروں سے زیادہ چمکدار ہے۔ ہو نہ ہو یہی

ہمارا پیدا کرنے والا ہوگا جب صبح ہوئی تو چاند پھیکا پڑ گیا اور تارے ڈوبنے لگے۔ آپؑ نے سوچا کہ مٹنے والے خدا نہیں ہو سکتے اب سورج نکل آیا۔ ایسا روشن اور چمکیلا کہ اس پر نظر نہ ٹھہر سکے۔ آپؑ کو خیال ہوا کہ ہو نہ ہو یہی خدا ہے۔ شام ہوئی تو سورج بھی ڈوب گیا تب آپؑ نے کہا ''بے شک خدا وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں۔''

ایک مرتبہ بڑا مزے دار واقعہ پیش آیا۔ ہر سال بستی سے باہر میلہ لگا کرتا تھا۔ اس دن سب لوگ میلے میں شریک ہو کر جشن منایا کرتے تھے۔ میلے کا دن آیا تو سب لوگ بستی سے باہر چلے گئے۔ مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام نہیں گئے جب سب لوگ میلے میں چلے گئے تو آپؑ گھر سے ایک ہتھوڑا لے کر نکلے۔ بت خانے میں گھس گئے اور اس ہتھوڑے سے تمام بتوں کے ہاتھ پاؤں ناک کان اور سر توڑ ڈالے۔ پھر وہ ہتھوڑا بڑے بت کے کندھے پر رکھ کر اپنے گھر چلے آئے۔

جب لوگ لوٹ کر بستی میں آئے اور بت خانے میں گئے تو بتوں کا یہ حال دیکھ کر انھیں بڑا غصہ آیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پوچھا'' یہ سب کس نے کیا ہے''؟'' آپؑ نے بڑے بت کی طرف اشارہ کر کے کہا'' اس سے پوچھو۔ لوگوں نے کہا اس کو کیا خبر! یہ نہ دیکھ سکتا ہے۔ نہ بول سکتا ہے، آپؑ نے فرمایا۔'' جو دیکھ نہیں سکتا اور بول نہیں سکتا اسے کیوں پوجتے ہو؟'' لوگ یہ سن کر بہت بگڑے اور نمرود بادشاہ کے پاس جا کر آپؑ کی شکایت کی نمرود کو بڑا غصہ آیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دربار میں بلا بھیجا وہ پہلے بحث کرتا رہا۔ جب بحث میں ہار گیا تو ڈرانے دھمکانے لگا۔ مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام خدا پرستی پر قائم رہے۔ اور نمرود کو خدا کا خوف دلاتے رہے۔ آخر میں نمرود نے جھلا کر حکم دیا کہ بہت سی لکڑیاں جلائی جائیں اور اس آگ میں ابراہیمؑ کو ڈال دیا جائے۔ آگ جلائی اور خوب بھڑکائی گئی، پھر حضرت ابراہیمؑ کو اس میں ڈال دیا گیا۔ مگر خدا کے حکم سے آگ بالکل سرد ہو کر پھولوں کی طرح بن گئی۔ اور حضرت ابراہیمؑ کو ذرا بھی تکلیف نہ پہنچی۔

اب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خیال کیا کہ کسی دوسری جگہ چل کر خدا کا پیغام پہنچائیں۔ اس لئے وطن سے ہجرت فرمائی۔ اور مختلف ملکوں میں بندوں تک خدا کا پیغام پہنچاتے رہے۔

حضرت ابراہیمؑ کے بڑے بیٹے حضرت اسماعیلؑ تھے اور چھوٹے حضرت اسحٰقؑ۔ آپؑ نے حضرت اسحٰقؑ کو ملک شام میں بسایا اور حضرت اسماعیلؑ کو عرب میں۔ اس طرح کبھی آپؑ شام میں جا کر رہتے اور کبھی عرب میں۔

حضرت ابراہیمؑ کے دل میں اللہ تعالیٰ کی اتنی محبت تھی کہ اس محبت کے آگے انھیں ماں باپ، بیوی بچوں اور دنیا کی کسی چیز کی پروانہ تھی۔ ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کی محبت کا سخت امتحان لیا۔ انھوں نے خواب میں دیکھا کہ خدا نے ان کو اپنی سب سے زیادہ پیاری چیز کی قربانی کا حکم دیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کو اپنے بڑے بیٹے حضرت اسماعیل سے بہت محبت تھی اس لئے وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں ان کی قربانی دینے پر تیار ہو گئے۔

اس قربانی میں اللہ تعالیٰ کو جہاں باپ کی آزمائش منظور تھی وہاں بیٹے کی بھی آزمائش کرنی تھی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیٹے کو اپنا خواب سنایا۔ پھر پوچھا کہ تمہاری رائے کیا ہے؟۔

حضرت اسماعیلؑ بھی آخر کس باپ کے بیٹے تھے! جواب دیا ''اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو حکم دیا ہے، اس پر عمل کیجئے۔ مجھے اللہ تعالیٰ کا حکم منظور ہے۔ انشاء اللہ آپ مجھے صابر و شاکر پائیں گے۔ باپ بیٹے دونوں خدا کا حکم پورا کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

میدان میں پہنچ کر حضرت ابراہیمؑ نے بیٹے کو لٹا دیا اور چھری گلے پر رکھ دی۔ اللہ تعالیٰ کو باپ اور بیٹے کی فرماں برداری بہت پسند آئی اور حضرت اسماعیلؑ کے بدلے ایک دُنبہ بھیج دیا وہی ذبح ہوا اور حضرت اسماعیلؑ بچ گئے۔

اب اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان دونوں پاک بندوں نے خدا کا گھر بنایا جسے اکیلے

اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے سب سے پہلے بنایا گیا۔ پھر اسی جگہ مکہ معظمہ آباد ہوا۔ خانہ کعبہ کی تعمیر کے بعد باپ بیٹے دونوں نے خدا سے دُعا کی کہ۔ ''اے اللہ تعالیٰ ہماری اس خدمت کو قبول فرما۔'' اللہ تعالیٰ نے اس طرح ان کی خدمت قبول کی کہ قیامت تک کے لئے مسلمانوں پر خانہ کعبہ کا حج فرض کر دیا۔ آج بھی ہر سال دنیا بھر سے لاکھوں مسلمان مکہ معظمہ آتے ہیں اور خانہ کعبہ کی زیارت کر کے حج ادا کرتے ہیں اور جو مکہ معظمہ باپ بیٹے دونوں نے خدا کی راہ میں قربانی دی تھی اس لئے اس کی یادگار کے طور پر بقرعید الضحیٰ کے موقع پر مسلمانوں کے لئے حلال جانوروں کی قربانی ضروری ٹھہرا دی گئی۔

حضرت ابراہیمؑ نے 99 سال کی عمر میں وفات پائی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام

آپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حالات پڑھ چکے ہیں ان کے دو بیٹے تھے۔ بڑے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور چھوٹے حضرت اسحٰقؑ۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ہمارے رسول پاک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیدا ہوئے اور حضرت اسحٰقؑ کی اولاد میں دوسرے بہت سے پیغمبر ہوئے جن میں ایک حضرت یعقوب علیہ السلام بھی تھے جو پہلے کنعان میں رہتے تھے پھر مصر میں جا کر آباد ہو گئے تھے اور وہیں ان کی نسل پلی بڑھی۔

انھیں حضرت یعقوبؑ کا دوسرا نام اسرائیل تھا۔ اس لئے ان کی نسل کو بنی اسرائیل یعنی اسرائیل کی اولاد کہتے ہیں۔ یہ بنی اسرائیل تاریخ میں ایک بہت مشہور قوم ہے۔ ان کو یہودی بھی کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل میں بہت سے پیغمبر اور نبی پیدا کئے۔ ان سب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام بہت مشہور پیغمبر ہوئے ہیں۔ آپ پر اللہ تعالیٰ کی کتاب توریت شریف نازل ہوئی تھی۔ حضرت موسیٰؑ مصر میں اس وقت پیدا ہوئے تھے۔ جب وہاں قبطی خاندان کی حکومت تھی۔ اس کے بادشاہ فرعون کہلاتے تھے۔ حضرت موسیٰؑ کے زمانہ کا فرعون بڑا ظالم تھا۔ حکومت اور طاقت کے گھمنڈ میں خدائی کا دعویٰ کرتا تھا۔

ایک رات فرعون نے خواب میں دیکھا کہ ملک شام کی طرف سے ایک آگ پیدا ہوئی جو مصر کی طرف آئی اور اس نے تمام قلعے اور محل جلا ڈالے۔ صبح اٹھتے ہی فرعون نے نجومیوں کو بلوایا۔ اُنھوں نے خواب کا سارا حال سن کر بتایا کہ بنی اسرائیل کے گھرانے میں ایک ایسا لڑکا پیدا ہوگا جو تیری بادشاہت کا خاتمہ کر دے گا۔ اس پر فرعون نے حکم دیا

کہ بنی اسرائیل میں جتنے لڑکے پیدا ہوں سب مار ڈالے جائیں۔

اسی نازک زمانہ میں حضرت موسیٰؑ پیدا ہوئے۔ ماتا بھری ماں بہت پریشان تھی مگر اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کو تسلی ملی۔ اور حکم ملا کہ بچے کو ایک صندوق میں بند کر کے دریا میں ڈال دے۔ ہم تم دونوں کو پھر ملا دیں گے۔ ماں نے ایسا ہی کیا اور حضرت موسیٰؑ کی بہن سے کہا کہ تم دریا کے کنارے صندوق کے ساتھ ساتھ جاؤ اور کھوج لگاؤ کہ انجام کیا ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی شان کہ وہ صندوق بہتا ہوا فرعون کے محل کے پاس جا لگا۔ اور کسی نے اسے محل کے اندر پہنچا دیا۔ ادھر حضرت موسیٰؑ کی بہن بھی محل میں داخل ہو گئیں۔

فرعون کی بیوی نے صندوق میں ایک پیارے بچے کو دیکھا تو اسے اپنا بیٹا بنا لیا۔ اور بچے کو دودھ پلانے کے لئے دائیوں کو بلوایا۔ مگر حضرت موسیٰؑ نے کسی کا دودھ نہیں پیا۔ پھر جب حضرت موسیٰؑ کی بہن کے کہنے سے آپ کی والدہ بلوائی گئیں تو آپ ان کا دودھ پینے لگے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو اپنی ماں کی گود میں پہنچا دیا۔

فرعون کی قوم کے لوگ بنی اسرائیل کے لوگوں پر بڑا ظلم کرتے رہتے تھے۔ جب حضرت موسیٰؑ بڑے ہوئے تو یہ ظلم دیکھ کر انھیں بہت صدمہ ہوتا۔ ایک دن بازار میں دیکھا کہ فرعون کا ایک سپاہی بنی اسرائیل کے ایک آدمی کو بری طرح مار رہا ہے۔ پہلے آپؑ نے اسے سمجھایا مگر جب وہ نہ مانا تو آپؑ کو غصہ آ گیا۔ زور سے ایک گھونسا جو مارا تو وہ وہیں مر گیا۔ فرعون کو خبر ہوئی تو اس نے آپؑ کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ آپؑ نے سنا تو چھپ کر شہر سے نکل کھڑے ہوئے اور جنگل کی راہ لی۔

چند دنوں کے بعد آپؑ ایک شہر میں داخل ہوئے جس کا نام مدین تھا۔ شہر کے باہر دیکھا کہ ایک کنوئیں پر لوگ جمع ہیں۔ جو اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے ہیں اور دو لڑکیاں اپنی بکریاں لئے الگ کھڑی ہیں۔ لوگ اپنے اپنے جانوروں کو پانی پلا کر چل دیئے اور لڑکیوں کا کچھ خیال نہ کیا۔ حضرت موسیٰؑ کو ترس آیا۔ ان لڑکیوں کے قریب گئے۔ یہ لڑکیاں مشہور پیغمبر حضرت شعیب علیہ السلام کی بیٹیاں تھیں اب حضرت موسیٰؑ نے

پانی بھر کر ان کی بکریوں کو پلایا۔ لڑکیاں جب گھر پہنچیں تو انھوں نے باپ سے سارا قصہ بیان کیا اور حضرت موسیٰؑ کی نیک بختی کی تعریف کی۔

حضرت شعیبؑ نے حضرت موسیٰؑ کو بلوایا۔ فرعون کا سارا قصہ سننے کے بعد انھیں تسلی دی اور بڑی عزت کے ساتھ اپنے یہاں رکھا۔ پھر کچھ دنوں کے بعد اپنی ایک بیٹی کی شادی حضرت موسیٰؑ کے ساتھ کر دی۔ شادی کی شرط یہ رکھی گئی کہ وہ آٹھ سال تک حضرت شعیبؑ کی بکریاں چرائیں گے۔

حضرت موسیٰؑ دس سال تک حضرت شعیبؑ کے یہاں رہے پھر ان سے اجازت لے کر مع اپنی بیوی کے رخصت ہوئے۔ چلتے چلتے ایک میدان میں پہنچے وہاں آپؑ کو آگ کی ضرورت ہوئی۔ چقماق کو جھاڑا مگر سردی کی وجہ سے آگ نہ نکلی۔ تھوڑی دور پر ایک پہاڑی بھی جس کا نام طور کی پہاڑی تھا۔ اس پر آگ جلتی دکھائی دی۔ آپؑ لاٹھی ہاتھ میں لے کر وہاں پہنچے تو آپؑ کو ایک آواز سنائی دی کہ اے موسیٰؑ! اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنا پیغمبر بنایا ہے۔ اب آپؑ فرعون کے پاس جائیں اور اس کو اللہ تعالیٰ کا حکم سنائیں۔

وہاں آپؑ کو اللہ تعالیٰ نے دو معجزے عطا کئے۔ معجزہ ایسے کام کو کہتے ہیں جسے دوسرے لوگ نہیں کر سکتے۔ مگر پیغمبر اللہ تعالیٰ کی مدد سے وہ کام کر دکھاتے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کے ان دو معجزوں میں سے ایک یہ تھا کہ جب آپؑ اپنی بغل میں ہاتھ ڈال کر باہر نکالتے تو سورج کی طرح چمکنے لگتا۔ اور دوسرا معجزہ یہ تھا کہ عصا یعنی لاٹھی زمین پر پھینک دیتے تو وہ بہت بڑا اژدھا بن جاتی۔

اب حضرت موسیٰؑ فرعون کے پاس آئے اور اس کو ہدایت نے کی۔ آپؑ کی پیغمبری اور اللہ تعالیٰ کے حکم کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اور آپؑ کے معجزوں کو جادو بتایا۔ پھر اس نے ملک کے بڑے بڑے جادوگروں کو بلوایا اور ان سے کہا کہ حضرت موسیٰؑ کے معجزوں کو نیچا دکھاؤ۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اور جادوگروں کا مقابلہ ہوا تو جادوگروں نے ایسی نظر بندی کی کہ ان کی چھوڑی ہوئی رسیاں سانپ معلوم ہونے لگیں۔ حضرت موسیٰؑ نے

اپنی لاٹھی پھینکی تو وہ اژدہا بن کر ان سانپوں کو نگل گئی۔ سب جادوگر معجزے کو مان گئے۔ اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آئے۔ مگر فرعون کافر کا کافر ہی بنا رہا۔ اور بنی اسرائیل پر پہلے سے زیادہ ظلم کرنے لگا۔

اب حضرت موسیٰؑ کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکل جائیں۔ آپؑ سب کو لے کر راتوں رات شہر سے نکل گئے۔ صبح جب فرعون کو خبر ہوئی تو اس نے لشکر لے کر آپؑ کا پیچھا کیا۔ راہ میں بحرِ قلزم پڑتا تھا۔ جب حضرت موسیٰؑ سمندر کے پاس پہنچے تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنا عصا پانی پر مارا۔ سمندر میں راستہ پیدا ہو گیا۔ حضرت موسیٰؑ اور آپؑ کے ساتھی پار اتر گئے۔ فرعون بھی اسی راستے اپنا لشکر لے کر بڑھا۔ جب بیچ سمندر میں پہنچا تو دونوں طرف سے ہٹا ہوا پانی مل گیا۔ اور فرعون اور اس کا لشکر ڈوب کر وہ گئے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو فرعون کے ظلم سے نجات دی۔ اور فرعون مع اپنے لشکر کے پانی میں غرق ہو گیا۔ ایک زمانہ کے بعد فرعون کی لاش مل گئی جو اب لندن کے عجائب خانہ میں موجود ہے۔ لوگ اسے دیکھ کر یہ سوچتے ہیں کہ یہ وہی فرعون ہے جس نے خدائی دعویٰ کیا تھا۔ اس کے بعد بھی اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر بڑی بڑی مہربانیاں کیں مگر ان میں سے بہت کم لوگ اس پر شکر ادا کرتے رہے۔

اللہ تعالیٰ کے حکم کو لوگوں تک پہنچانے اور اپنی زندگی پوری کرنے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام جنت کو سدھارے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام

حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو مصر سے نکال لائے تھے۔ مصر سے نکل کر بنی اسرائیل فلسطین کے ملک میں آباد ہو گئے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ کی کتاب توریت اُتری تھی جس میں اللہ تعالیٰ کے حکم لکھے ہوئے تھے۔ ایک عرصہ تک بنی اسرائیل ان حکموں پر چلتے رہے پھر دھیرے دھیرے غلط راستہ پر پڑ گئے۔ بیچ بیچ میں کئی پیغمبران کو سیدھا راستہ دکھانے کے لئے آتے رہے ان میں زیادہ مشہور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام آج سے قریب دو ہزار برس پہلے مشہور شہر بیت المقدس کے پاس قصبہ ناصرہ میں پیدا ہوئے تھے۔ عیسوی سن حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش ہی سے جاری ہوا۔ آپ کی والدہ کا نام بی بی مریمؑ تھا۔ وہ ایک پیغمبر حضرت زکریاؑ کی بھانجی ہوتی تھیں۔ حضرت مریمؑ بڑی نیک پاک اور خدا پرست بی بی تھیں۔

جب حضرت عیسیٰؑ بڑے ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنا پیغمبر بنایا۔ آپ اللہ تعالیٰ کے حکم اس کے بندوں تک پہنچانے لگے۔ جگہ جگہ جانے اور لوگوں کو گناہوں سے بچنے اور نیکی کا راستہ اختیار کرنے کی ہدایت فرماتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی زبان میں بڑا اثر دیا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو بہت سے معجزے بھی عطا کئے تھے آپؑ جو دعا کرتے قبول ہوتی۔ اندھے بیمار اور کوڑھی جو آپؑ کے پاس آتے اچھے ہو جاتے۔ مٹی کے پرندوں پر پھونک مارتے وہ ہوا میں اُڑنے لگتے۔ ایک مرتبہ چالیس دنوں تک پکا پکایا کھانا (مَن سلویٰ) آسمان سے اُترتا رہا اور لوگ کھاتے رہے۔

آپ ساری عمر اللہ تعالیٰ کے حکم لوگوں کے پاس پہنچاتے اور ان کو نیکی اور

بھلائی کی تعلیم دیتے رہے۔ آپ پر اللہ تعالیٰ کی کتاب انجیل نازل ہوئی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم کو ماننے اور پھیلانے میں اللہ تعالیٰ کے بعض نیک بندوں نے بڑی مدد دی تھی۔ یہ لوگ آپؑ کے حواری کہلاتے ہیں۔ بارہ حواری بہت مشہور ہیں۔

کچھ لوگ آپؑ کے دشمن ہو گئے تھے۔ جن میں یہودی بھی شامل تھے۔ ان کو یہ ڈر تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم سے ہمارا اثر و اقتدار جاتا رہے گا۔ ان دشمنوں نے حضرت عیسیٰ کو بہت ستایا یہاں تک کہ حاکموں کو بھڑکا کر آپ کے خلاف قتل کا مقدمہ چلایا۔ آپؑ پکڑ کر قید کر دیئے گئے آخر میں آپؑ کو سولی پر چڑھانے کا حکم دیا گیا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے آپؑ کو اس طرح بچا لیا کہ زندہ آسمان پر اٹھا لیا اور مخالفوں نے آپؑ کے شبہ میں ایک دوسرے شخص کو سولی پر چڑھا دیا۔

اللہ تعالیٰ کے حکم بندوں تک پہنچانے اور اپنی مدت پوری کرنے کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس دنیا سے رخصت ہوئے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

ابتدائی زندگی

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ رسول خدا ﷺ کے پرانے ساتھی اور رفیق تھے۔
اسلام لانے سے پہلے ان کا نام ''عبدالکعبہ'' تھا۔ مسلمان ہونے کے بعد آنحضرت ﷺ نے ان کا نام ''عبداللہ'' رکھا۔ ابوبکر ان کا نام نہیں، کنیت ہے۔ لیکن وہ زیادہ تر اپنی کنیت ہی سے مشہور ہیں۔ قریش بہت بڑا قبیلہ تھا جو مکہ اور اس کے آس پاس کے علاقہ میں پھیلا ہوا تھا۔ اس کی کئی شاخیں تھیں جن میں سے ایک شاخ بنی تمیم کہلاتی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ بنی تمیم ہی میں سے تھے اور ان کا خاندان بہت معزز سمجھا جاتا تھا۔ ان کے والد کا نام عثمان تھا اور کنیت ابوقحافہ۔ اس زمانہ میں کوئی خاص سن رائج نہ تھا۔ قریش کسی اہم واقعہ سے پیدائش اور موت کی تاریخوں کا حساب لگایا کرتے تھے اور وہی سن بن جاتا تھا۔ اس زمانہ میں قریش واقعہء فیل سے تاریخوں کا حساب کیا کرتے تھے۔ فیل عربی زبان میں ہاتھی کو کہتے ہیں۔ ایک حبشی سردار بہت سے ہاتھی لے کر کعبہ کو ڈھانے آیا تھا لیکن خدا کی قدرت کہ جب وہ مکہ پہنچا تو اس کی فوج اور ہاتھیوں پر تباہی آئی اور وہ سب ہلاک ہوگئے۔ حضرت ابوبکرؓ اس واقعہ سے ڈھائی برس بعد پیدا ہوئے۔ آنحضرت ﷺ سے وہ عمر میں دو برس چھوٹے تھے۔

اسلام لانے سے پہلے بھی حضرت ابوبکرؓ کا شمار قریش کے بڑے معزز لوگوں میں ہوتا تھا۔ قریش اور عرب کے دوسرے قبیلے بالکل آزاد تھے ان پر کوئی حاکم نہیں تھا۔ البتہ انہوں نے اپنے علاقے کا انتظام کرنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کر رکھا تھا کہ مختلف کام مختلف قبیلوں کے سپرد کر رکھے تھے۔ قریش کی دس بڑی بڑی شاخیں تھیں۔ ہر شاخ کے سپرد کوئی نہ کوئی کام تھا جب کوئی اہم ضرورت آ پڑتی تو یہ لوگ آپس میں مشورہ کر لیتے۔ مثلاً بنی ہاشم آنحضرت ﷺ کے خاندان میں سے ایک شخص کے سپرد یہ کام تھا کہ حج کے موقع پر لوگوں کو پانی پلائے۔ بنوامیہ کے پاس قریش کا جھنڈا رہتا تھا اور اس خاندان کا سردار جنگ کے موقع پر

جھنڈا لئے فوج کے آگے آگے ہوتا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کے خاندان کا کام مقدموں کے فیصلے کرنا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے خاندان کی طرف سے دیوانی اور فوجداری مقدموں کے فیصلے کرتے تھے اور جب کسی مقدمہ میں کوئی مشکل آ پڑتی تھی تو لوگوں کو جمع کر کے ان سے مشورہ کرتے تھے۔

حضرت ابوبکرؓ کا پیشہ تجارت تھا۔ وہ شام اور یمن جاتے تھے۔ وہ وہاں سے کپڑا لا کر مکہ مکرمہ میں بیچتے تھے۔ وہ پہلی مرتبہ سفر پر نکلے تو ان کی عمر اٹھارہ برس کی تھی۔ اس کے بعد کئی مرتبہ تجارت کے لیے سفر کیا۔ تجارت کی وجہ سے عرب کے مختلف حصوں کے لوگ انہیں اچھی طرح جانتے تھے اور ان کی نیکی اور دیانتداری کی وجہ سے ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ عربوں میں بہت سی برائیاں آ گئی تھیں۔ وہ شراب کھلے بندوں پیتے تھے، جواء کھیلتے تھے۔ بعض عرب قبیلے ڈاکے ڈالتے، راہ چلتوں کو لوٹتے اور اس پر فخر کرتے تھے۔
لیکن حضرت ابوبکرؓ شروع سے بڑے نیک اور پرہیزگار تھے۔ محنت و مشقت سے روزی کماتے، غریبوں اور بیکسوں کی مدد کرتے۔ شراب انہوں نے اسلام قبول کرنے سے پہلے بھی کبھی نہیں پی اور اسلام لانے کے بعد تو ان کی حالت ہی بدل گئی، پہلے شعر کہا کرتے اور ان کا شمار بہت اچھے شاعروں میں ہوتا تھا۔ لیکن مسلمان ہونے کے بعد شعر کہنا بھی چھوڑ دیا۔

اسلام لانے کے بعد

آنحضرت ﷺ کو چالیس برس کی عمر میں نبوت ملی۔ اس وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ اڑتیسویں برس میں تھے۔ ان کی تجارت ترقی پر تھی اور وہ اکثر تجارت کا مال لے کر شام اور یمن جایا کرتے تھے۔ آنحضرت ﷺ سے ان کی جان پہچان تو مدت سے تھی لیکن آنحضرت ﷺ کے نبوت پانے سے کوئی سال بھر پہلے میل جول بڑھا اور حضرت ابوبکر صدیقؓ آپ کے پاس آنے جانے لگے۔ وہ ایک دفعہ شام سے واپس آئے تو لوگوں نے ان سے کہا کہ ابوطالب کے یتیم بھتیجے نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔
حضرت ابوبکر صدیقؓ اسی وقت آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ رسول خدا ﷺ

نے انہیں اسلام لانے کو کہا تو انہوں نے فوراً اسلام قبول کر لیا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ ان لوگوں میں سے ہیں جو سب سے پہلے اسلام لائے۔ عورتوں میں سب سے پہلے حضرت خدیجہؓ اسلام لائیں۔ مردوں میں حضرت ابوبکر صدیقؓ، لڑکوں میں حضرت علیؓ اور غلاموں میں حضرت زیدؓ بن حارثہ۔ یہ چاروں ایک ہی زمانہ میں مسلمان ہوئے۔ حضرت خدیجہؓ تو سب سے پہلے ایمان لائی تھیں۔ لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ باقی تین صحابیوں میں سے کس نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ماں باپ مدت تک اسلام نہیں لائے۔ ان کے والد ابوقحافہ نے اپنے بیٹے سے اکیس برس کے بعد یعنی فتح مکہ کے موقع پر نوے برس کی عمر میں اسلام قبول کیا اور چھیانوے برس کی عمر میں یعنی حضرت ابوبکر صدیقؓ کی وفات سے دو ڈھائی برس کے بعد وفات پائی۔ مکہ کے بہت سے لوگوں نے حضرت ابوبکرؓ ہی کے ذریعہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کیا تھا۔ ان میں حضرت عثمانؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ جیسے لوگ شامل تھے، جنہوں نے اللہ کے سچے دین کی خاطر بڑی تکلیفیں اٹھائیں اور ہر امتحان میں پورے اترے۔ جس وقت حضرت ابوبکرؓ نے اسلام قبول کیا اس وقت ان کے پاس چالیس ہزار درہم تھے۔ اس میں سے انہوں نے صرف پانچ ہزار درہم اپنے لئے رکھ لئے اور باقی اسلام کی ترقی کے لیے خرچ کر ڈالے۔

جن لوگوں نے اسلام قبول کیا تھا ان پر کافر بڑی بڑی سختیاں کرتے تھے، ان میں جو لوگ آزاد تھے اور اونچے خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے ان پر تو کسی کو ہاتھ اٹھانے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ ہاں جو غلام مسلمان ہو گئے تھے ان پر بڑے ظلم توڑے جاتے تھے ان میں ایک حبشی غلام حضرت بلالؓ بھی تھے جن کے دل کو اسلام نے نورانی کر رکھا تھا۔ ان کا آقا انہیں مارتے مارتے تھک جاتا تو دوپہر کے وقت ننگا کر کے مکہ مکرمہ کی تپتی ہوئی ریت پر لٹا دیتا اور ان کے سینے پر پتھر کی سل رکھ دیتا تھا لیکن وہ اس حالت میں بھی ''احد احد'' پکارتے تھے۔ ان کا آقا اس پر جھنجھلاتا اور انہیں شریر لڑکوں کے حوالے کر دیتا۔ وہ ان کے گلے میں رسی ڈال کر گھسیٹتے پھرتے اور ''احد احد'' کی صداؤں سے مکہ معظمہ کے گلی کوچے گونج اٹھتے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ

نے انہیں خرید کر آزاد کر دیا۔ اسی طرح انہوں نے سات غلام جنہوں نے اسلام قبول کیا، خرید کر آزاد کئے۔ ان کے والد ابوقحافہ نے دیکھا تو کہنے لگے تم کو غلام ہی خریدنا تھے تو بڑے ڈیل ڈول اور مضبوط ہاتھ پاؤں کے غلام خریدتے جن سے ضرورت کے وقت کوئی کام لیا جا سکے نہ کہ ان کمزور اور مریل غلاموں کو جن سے دو قدم بھی نہیں چلا جاتا۔ انہوں نے جواب دیا۔ میں نے ان غلاموں کو کسی فائدے کے لیے خرید کے آزاد نہیں کیا بلکہ میں نے یہ کام صرف اللہ کی رضا جوئی کے لیے کیا ہے۔

حضرت بلالؓ جنہیں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے خرید کے آزاد کیا، اس مرتبے کے صحابیوں میں سے ہیں کہ حضرت عمرؓ انہیں اپنا سردار کہتے تھے۔ ایک دفعہ ان کا ذکر آیا تو حضرت عمرؓ کہنے لگے۔ ابوبکرؓ ہمارے سردار ہیں اور انہوں نے ہمارے سردار کو آزاد کیا ہے۔

شروع شروع میں تین برس تک آنحضرت ﷺ نے کھلم کھلا اسلام کی تبلیغ نہیں کی۔ اسلام چپکے چپکے پھیلتا رہا اور بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے، چوتھے برس آپ ﷺ نے کھلم کھلا اسلام کی تبلیغ شروع کر دی۔ اس پر لوگ بھڑک اٹھے اور مسلمانوں پر بڑی سختیاں ہونے لگیں۔ انہیں دنوں ایک روز قریش کے بڑے بڑے آدمی خانہ کعبہ میں جمع تھے اور آنحضرت ﷺ ہی کا ذکر ہو رہا تھا کہ آپ ﷺ خود تشریف لے آئے ایک شخص بڑھ کے کہنے لگا کہ کیا تو ہی ہمارے خداؤں کی توہین کرتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا بے شک، یہ سنتے ہی کافر آپؐ سے لپٹ گئے۔ کسی نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے جا کے کہا کہ اپنے دوست کی خبر لو۔ انہیں یہ سن کر تاب نہ رہی، دوڑے دوڑے گئے اور کافروں کو ہٹاتے ہوئے آپ ﷺ کے پاس پہنچے پھر بڑے غصے کے عالم میں فرمایا افسوس ہے تم ایک شخص کو صرف یہ کہنے پر مارے ڈالتے ہو کہ میرا رب اللہ ہے۔

کافروں کو ان کا اس معاملہ میں دخل دینا بہت ناگوار گزرا۔ سب کے سب ان پر پل پڑے اور اتنا مارا کہ سر پھٹ گیا۔

جب کافروں کا ظلم بہت بڑھ گیا تو بہت سے مسلمان ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا جی آپ ﷺ کو چھوڑ کر کہیں جانے کو تو نہیں چاہتا تھا لیکن جب مجبور

ہو گئے تو وہ بھی یمن کے راستے حبشہ روانہ ہوئے۔ پانچویں منزل پر ایک شخص سے جس کا نام ابن الدغنہ تھا ملاقات ہوئی اس نے پوچھا، آپ کہاں جا رہے ہیں؟ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جواب میں کہا میری قوم نے مجھے نکال دیا ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ کسی دوسری جگہ جا کے خدا کی عبادت کروں۔

ابن الدغنہ بولا آپ جیسا شخص جو اتنا مہمان نواز، غریبوں اور مسکینوں کا ہمدرد ہو کیسے مکہ سے نکالا جاسکتا ہے، میں آپ کی ضمانت دینے پر آمادہ ہوں۔ مکہ چلئے اور وہیں خدا کی عبادت کیجئے۔ وہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو لے کر مکہ آیا اور قریش کے سرداروں سے ملا۔ انہوں نے اس شرط پر اس کی ضمانت قبول کی کہ ابوبکرؓ کو خدا کی عبادت کرنی ہی ہے تو اپنے گھر کے اندر عبادت کریں۔

ابن الدغنہ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے کہا، انہوں نے یہ بات مان لی اور کچھ روز یہ حال رہا کہ وہ نماز گھر ہی میں پڑھتے۔ قرآن پاک کی وہیں تلاوت کرتے پھر انہوں نے اپنے مکان کے احاطہ میں ایک چھوٹی سی مسجد بنائی وہیں نماز پڑھتے، وہیں قرآن کی تلاوت کرتے۔ چونکہ وہ دل کے نرم تھے تلاوت کرتے تو طبیعت پر ایسا اثر پڑتا کہ بے اختیار رونا شروع کر دیتے تھے۔ ان کے رونے کی آواز سن کر لوگ راستہ چلتے چلتے رک جاتے اور کھڑے ہو کر سننے لگتے۔ ان لوگوں میں عورتیں بھی ہوتی تھیں اور بچے بھی، قریش کو اندیشہ ہوا کہ کہیں ہماری عورتیں اور بچے مسلمان نہ ہو جائیں۔ ابن الدغنہ سے شکایت کی۔ وہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس آیا اور انہیں سارا حال سنایا۔ انہوں نے جواب دیا۔ اب تم میرا ذمہ نہ لو اور مجھے میرے خدا پر چھوڑ دو۔

وفات

حضرت ابوبکر صدیقؓ ہجرت کے تیرہویں سال جمادی الآخر کی ساتویں تاریخ کو بیمار ہوئے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے غسل کیا۔ سردی کی وجہ سے بخار ہو گیا۔ پندرہ دن وہ بیمار رہے۔ انہوں نے حضرت عمرؓ کو اپنی جگہ خلیفہ مقرر کرنے کا فیصلہ کر لیا

تھا۔ صحابہؓ سے مشورہ کیا تو بعض نے کہا کہ آپ کا انتخاب درست ہے، بعض نے کہا عمرؓ کی طبیعت میں بڑی سختی ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ یہ سن کے کہنے لگے۔ خلافت کا بوجھ سر پر پڑا تو خود بخود ٹھیک ہو جائیں گے۔ میرا تجربہ ہے کہ جب میں غصہ ہوتا ہوں تو وہ میرا غصہ دور کرتے ہیں اور میں کسی بات میں نرمی برتتا ہوں تو وہ سختی کا مشورہ دیتے ہیں۔ ان کی زندگی کا آخری دن تھا کہ مثنیٰ بن حارثہؓ جنہیں حضرت خالد بن ولیدؓ کی جگہ عراق کی فوجوں کا سردار مقرر کیا گیا تھا مدینہ پہنچے انہیں بلوا کے عراق کے حالات پوچھے۔ انہوں نے کہا، ایران کے بادشاہ نے تازہ دم فوجیں بھیجی ہیں اور میرے پاس بہت تھوڑی فوج ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اسی وقت عمرؓ کو بلایا اور کہا میرا دم کو نکلے تو شام سے پہلے اور رات میں نکلے تو صبح ہوتے ہوتے مثنیٰ کی مدد کا انتظام کر دینا۔ بیماری کے زمانے میں ایک دن پوچھا مجھے بیت المال سے اب تک کل کتنا وظیفہ ملا ہے۔ لوگوں نے حساب لگا کر کہا چھ ہزار درہم یعنی پندرہ سو روپے۔ کہا میری زمین بیچ کے یہ سارا روپیہ واپس دے دیا جائے۔ پھر پوچھا جب سے میں خلیفہ ہوا ہوں میری جائیداد کتنی بڑھی ہے۔ گھر کے لوگوں نے کہا ایک حبشی غلام جو بچوں کو کھانا کھلاتا ہے اور مسلمانوں کی تلواروں پر صیقل کرتا ہے۔ ایک اونٹنی ہے جس پر پانی آتا ہے اور ایک چادر جس کی قیمت سوا روپیہ ہے۔ کہا میری وفات کے بعد یہ تینوں چیزیں حضرت عمرؓ کے پاس پہنچا دی جائیں۔ وفات سے کچھ عرصہ پہلے حضرت عائشہؓ سے پوچھا ''رسول خدا کو کتنے کپڑوں کا کفن دیا گیا تھا'' جواب دیا ''تین کپڑوں کا۔'' کہنے لگے ''میرے کفن میں بھی تین کپڑے ہونے چاہئیں۔ دونوں یہ چادریں ہیں جو اس وقت اوڑھے ہوئے ہوں لیکن انہیں دھلوا لیا جائے۔ ایک کپڑا نیا لے لیا جائے۔ حضرت عائشہؓ نے جو اس وقت ان کے پاس تھیں یہ سن کے کہا کہ ''ابا جان! ہم لوگ اتنے مفلس نہیں کہ آپ کے کفن کے لیے نیا کپڑا بھی نہ خرید سکیں۔'' فرمایا ''مردوں سے زیادہ زندوں کو نئے کپڑوں کی ضرورت ہے۔'' پھر کہنے لگے 'آنحضرت ﷺ نے کس روز وفات پائی تھی۔'' حضرت عائشہؓ نے کہا ''دوشنبہ کو'' کہنے لگے ''آج دوشنبہ ہے مجھے امید ہے کہ میری وفات بھی آج ہی ہوگی'' پھر کہا ''میری قبر بھی رسول خدا ﷺ کے مزار مبارک کے پاس بنائی جائے۔'' حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ۲۲ جمادی الاول کو مغرب اور عشاء

کی نماز کے درمیان وفات پائی۔ نماز جنازہ حضرت عمرؓ نے پڑھائی اور اسی شب کو انہیں حضرت عائشہؓ کے حجرہ میں رسول خداؐ کے مزار کے پاس دفن کردیا گیا۔ انہوں نے دو برس تین مہینے گیارہ دن خلافت کی، وفات کے وقت ان کی عمر ۶۳ برس کی تھی۔ ان کے تین لڑکے تھے، تین لڑکیاں۔ بڑے لڑکے عبدالرحمٰن تھے جو مدت تک اسلام نہ لائے اور کافروں سے مل کر مسلمانوں سے لڑتے رہے۔ دوسرے لڑکے عبداللہ تھے جنہوں نے اسلام کی بڑی بڑی خدمتیں کیں۔ ہجرت کے زمانے میں حضرت ابوبکرؓ آنحضرتﷺ کے ساتھ غارثور میں تھے۔ یہ دن بھر مکہ میں رہ کر قریش کے منصوبوں کی ٹوہ لگاتے رہتے اور رات کو غارثور میں پہنچ جاتے تھے۔ طائف کی لڑائی میں ان کے پاؤں میں تیر کا زخم آیا تھا۔ اسی کے صدمہ سے وفات پائی۔ تیسرے لڑکے محمد تھے جو مدینہ میں پیدا ہوئے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بڑی صاحبزادی حضرت اسماءؓ تھیں ان کی شادی حضرت زبیرؓ بن العوام سے ہوئی تھی جو بڑے رتبہ کے صحابی تھے۔ دوسری صاحبزادی حضرت عائشہ صدیقہؓ تھیں جو رسول خداؐ کے نکاح میں آئیں۔ تیسری صاحبزادی ام کلثومؓ تھیں۔ عبداللہؓ کے اولاد نہیں ہوئی اس لیے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی اولاد کا سلسلہ عبدالرحمٰنؓ اور محمدؓ سے چلا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ جس زمانے میں رسول خداﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اس وقت تک آپ کو رسالت نہیں ملی تھی۔ لیکن جب رسول خداؐ نے ان سے کہا کہ مجھے اللہ نے اپنا رسول بنایا اور لوگوں کو ہدایت کرنے کا حکم دیا ہے تو انہوں نے لمحہ بھر کے لیے تامل کئے بغیر کہا میں آپ کی رسالت پر ایمان لاتا ہوں۔ جب انہیں خلافت ملی تو وہ بڈھے ہوچکے تھے۔ اکسٹھ برس کی عمر تھی لیکن جب لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا اور عرب کے چوبیس قبیلے لڑنے مرنے پر آمادہ ہوگئے تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ایسی ہمت دکھائی کہ سب لوگ دنگ رہ گئے۔ صحابہؓ میں بعض لوگوں کا خیال تھا کہ جو قبیلے زکوٰۃ دینا نہیں چاہتے انہیں زکوٰۃ معاف کردینا چاہیے لیکن حضرت ابوبکر صدیقؓ نے نہ مانا اور کہنے لگے کہ اگر تم لڑنا نہیں چاہتے تو میں اکیلا لڑوں گا۔ پھر صحابہؓ کو ساتھ لے کر مدینہ سے نکلے اور جو لوگ بڑے لاؤ لشکر کے ساتھ مدینہ پر حملہ کرنے آئے تھے۔ انہیں پے در پے شکستیں دے کر تتر بتر کردیا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کا سینہ ایمان کا خزینہ تھا اور ان کے دل کو اللہ اور اس کے رسولﷺ کی محبت نے مالا مال کررکھا تھا۔ انہوں نے اگرچہ صرف سوا دو برس خلافت کی لیکن اس تھوڑے سے عرصہ میں ایسے کارنامے انجام دیئے جنہیں صدیوں انجام دینا مشکل معلوم ہوتا ہے۔

حضرت ابوبکرؓ کا وقت آخر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین یار غار فخر کائنات حضرت ابوبکر صدیقؓ نے انتقال کے روز دریافت فرمایا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کس روز رحلت فرمائی تھی۔ لوگوں نے کہا دوشنبہ (پیر) کے روز۔

ارشاد فرمایا۔ ''میری آرزو بھی یہی ہے کہ میں آج رخصت ہو جاؤں'' اگر اللہ تعالیٰ میری اس تمنا کو پورا کردیں تو میری قبر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مرقد مبارک کے پاس بنائی جائے۔

اب وفات کا وقت قریب آرہا تھا۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے دریافت فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کتنے کپڑوں میں کفن دیا گیا تھا! عرض کیا تین کپڑوں کا۔

ارشاد فرمایا۔ ''میرے کفن میں بھی تین کپڑے ہوں یہ دو چادریں جو میرے بدن پر ہیں دھولی جائیں اور ایک کپڑا اور لے لیا جائے۔

سچے باپ کی سچی بیٹی حضرت صدیقہؓ نے دردمندانہ کہا ابا جان! ہم اس قدر غریب نہیں ہیں کہ نیا کفن بھی نہ خرید سکیں۔ ارشاد فرمایا۔

بیٹی! کپڑوں کی مردوں کی نسبت زندوں کو زیادہ ضرورت ہے۔ میرے لئے یہی پھٹا پرانا کافی ہے۔

موت کی ساعتیں لمحہ بہ لمحہ قریب آرہی تھیں۔

حضرت عائشہ، صدیقہؓ اس ڈوبتے ہوئے چاند کے سرہانے بیٹھی تھیں اور آنسو

بہا رہی تھیں۔ غم آلود اور حیرت انگیز خیالات آنسوؤں کے ساتھ دماغ کی پہنائی سے اتر رہے تھے اور درد انگیز الفاظ بن کر زبان سے بہہ رہے تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے یہ شعر پڑھا۔

بہت سی نورانی صورتیں ہیں جن سے بادل بھی پانی مانگتے تھے۔
وہ یتیموں کے فریاد رس تھے اور بیواؤں کے پشت پناہ تھے۔

یہ سن کر حضرت صدیقؓ نے آنکھیں کھول دیں اور فرمایا۔
''میری بیٹی یہ رسول اللہ صلی علیہ وآلہ وسلم کی شان تھی۔''
حضرت عائشہؓ نے دوسرا شعر پڑھا۔

قسم ہے تیری عمر کی جب موت کی ہچکی لگ جاتی ہے۔ تو پھر زر و مال کچھ کام نہیں دیتا۔

ارشاد فرمایا۔ یہ نہیں اس طرح کہو موت کی بیہوشی کا صحیح وقت آ گیا۔ یہ وہ ساعت ہے جس سے تم بھاگ آتے تھے۔''

حضرت صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ۔''نزع کے وقت میں اپنے باپ کے سرہانے گئی تو یہ شعر پڑھا۔

جس کے آنسو ہمیشہ رکے رہے ایک دن وہ بھی بہہ جائیں گے ہر سوار کی ایک منزل ہوتی ہے اور ہر پہننے والے کو ایک کپڑا دیا جاتا ہے۔

فرمایا۔''بیٹی اس طرح نہیں حق بات اس طرح نہیں۔ حق بات اس طرح ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے۔''موت کی بیہوشی کا صحیح وقت آ گیا۔ یہی وہ وقت ہے جس سے تم بھاگتے تھے۔''

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت عمر فاروقؓ کا اسلام قبول کرنا

قریش حضرت ابراہیمؑ کے چھوٹے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کی اولاد میں سے تھے۔ شروع شروع میں وہ اپنے بزرگوں کے دین پر قائم ہے۔ یعنی ان کی گردن سچے خدا کے سوا کسی کے سامنے نہیں جھکتی تھی لیکن رفتہ رفتہ وہ سیدھی راہ سے بھٹک گئے۔ گمراہی کا طوفان ایسا امڈا کہ چاند، سورج، ستارے، پہاڑ اور پتھر پجنے لگے۔ لوگوں کے دلوں سے سچے خدا کا خوف نکل گیا۔ انہوں نے بڑا غضب تو یہ کیا کہ خانہ کعبہ میں تین سو ساٹھ بت لا کر رکھ دیئے جن پر چڑھاوے چڑھتے تھے اور مرادیں مانگی جاتی تھیں پھر بھی کچھ لوگ ایسے تھے جو حضرت ابراہیمؑ کے پرانے دین پر قائم تھے اور بت پرستی کو برا سمجھتے تھے۔ انہیں میں حضرت عمرؓ کے چچیرے بھائی زید بن نفیل بھی تھے۔ اگرچہ زید کی وجہ سے حضرت عمرؓ کے کانوں میں بچپن سے توحید کی آواز پڑنی شروع ہوگئی تھی پھر بھی وہ باپ دادا کے عقیدے پر مدت تک جمے رہے اور رسول خدا ﷺ کو نبوت کا رتبہ ملنے کے بعد کئی برس تک ایمان نہ لائے۔

رسول خداؐ کو نبوت ملی تو حضرت عمرؓ ستائیسویں برس میں تھے اور ان کا شمار مکہ کے مشہور لوگوں میں ہوتا تھا۔ عدی کے گھرانے کے سپرد جو جو کام تھے انہیں حضرت عمرؓ ہی انجام دیتے تھے۔ قریش کو کسی دوسرے قبیلہ کے پاس ایلچی بھیجنا ہوتا تھا تو حضرت عمرؓ ہی کو بھیجا جاتا تھا کیونکہ انہیں تقریر کرنے کا ڈھنگ خوب آتا تھا۔ جب کبھی دو شخصوں میں خاندان کی بڑائی کے بارے میں جھگڑا ہو جاتا تھا تو اس کا فیصلہ بھی حضرت عمرؓ ہی کرتے تھے۔ رسول خدا ﷺ نے جب قریش کو اللہ کے سچے دین کی طرف بلایا تو قریش کے دوسرے بڑے بڑے لوگوں کی طرح انہوں نے بھی آپؐ کی مخالفت کی۔ کہتے ہیں ان کی ایک لونڈی جس کا نام لبینہ تھا، مسلمان ہوگئی تھی۔ عمر اسے بہت پیٹتے تھے۔ مارتے مارتے تھک جاتے تو کہتے ذرا ستا لوں پھر تجھ سے سمجھوں گا۔

ایک دن نہ جانے بیٹھے بیٹھے کیا خیال آیا کہ رسول خدا ﷺ کے قتل کا ارادہ لے کے

گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ راستہ میں نعیم بن عبداللہ سے جو بنو عدی میں سے تھے ملاقات ہوگئی۔ ان کے تیور دیکھ کے نعیم بن عبداللہ نے جو خود بھی مسلمان ہوچکے تھے۔ پوچھا ''خیر تو ہے۔'' اتنے غصہ میں کہاں جارہے ہیں؟ جواب ملا۔ محمد (ﷺ) کو قتل کرنے جا رہا ہوں۔ انہوں نے کہا یہ ارادہ ہے تو پہلے اپنے گھر کی خبر لو۔ کیونکہ تمہاری بہن فاطمہؓ اور تمہارے بہنوئی سعید بن زید دونوں مسلمان ہوچکے ہیں۔ یہ سن کے حضرت عمرؓ الٹے پاؤں پھرے اور بہن کے یہاں پہنچے۔ اس وقت دونوں میاں بیوی قرآن پاک پڑھ رہے تھے۔ حضرت عمرؓ کی آواز سن کے انہوں نے قرآن پاک کے ورق چھپادیئے۔ انہوں نے پوچھا تم ابھی ابھی کیا پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے کہا کچھ بھی نہیں۔ حضرت عمرؓ بولے میں سن چکا ہوں کہ تم دونوں اپنے باپ دادا کے مذہب سے پھر گئے ہو۔ یہ کہہ کر بہنوئی کو پیٹنا شروع کردیا۔ بہن بچانے آئیں تو انہیں بھی پیٹا۔ اس حالت میں ان کی زبان سے نکلا ''عمر جو چاہے کرلو۔ اسلام اب ہمارے دل سے نکل نہیں سکتا۔'' بہن کو لہولہان دیکھ کے ان کا غصہ ٹھنڈا ہوگیا کہنے لگے تم جو کچھ پڑھ رہے تھے مجھے بھی لا کے دکھاؤ انہوں نے قرآن پاک کے ورق سامنے لا کے رکھ دیئے۔ جوں جوں پڑھتے جاتے تھے چہرے کا رنگ بدلتا جاتا تھا۔ آخر اللہ تعالیٰ کے کلام نے دل کو ایسا پگھلایا کہ بے اختیار پکار اٹھے۔ میں اللہ اور اللہ کے رسولؐ پر ایمان لاتا ہوں۔ یہاں سے نکلے وہ سیدھے رسول خداﷺ کی خدمت میں پہنچے دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر سے آواز آئی کون ہے؟ جواب ملا عمر، جو صحابیؓ اس وقت رسول خداؐ کی خدمت میں موجود تھے۔ ان کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر گھبرائے کہ نہ جانے کس ارادے سے آئے ہیں۔ آنحضرتﷺ کے چچا حضرت حمزہؓ جو اپنے زمانے کے مشہور شہسوار اور بڑے بہادر شخص تھے کہنے لگے، آنے دو، اگر نیک ارادے سے آیا ہے تو خیر، ورنہ اسی کی تلوار سے اس کا سر اڑادوں گا۔

آنحضرتﷺ اٹھ کے آگے بڑھے اور پوچھا عمر! کس ارادے سے آئے ہو، عمرؓ سہم گئے اور کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ یارسول اللہ مسلمان ہونے۔ یہ سن کے مسلمانوں نے اس زور سے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا کہ مکہ معظمہ کے پہاڑ گونج اٹھے۔

حضرت عمرؓ رسول خداؐ کی نبوت کے چھٹے برس یعنی تینتیس برس کی عمر میں مسلمان

ہوئے ان کے اسلام لانے پر بڑا ہنگامہ ہوا اور کافروں نے ان کے مکان کو گھیر لیا لیکن وہ بڑے بارسوخ شخص تھے۔ قریش میں سے جو لوگ اسلام نہیں لائے تھے۔ ان میں بھی بعض ایسے تھے جو پرانی دوستی اور رشتہ داری کے خیال سے ان پر آنچ نہیں آنے دینا چاہتے تھے اس لیے لوگ صرف شور مچا کے رہ گئے۔ کسی کو ان پر ہاتھ اٹھانے کی ہمت نہیں پڑی۔ اس وقت تک صرف چالیس پچاس آدمی مسلمان ہوچکے تھے لیکن وہ گھروں میں نمازیں پڑھتے تھے۔ خانہ کعبہ میں جا کے نماز پڑھنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ حضرت عمرؓ کے اسلام لانے سے اتنا ہوا کہ مسلمانوں نے خانہ کعبہ میں جا کے نماز ادا کی اور کوئی انہیں روک نہ سکا۔

اسلام لانے کے بعد

حضرت عمرؓ نے اسلام قبول کرنے کے بعد مکہ میں سات برس گزارے۔ یہ زمانہ سارے مسلمانوں کے لیے بڑے دکھوں اور مصیبتوں کا زمانہ تھا۔ کافر مسلمانوں کو تکلیف پہنچانے کے نئے نئے طریقے تلاش کرتے رہتے تھے۔ کوئی مسلمان مکہ کے کسی گلی کوچے میں نظر آجاتا تو اس پر آوازے کستے، اینٹیں اور پتھر پھینکتے۔ غریب لوگوں اور لونڈی، غلاموں پر تو خیر آئے دن ظلم توڑے جاتے تھے لیکن جو لوگ اثر و رسوخ والے تھے۔ قریش ان پر بھی ظلم کرنے سے نہ چوکتے تھے۔ ابوطالب رسول خداﷺ کا ساتھ دیتے تھے۔ قریش نے ان سے بہتیرا کہا کہ یا تو اپنے بھتیجے کو ہمارے حوالہ کردو یا ہم سے الگ ہوجاؤ لیکن انہوں نے آنحضرتﷺ کا ساتھ نہ چھوڑا بلکہ اپنے سارے گھرانے کو جو اس خاندان کے ایک بزرگ ہاشم کے نام پر بنو ہاشم کہلاتا تھا۔ آپؐ کا ساتھ دینے پر آمادہ کرلیا۔ قریش نے آپس کے مشورہ سے یہ فیصلہ کیا کہ جب تک ابوطالب محمدﷺ کی مدد کرنے سے باز نہیں آتے بنو ہاشم سے کوئی سروکار نہ رکھا جائے اور ان کے ساتھ بات چیت میل جول لین دین بند کردیا جائے۔ ایک عہد نامہ لکھا گیا جس پر قریش کے بڑے بوڑھوں نے دستخط کئے اور اسے خانہ کعبہ میں لٹکا دیا گیا۔

ابوطالب نے اپنے سارے خاندان سمیت ایک گھاٹی میں پناہ لی جو شعب ابی طالب یعنی ابوطالب کی گھاٹی کے نام سے مشہور ہے۔ قریش نے تاکید کر رکھی تھی کہ گھاٹی تک

کسی قسم کا اناج نہ پہنچنے پائے۔ پورے خاندان نے تین سال تک درختوں کے پتے اور گھاس کھا کے گزارے۔ بنو ہاشم کے بچے بھوک سے بلکتے تھے لیکن کافروں کو ترس نہیں آتا تھا۔ مسلمان دشمنوں کی نظر سے بچا کے تھوڑا بہت اناج گھاٹی میں پہنچا دیتے تھے لیکن اس پر اتنے بڑے کنبے کا گزارہ کیسے ہوسکتا تھا۔ کچھ لوگوں کو جن سے بنو ہاشم کی رشتہ داری تھی رحم آیا اور انہوں نے یہ عہدنامہ پھاڑ ڈالا۔

رسول خدا ﷺ گھاٹی سے نکلے ہی تھے کہ ایک اور مصیبت پیش آئی یعنی ابوطالب کا انتقال ہوگیا ابھی یہ زخم ہرا تھا، یعنی ابوطالب کے انتقال کا چوتھا دن ہوا تھا کہ حضرت خدیجہؓ نے وفات پائی۔ ابوطالب جب تک زندہ تھے قریش مسلمانوں پر ہاتھ ڈالنے سے ہچکچاتے تھے۔ خاص طور پر وہ جب کبھی رسول اللہ ﷺ کو ایذا پہنچانے کا ارادہ کرتے تھے، ابوطالب بھتیجے کی حمایت میں سینہ سپر ہوجاتے تھے اور ان سے آنکھیں چار ہوتے ہی ہاتھ رک جاتے اور گردنیں جھک جاتی تھیں لیکن ابوطالب کے انتقال نے رکاوٹ دور کردی اور قریش بے کھٹکے مسلمانوں پر ظلم کرنے لگے۔ رسول اللہ ﷺ کی نبوت کا نواں سال تھا کہ ابوطالب نے وفات پائی۔ اس واقعہ سے کوئی ڈیڑھ دو سال کے بعد مدینہ کی بستی میں جو ان دنوں یثرب کہلاتی تھی اور مکہ سے کوئی دو سومیل کے فاصلہ پر ہے۔ اسلام کا چرچا ہوا اور رفتہ رفتہ وہاں کے بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کرلیا ان لوگوں کا اصرار تھا کہ رسول خداؐ مدینہ تشریف لے چلیں۔ آپ ﷺ خود تو نہیں گئے البتہ صحابہؓ کو جانے کی اجازت دے دی، سب سے پہلے پانچ صحابیؓ جن میں رسول خدا ﷺ کے مؤذن حضرت بلالؓ بھی تھے، مدینہ تشریف لے گئے۔ پھر حضرت عمرؓ نے بیس صحابیوں کے ساتھ ہجرت کی۔ جب قریب قریب سب مسلمان مدینہ جاچکے تو رسول خدا ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کو ساتھ لے کر مدینہ کا رخ کیا۔ حضرت علیؓ سب سے آخر میں آئے کیونکہ آنحضرت ﷺ انھیں لوگوں کی امانتیں لوٹانے کے لیے مکہ چھوڑ آئے تھے۔

مدینہ میں جگہ کم تھی۔ بہت سے مہاجر قبا کی بستی میں جو مدینہ منورہ سے دو تین میل کے فاصلہ پر ہے ٹھہر گئے تھے۔ حضرت عمرؓ بھی یہیں آ کے اترے۔ کچھ دنوں کے بعد آنحضرت ﷺ حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ تشریف لائے تو وہ دو ہفتہ قبا میں ٹھہرے۔ یہاں ایک مسجد بنوائی، پھر مدینہ تشریف لے گئے لیکن حضرت عمرؓ قبا ہی میں رہے۔ مدینہ منورہ پہنچ کر آنحضرت ﷺ نے انصار اور مہاجرین میں بھائی چارہ قائم کردیا تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو انصاری کسی مہاجر کا بھائی بن گیا۔ اس نے اس مہاجر کو اپنا آدھا مال بانٹ دیا۔ حضرت عتبان بن مالکؓ جو قبیلہ بنو سالم کے سردار اور مدینہ کے معزز لوگوں میں سے تھے وہ بھی قبا ہی میں رہتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے یہ قاعدہ بنالیا تھا کہ ایک دن چھوڑ کے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے جس دن حضرت عمرؓ مدینہ نہیں جاتے تھے۔ اس دن عتبان بنؓ مالک آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔

مدینہ پہنچنے کے بعد جب مسجد نبویؐ میں نمازیوں کی کثرت ہونے لگی تو آنحضرت ﷺ کو خیال آیا کہ مسلمانوں کو نماز کے وقت بلانے کا کوئی انتظام ہونا چاہیے کیونکہ جو لوگ مسجد میں نماز پڑھنے آتے تھے ان میں کوئی پہلے آجاتا تھا اور کوئی بعد میں۔ اس لیے بعض لوگ وقت کا صحیح اندازہ نہ ہونے کی وجہ سے نماز باجماعت سے محروم رہ جاتے تھے۔ بعض لوگوں نے رائے دی کہ عیسائیوں کی طرح نماز کے وقت ناقوس بجایا جائے۔ حضرت عمرؓ بھی اس وقت موجود تھے انہوں نے کہا ناقوس بجانے کی بجائے لوگوں کو نماز کی طرف بلانے کے لیے ایک آدمی کیوں نہ مقرر کردیا جائے۔ آنحضرت ﷺ کو یہ تجویز پسند آئی اور اسی وقت حضرت بلالؓ کو جن کی آواز میں بڑی مٹھاس اور گھلاوٹ تھی اذان دینے کا حکم دیا۔ چنانچہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف بلانے کا یہ سیدھا سادہ اور پراثر طریقہ اس وقت سے برابر چلا آتا ہے اور نماز کی تمہید سمجھا جاتا ہے۔

وفات

وفات سے کچھ دیر پہلے حضرت عمرؓ نے حج کیا۔ ذی الحجہ کی آخری تاریخوں میں حج سے فارغ ہوکر مدینہ منورہ پہنچے۔ جمعہ کے روز مسجد میں خطبہ دیا جو بہت لمبا تھا۔ اس خطبہ میں خلافت کے بارے میں بعض باتیں بیان کیں۔ جن سے معلوم ہوتا تھا کہ اپنی جانشینی کے معاملہ میں کچھ باتیں ان کے دل میں کھٹک رہی ہیں۔

مدینہ میں ایک پارسی غلام ابولولو فیروز تھا۔اس نے ایک دن حضرت عمرؓ سے کہا کہ میں دن بھر مزدوری کرتا ہوں اور شام کو میرا آقا مجھ سے دو درہم وصول کرلیتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا تم کون سا پیشہ کرتے ہو۔ اس نے کہا میں لوہار بھی ہوں، ترکھان بھی، نقاشی کا کام بھی جانتا ہوں۔ حضرت عمرؓ نے کہا جب تو دو درہم کوئی زیادہ رقم معلوم نہیں ہوتی۔ ابولولو فیروز ناراض ہوکر چلا گیا۔

دوسرے دن حضرت عمرؓ صبح کی نماز پڑھانے لگے تو ابولولو فیروز جو گھات میں لگا تھا ٹوٹ پڑا اور چھ وار کئے۔ حضرت عمرؓ نے اس حالت میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کا ہاتھ پکڑ کے انھیں اپنی جگہ کھڑا کردیا۔ حضرت عمرؓ زخمی پڑے تھے اور حضرت عبدالرحمٰنؓ نماز پڑھا رہے تھے۔

ابولولو فیروز نے اور لوگوں کو زخمی کیا۔ جب پکڑا گیا تو خودکشی کرلی۔ نماز ختم ہوئی تو لوگوں نے حضرت عمرؓ کو اٹھا کر گھر پہنچا دیا انہوں نے پوچھا۔ میرا قاتل کون ہے؟ لوگوں نے ابولولو فیروز کا نام بتایا۔ کہنے لگے اللہ کا شکر ہے کہ میرا قاتل مسلمان نہیں۔ پھر اپنے بیٹے عبداللہ کو بلا کر کہا عائشہؓ کے پاس جاؤ اور کہو کہ حضرت عمرؓ آپ سے اجازت طلب کرتا ہے کہ اسے رسول خداؐ کے پہلو میں دفن کیا جائے۔ حضرت عائشہؓ نے یہ پیغام سن کے کہا یہ جگہ میں اپنے لئے رکھنا چاہتی تھی لیکن عمرؓ کو اپنے آپ پر ترجیح دیتی ہوں۔اس وقت ایک بڑا سوال یہ تھا کہ ان کا جانشین کون ہو۔لوگوں نے بار بار پوچھا تو انہوں نے چھ اشخاص یعنی حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، حضرت سعدؓ بن وقاص، حضرت زبیرؓ اور حضرت طلحہؓ کے نام لئے اور کہا کہ ان میں سے کسی کو خلیفہ بنالینا۔ اگرچہ زخموں نے نڈھال کر رکھا تھا لیکن اس حالت میں بھی ذمیوں کا خیال تھا۔ وفات سے پہلے وصیت کی کہ میرے بعد جو شخص خلیفہ ہو اسے دوسرے مذہب کے لوگوں کا جو ہماری پناہ میں آ گئے، خیال رکھنا اور ان سے ہمیشہ اچھا سلوک کرنا چاہیے۔

حضرت عمرؓ نے زخمی ہونے سے تیسرے دن یعنی ۲۷ ذی الحجۃ ۲۳ھ بمطابق ۶۴۴ء کو انتقال فرمایا۔ موت کے وقت آپؓ کی عمر ۶۳ برس کی تھی۔ انہوں نے دس سال چھ ماہ چار

دن خلافت کی۔ ان کا کنبہ بہت بڑا تھا۔اس لیے بیت المال سے جو وظیفہ لیتے تھے۔ ان کے گزارے کے لیے کافی نہیں تھا۔ اس لئے وفات کے وقت ان پر ۸۶ ہزار قرض تھا جو ان کا مکان بیچ کر ادا کیا گیا۔

اولاد

حضرت عمرؓ نے کئی فرزند اور صاحبزادیاں اپنی یادگار چھوڑیں۔ جن میں حضرت حفصہؓ، عبداللہ، عبیداللہ اور عاصم بہت مشہور ہیں۔ حضرت حفصہؓ رسول خدا ﷺ کی بیوی تھیں۔ حضرت عبداللہؓ بڑے نیک اور پرہیزگار شخص تھے۔ علم میں بھی ان کا درجہ بہت بلند تھا اور ان کا شمار اونچے درجہ کے صحابہؓ میں ہوتا تھا۔ حضرت عمرؓ کے ساتھ مکہ میں اسلام لائے اور اکثر لڑائیوں میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ رہے۔ باپ کی طرح حق بات کہنے میں بڑے نڈر تھے۔ ایک دفعہ حجاج بن یوسف جو مکہ معظمہ کا گورنر تھا اور رعایا پر ظلم کرتا تھا۔ خانہ کعبہ میں خطبہ پڑھ رہا تھا عین اسی حالت میں آپؓ نے کھڑے ہوکر کہا ”یہ اللہ تعالیٰ کا دشمن ہے کیونکہ اس نے اللہ تعالیٰ کے دوستوں کو قتل کیا ہے۔ جب لوگوں نے آپ کے اباجان کی وفات کے بعد خلیفہ بننے پر اصرار کیا تو فرمایا کہ خلافت کے کاموں کی جوابدہی کے لیے خاندان میں سے ابا جان ہی کافی ہیں۔ عاصمؓ اور عبیداللہؓ بھی اپنے زمانہ کے بڑے لائق اور نامور لوگوں میں سے تھے۔

حضرت عبیداللہؓ بہادری اور پہلوانی میں بہت مشہور تھے۔ تیسرے بیٹے حضرت عاصمؓ بھی نہایت نیک نفس اور بڑے عالم فاضل بزرگ تھے۔ جب ان کا انتقال ہوا تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ان کا مرثیہ لکھا جس کے ایک شعر کا ترجمہ یہ ہے۔

”کاش موت عاصم کو چھوڑ جاتی تاکہ ہم سب ساتھ رہتے یا لے جانا تھا تو ہم ... لے جاتی۔“

حضرت عاصم رضی اللہ عنہ نہایت اونچے قد کے تھے اور شعر بھی خوب کہتے تھے۔ اس زمانہ کے بڑے لوگوں کا کہنا ہے کہ ”ہر شاعر کو کچھ نہ کچھ وہ الفاظ بھی لانے پڑتے ہیں جو مقصود نہیں ہوتے ہیں لیکن عاصم اس سے مستثنیٰ ہیں۔“ انہیں کے نواسے ہیں جنہیں دنیا

عبدالعزیزؒ کے نام سے جانتی ہے۔ جنہوں نے اپنی ڈھائی سالہ خلافت کے زمانے میں وہ کارنامے سرانجام دیئے جو آج تک کسی بادشاہ سے نہیں ہوئے اور جو قیامت تک عام و خاص لوگوں کی زبانوں پر چڑھے ہی رہیں گے۔

زمانہء خلافت میں نئی نئی ایجادیں

حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں جو باتیں نئی نئی ایجاد کیں اور جن سے امت کو بڑے بڑے فائدے پہنچے۔ ہم بڑی بڑی کتابوں سے چھانٹ کر نیچے درج کرتے ہیں ۔

۱۔ بیت المال یعنی خزانہ قائم کیا۔

۲۔ انصاف کے لیے عدالتیں قائم کیں اور ان میں قاضی مقرر کیے۔

۳۔ تاریخ اور سن ہجری قائم کیا جو آج تک قائم ہے۔

۴۔ بادشاہ کے لیے امیر المومنین کا خطاب قائم کیا۔

۵۔ فوج کے لیے دفتر قائم کیا۔

۶۔ اسلامی خدمتگاروں کے وظیفے (تنخواہیں) قائم کیں۔

۷۔ مال کا دفتر قائم کیا۔

۸۔ زمینوں کے ناپ کے لیے پیائش کا طریقہ جاری کیا۔

۹۔ مردم شاری کرائی۔

۱۰۔ کھیتی باڑی کے لیے نہریں کھدوائیں۔

۱۱۔ بڑے بڑے شہر آباد کرائے جیسے کوفہ، بصرہ، جیرہ، فسطاط، موصل۔

۱۲۔ سارے اسلامی ملکوں کو صوبوں میں تقسیم کیا۔

۱۳۔ دریا کی پیداوار یعنی عنبر جیسی مچھلیوں پر محصول قائم کیا اور محصل مقرر کیے۔

۱۴۔ جن ملکوں سے مقابلے تھے وہاں ان کی تجارت کے لیے آمدورفت کی اجازت دی۔

۱۵۔ جرم کرنے والوں کے لیے جیل خانے مقرر کیے۔

۱۶۔ دُرہ (کوڑا) کا استعمال جاری کیا۔

۱۷۔ راتوں کو گشت کر کے رعایا کی خبر کا قانون جاری کیا۔

۱۸۔ رعایا کی خیر خواہی کے لیے پولیس کا محکمہ قائم کیا۔

۱۹۔ جگہ جگہ فوجی چھاؤنیاں قائم کیں۔

۲۰۔ اچھے برے گھوڑوں کی پہچان کے لیے نشان مقرر کئے۔

۲۱۔ حالات کی خیر خبر کے لیے پرچہ نویس مقرر کئے۔

۲۲۔ مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ تک مسافروں کے لیے مکانات بنوائے۔

۲۳۔ راستوں پر پڑے ہوئے لاوارث بچوں کی پرورش کے لیے روزینہ مقرر کیا۔

۲۴۔ بہت سے شہروں میں مہمان خانے بنوائے۔

۲۵۔ یہ قاعدہ مقرر کیا کہ عرب والے خواہ کافر ہی ہوں کسی کے غلام نہیں بن سکتے۔

۲۶۔ غریب عیسائی اور یہودیوں کے گزارے کے لیے روزینے مقرر کئے۔

۲۷۔ مکاتب (مدرسے) قائم کئے۔

۲۸۔ استادوں اور مدرسوں کے وظیفے (تنخواہیں) مقرر کیں۔

۲۹۔ قرآن مجید کی ترتیب و تکمیل کا کام پورا کرایا۔

۳۰۔ رمضان میں نماز تراویح کو جماعت سے قائم کرایا۔

۳۱۔ شراب پینے کی سزا اسی کوڑے مقرر کی۔

۳۲۔ تجارت کے گھوڑوں پر زکوٰۃ مقرر کی۔

۳۳۔ وقف کا طریقہ جاری کیا۔

۳۴۔ مسجدوں میں وعظ و تقریر کا طریقہ قائم کیا۔

۳۵۔ اماموں اور موذنوں کے وظیفے (تنخواہیں) مقرر کیں۔

۳۶۔ مسجدوں میں راتوں کی روشنی کا انتظام کیا۔

۳۷۔ غزلیہ اشعار میں عورتوں کا نام لینے سے منع کیا۔

حضرت عثمان غنی ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ

محسن انسانیت پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک بار اپنے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہ تعالیٰ اجمعین کے ہمراہ احد پہاڑ پر تشریف لے گئے تو وہ ہلنے لگا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جبل احد کو مخاطب کر کے فرمایا: ''اے احد ٹھہر جا۔ اس وقت تیری پیٹھ پر ایک نبی، ایک صدیق اور دو شہید کھڑے ہیں۔''

ان دو شہیدوں میں ایک تیسرے خلیفہ راشد حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیشن گوئی کے مطابق حضرت عثمان ذوالنورین کو ۱۸ ذوالحج ۳۵ ہجری کو مدینہ منورہ میں تلاوت قرآن کرتے ہوئے ایک باغی گروہ نے ۸۲ سال کی عمر میں شہید کر دیا۔

اسلامی تاریخ میں نفاق کی ایک لکیر ہے یہ لکیر حضرت عثمان غنیؓ کے خون سے کھینچی گئی اور اسی میں اسلام کا پورا جاہ وجلال دفن ہو گیا۔

حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت کی اصل بنیاد بنی ہاشم اور بنی امیہ کی خاندانی رقابت ہے جب تک اس رقابت کی تشریح نہ کی جائے۔ شہادت کے صحیح اسباب روشنی میں نہیں آ سکتے۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے والد ماجد کے پردادا عبدالمناف کی شخصیت بہت اہم ہے ان کے چار بیٹے تھے۔

نوفل، مطلب، ہاشم، عبدشمس۔

بنی ہاشم اور بنی امیہ کی رقابت کے معنی ہیں ہاشم اور عبدشمس کی اولادوں کی نا اتفاقی۔

ہاشم اگرچہ عبدشمس سے چھوٹا تھا لیکن وہ اپنی لیاقت اور فیاضی سے قوم کا پیشوا

بن گیا۔ اس نے قیصر روم اور نجاشی شاہ حبش سے تجارتی مراعات حاصل کیں اور اس کے بعد خانہ کعبہ کے انتظامات بھی اس کے متعلق ہو گئے۔ یہ سب چیزیں ہاشم کے بھتیجے (عبد شمس کے بیٹے) امیہ کو بہت ناگوار گزریں اور ایک موقع پر اس نے اپنے چچا ہاشم کو لڑائی کا چیلنج دے دیا۔

شرط یہ تھی کہ چچا (ہاشم) اور بھتیجا (امیہ) کے درمیان مناظرہ ہوگا۔ قبیلہ خزاعہ کا ایک کاہن مناظرے کا فیصلہ دے گا اور فریقین اس کو منظور کر لیں گے طے پایا کہ ہارنے والا شخص جیتنے والے کو ۵۰ سیاہ چشم اونٹ دے گا اور دس سال کیلئے جلا وطن کر دیا جائے گا۔

ہاشم اور امیہ میں مناظرہ ہوا۔ جج نے امیہ کی شکست کا اعلان کر دیا۔ امیہ نے پچاس اونٹ دیئے اور شام کی طرف جلا وطن کر دیا گیا۔ بس اسی نقطے سے بنی ہاشم اور بنی امیہ میں عناد کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

بعثت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وقت چار آدمی بنی ہاشم کے ستون تھے۔ ہاشم کے بیٹے عبدالمطلب یعنی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دادا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا ابو طالب، حمزہ، عباس اور ابولہب۔ اسی عہد میں بنی امیہ کی قیادت تین آدمیوں کے ہاتھ میں تھی۔ ابوسفیان، عفان اور حکم۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ۴۰ میلادی میں دنیا کے سامنے نبوت کا دعویٰ کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چونکہ بنی ہاشم میں سے تھے اس لئے بنی امیہ کے افراد نے خاندانی رقابت کے باعث آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ساتھ دیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دادا عبدالمطلب نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پالا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا ابو طالب نے آپ کی کڑی حمایت کی تھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچازاد بھائی حضرت علیؓ نے آپ ایمان لانے میں پیش قدمی کی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا حمزہؓ بھی بہت جلد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لے آئے اور قوت بازو ثابت ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دوسرے چچا عباسؓ اگرچہ دیر میں ایمان لائے پھر بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کافی ہمدرد تھے۔

مختصر یہ ہے کہ بنی ہاشم میں صرف ابولہب دشمن رہا اور باقی سب ہاشمی حضرت عباسؓ، حضرت حمزہؓ، جناب ابوطالب، حضرت علیؓ اور حضرت عقیلؓ وغیرہ ایمان لے آئے یہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا تھے یا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچاؤں کی اولاد۔

اس زمانے میں بنی امیہ کے تین سردار تھے۔ ابوسفیان، عفان اور حکم۔ ان کے بعد ان کے بیٹے رئیس خاندان قرار پائے۔ ابوسفیان کے بیٹے امیر معاویہؓ۔ عفان کے فرزند حضرت عثمانؓ اور حکم کے بیٹے مروان، اب سب میں عفان کے بیٹے حضرت عثمانؓ نے پیش قدمی کی اور مسلمان ہو گئے اور باقی سب لوگ عام طور پر پیغمبر اسلام کی مخالفت پر تلے رہے۔ یہاں یاد رکھیے کہ امیر معاویہؓ، حضرت عثمانؓ اور مران یہ تینوں امیہ کے پڑ پوتے ہیں اور حضرت عثمانؓ کی شہادت کے اسباب انہیں تینوں حضرات کے باہمی تعلقات میں مضمر ہیں۔

پیغمبر اسلام کی مکی زندگی میں بنی ہاشم حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے موافق تھے اور بنی امیہ مخالف اسی دوران عفان کے بیٹے حضرت عثمانؓ مشرف بہ اسلام ہو گئے۔ ان کا بنی امیہ کے مخالف کیمپ سے تن تنہا ہاشمی کیمپ میں چلے آنا بڑی جرات وصداقت کی بات تھی اور یہی ایک چیز حضرت عثمانؓ کی عظمت ونورانیت کی دلیل بھی ہے۔ اس کے کچھ عرصہ کے بعد بنی امیہ کے دوسرے افراد بھی مسلمان ہو گئے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان نفوس کا اس طرح تزکیہ فرمایا کہ بنی ہاشم اور بنی امیہ کی دیرینہ رقابت محو ہو کر رہ گئی۔ اب اموی اور ہاشمی بھائی بھائی تھے اور ایک دوسرے سے بڑھ اسلام کی خدمات سرانجام دے رہے تھے۔

پیغمبر انسانے کے پردہ فرمانے کے بعد حضرت صدیق اکبرؓ خلیفہ ہوئے اور یہ وقت بڑے امن سے گزرا اور پھر حضرت عمر فاروقؓ خلیفہ ہوئے اور آپ کا زمانہ بھی بڑی کامیابی سے گزرا۔ ۲۳ ہجری میں حضرت عمر فاروقؓ نے انتقال فرمایا اور وصیت کی کہ علیؓ، عثمانؓ، زبیرؓ، طلحہؓ، سعد وقاصؓ اور عبدالرحمان بن عوفؓ یہ چھ آدمی تین دن کے اندر اندر کسی کو خلیفہ منتخب کر لیں۔ پورے دو دن بحث میں گزر گئے اور کوئی بات طے نہ ہوئی۔ تیسرے

دن حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ نے کہا کہ ہم میں سے تین آدمی ایک ایک شخص کے حق میں دستبردار ہو جائیں تا کہ چھ کی بحث تین میں محدود ہو جائے۔ اس پر حضرت زبیرؓ، حضرت علیؓ کے حق میں دستبردار ہو گئے۔ حضرت طلحہؓ، حضرت عثمانؓ کے حق میں دستبردار ہو گئے اور حضرت سعد وقاصؓ، حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ کے حق میں۔

حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ نے کہا میں امیدواری سے دستبردار ہوتا ہوں۔

اب بحث صرف علیؓ اور عثمانؓ میں رہ گئی چونکہ حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ نے ایثار کیا تھا۔ اس لئے ان دونوں نے اپنا آخری فیصلہ ان کے سپرد کر دیا۔ حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ نے تمام صحابہ کو مسجد میں جمع کر کے مختصری تقریر کی اور اپنا فیصلہ سنایا۔ سب سے پہلے اسی مسجد میں خود بیعت کی۔ اس کے بعد حضرت علیؓ نے بیعت کی اور پھر تمام مخلوق بیعت کیلئے ٹوٹ پڑی اور بنی امیہ کے ایک معزز فرزند حضرت عثمانؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین مقرر ہو گئے گو اس وقت یہ بات زبانوں پر نہ آئی ہوتا، ہم دلوں نے یہ ضرور محسوس کیا لیجئے رسول ہاشمی کی مسند پر خلافت بنی امیہ کا ایک فرزند متمکن ہو گیا۔ یہ ۳ محرم ۲۴ ہجری کا واقعہ ہے۔

حضرت عثمانؓ کی خلافت کے پہلے چھ سال بڑے پر امن گزرے لیکن آخری چھ سالوں میں دنیا کا رنگ ہی پلٹ گیا۔ اس انقلاب کی اصل وجہ صرف یہ تھی کہ صحابہ کرامؓ کی وہ مبارک جماعت جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرہ مبارک کی روشنی میں زندگی اور اتحاد کے سبق سیکھے تھے۔ اس دنیا سے رخصت ہو رہی تھی اور وہ نئی نسلیں جو اس باخدا جماعت کی وارث ہوئیں تقویٰ اور اتحاد میں ان کی وارث نہ تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہؓ کی سب سے بڑی فضیلت یہ تھی کہ ان کا جینا مرنا محض اللہ کیلئے تھا چونکہ وہ غرض سے خالی تھے اس لئے وہ نفاق واختلاف سے بھی خالی تھے لیکن اب جو نئی نسلیں میدان میں آئیں وہ اس درجہ بے نفس اور بے غرض نہ تھیں اور اسی واسطے ان میں اختلاف وانتشار کا رنگ بھی نمایاں تھا اور اقتدار ومفاد کی طلب بھی موجود تھی۔

دلوں پر توحید کا رنگ جس قدر زیادہ ہوگا اسی قدر کھوٹ، خیانت، غرض ونفاق

سے پاک ہوں گے اور وہ دل جو غرض اور نفاق سے پاک ہوں گے بے تکلف متحد بھی ہو جائیں گے لیکن جب صحابہ ؓ کرام کی اولادوں میں توحید کا جذبہ گھٹا، تو غرضیں بڑھ گئیں اور جس قدر غرضیں بڑھیں اسی قدر دلوں میں تفاوت پیدا ہو گیا اور اسی تفاوت قلوب کا آخری نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی سالوں میں خلافت اور امارت اسلامی کے قلعے پارہ پارہ ہو گئے۔

حضرت عثمانؓ کے زمانے میں نفاق کی تین تحریکیں پیدا ہوئیں۔

1۔ ہاشمی لوگ اپنے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وارث سمجھتے تھے اور خاندانی رقابت کے تحت یہ صورت حالات انہیں کچھ زیادہ پسندیدہ معلوم نہ ہوتی تھی کہ بنی امیہ کے سردار کا بیٹا رسول ہاشمی کے دین وحکومت کا امام ہو۔

2۔ مسلمانوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی۔ غیر قریش قبائل نے فتوحات اسلامی میں قریش کے دوش بدوش کام کیا تھا۔ انہیں یہ گوارا نہ تھا کہ افسری کا تاج صرف قریش ہی پہنے رہیں۔

3۔ اسلام کی شعاعیں روم، شام اور مصر تک پھیل چکی تھیں، یہودی، مجوسی، عیسائی ہزار ہا کی تعداد میں حلقہ اسلام میں داخل ہو چکے تھے اور مساوات اسلامی کے نظریہ کے تحت اپنے آپ کو اہل عرب کے مساوی کہتے تھے۔ انہیں عربوں کی ترجیح گوارا نہ تھی۔

مختصر یہ کہ بنی ہاشم کا دل بنی امیہ سے متحد نہ تھا۔ عام عرب قریش کے اقتدار سے جلتے تھے۔ تمام عجمی عربوں کے اقتدار پر حسد کرتے تھے یعنی حکومت کے اعلیٰ، درمیانی اور ادنیٰ تینوں طبقوں میں حسب مدارج نفاق واختلاف اور حسد ورقابت نے اپنی تخم ریزیاں شروع کر دی تھیں۔

سب سے پہلے کوفہ میں انقلابی اثرات ظاہر ہوئے اور اشتر نخعی نے لوگوں میں یہ خیال پھیلایا کہ از روئے شریعت اسلام میں کوئی حق نہیں ہے کہ چند قریش تمام دنیائے اسلام کو اپنا غلام بنائے رکھیں چونکہ عام مسلمانوں نے کئی ممالک فتح کئے ہیں اس لئے وہ

سب امارت کے مستحق ہیں۔ غیر عربی مسلمانوں نے اشتر نخعی کی تلقین کو بڑی تیزی سے قبول کیا۔ ایک سازش پارٹی بنالی گئی اور سعید بن عاص گورنر کوفہ کے خلاف پراپیگنڈہ شروع کر دیا۔ گورنر نے اپنے بچاؤ کیلئے حضرت عثمانؓ کی منظوری لے کر اس انقلابی پارٹی کے دس لیڈروں کو شام کی طرف جلاوطن کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بصرہ میں بھی ایک انقلابی پارٹی پیدا ہو گئی کوفہ اور بصرہ میں جو کام اشتر نخعی نے کیا تھا، عبداللہ بن سبا مصر میں اس کا بیڑا اٹھا چکا تھا۔ جب عبداللہ بن سبا کو جو ایک یہودی النسل نو مسلم تھا بصرہ اور کوفہ کی سازشی پارٹیوں کا حال معلوم ہوا تو وہ بے حد خوش ہوا اور اس نے بہت ہی تھوڑی محنت سے ان تمام پارٹیوں کو منظم کر کے اس امر پر آمادہ کر لیا کہ حضرت عثمانؓ کو مسند خلافت سے معزول کر کے بنی امیہ کی طاقت کو توڑ دیا جائے۔ اس نے اپنے مبلغ ہر طرف پھیلا دیئے۔ یہ لوگ دینداری اور مولویت کا لباس پہن کر پہلے عام مسلمانوں کا اعتماد حاصل کرتے تھے پھر انہیں حضرت عثمانؓ اور ان کے گورنروں کے خلاف شکایتیں سناتے تھے اور خیر خواہی اسلام کے پردے میں خلیفۃ المسلمین سے بدگمان کر دیتے تھے۔

انقلابی پراپیگنڈہ کی کامیابی کا اندازہ اس سے کیجئے کہ محمد بن ابو حذیفہ اور محمد بن ابوبکر صدیق جیسے آدمی بھی تحریک انقلاب میں شامل ہو گئے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ خود مدینہ منورہ کا حال بھی بگڑنے لگا ایک دن حضرت عثمانؓ کے خطبہ جمعہ کے درمیان محمد بن ابو حذیفہ کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا عثمان! کتاب اللہ کی پیروی کرو۔ حضرت عثمانؓ نے نہایت نرمی سے فرمایا آپ بیٹھ جایئے مگر اثنائے خطبہ میں یہ دوسری بار کھڑا ہو گیا۔ مگر پیکر حلم عثمانؓ اب بھی طیش نہ آئے۔ آپ نے پھر نرمی اور محبت سے فرمایا۔ آپ بیٹھ جایئے اور خطبہ سنیئے چونکہ یہ سب ایک سازش کے ماتحت تھا۔ اس واسطے دفعتاً اس کے بہت سے ساتھی اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے عین خطبہ ہی میں خلیفہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گھیر لیا اور اس قدر پتھر برسائے کہ نائب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زخموں سے چور چور ہو کر زمین پر گر پڑے۔ پیکر حلم حضرت عثمانؓ کے صبر وتحمل کی داد دیجئے کہ آپ نے مفسدین سے کوئی باز پرس نہ کی جو کچھ گزر چکا تھا اسے برداشت کر لیا اور سب کو معاف کر دیا۔

مفسدین کی طرف سے حضرت عثمانؓ پر پانچ اہم الزامات لگائے گئے۔

۱۔ آپ نے اکابر صحابہؓ کی بجائے اپنے ناتجربہ کار رشتہ داروں کو بڑے بڑے عہدے دے رکھے ہیں۔

۲۔ آپ اپنے عزیزوں پر بیت المال کا روپیہ بے جا صرف کرتے ہیں۔

۳۔ آپ نے زید بن ثابتؓ کے لکھے ہوئے قرآن کے سوا باقی سب صحیفوں کو جلا دیا ہے۔

۴۔ آپ نے بعض صحابہؓ کی تذلیل کی ہے اور نئی نئی بدعتیں اختیار کر لی ہیں۔

۵۔ مصری وفد کے ساتھ صریح بدعہدی کی ہے۔

یہ تمام الزامات قطعی طور پر سازشیوں کی شرارت کا نتیجہ تھے یہ اس طرح کہ

۱۔ صحابہؓ کی معزولی انتظامی اسباب سے متعلق تھی۔

۲۔ عزیزوں کو آپؓ نے جو کچھ دیا اپنے ذاتی مال سے دیا۔

۳۔ آپؓ نے جس صحیفہ کو باقی رکھا وہ خود حضرت صدیق اکبرؓ نے تیار کرایا تھا اور اس سے زیادہ مکمل و مستند صحیفہ اور کون سا ہو سکتا تھا۔

۴۔ جن بدعات کا حوالہ دیا گیا ان کا تعلق اجتہادی مسائل سے تھا اس لئے انہیں بدعت نہیں کہا جا سکتا۔

۵۔ مصری وفد کے حالات ابھی بیان کئے جائیں گے۔

جب حضرت عثمانؓ کو ان شورشوں کا علم ہوا تو انہوں نے تمام صوبوں کے گورنروں کو جمع کر کے رائے طلب کی۔ گورنروں کی اس کانفرنس میں حضرت موصوف کو حسب ذیل مشورے دیئے گئے۔

عبداللہ بن عامر: کسی ملک پر فوج کشی کر کے لوگوں کو جہاد میں مصروف کر دینا چاہیئے شورش از خود رفتہ رفتہ ختم ہو جائے گی۔

امیر معاویہ: ہر صوبے کا گورنر اپنے صوبے کو خود سنبھالے۔

عبداللہ بن سعد: روپیہ دے کر شورش پسندوں کی حرص پوری کر دی جائے۔

عمرو بن عاص: آپ عدل کریں ورنہ مسند خالی کر دیں۔

لیکن جب کانفرنس منتشر ہو گئی تو عمرو بن عاص نے معذرت کی اور کہا کہ مفسدین کا اعتماد حاصل کرنے کیلئے وہ رائے پیش کی تھی۔ اب میں ان سے آپ کو مطلع کرتا رہوں گا۔

گورنر کانفرنس کے بعد حضرت عثمانؓ نے تمام معاملات پر خود غور کرنے کے لئے تین اقدام کئے۔

ا۔ گورنر کوفہ سعد بن العاص کو معزول کر کے ابو موسیٰ اشعری کو گورنر مقرر کر دیا۔

ب۔ تمام صوبوں میں اصلاح حال کیلئے تحقیقاتی وفد روانہ کئے۔

ج۔ اعلان کیا گیا کہ حج کے موقع پر تمام لوگ اپنی شکایات پیش کریں تدارک کیا جائے گا۔

مفسدین کو اصلاح منظور نہ تھی۔ اس لئے انہوں نے ٹھیک اس وقت جبکہ حضرت عثمانؓ اصلاحات پیش فرما رہے تھے الگ الگ پارٹیاں بنا لیں اور اپنے آپ کو حاجی ظاہر کر کے مدینہ کی طرف کوچ کر دیا۔ جب یہ لوگ شہر کے قریب پہنچے تو وہاں ایک حملہ آور فوج کی شکل اختیار کر کے اقامت ڈال دی۔ جب حضرت عثمانؓ کو اس مظاہرے کا علم ہوا تو آپ نے حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت سعد بن وقاصؓ اور حضرت علیؓ کو باری باری ان کے پاس بھیجا اور ترغیب دی کہ تمام مظاہرین اپنے اپنے علاقوں میں واپس چلے جائیں۔ تمام جائز مطالبات جلد پورے کر دیئے جائیں گے۔ تمام معاملات پر مسجد میں غور کیا گیا۔ طلحہ بن عبید اللہ کھڑے ہوئے اور انہوں نے نہایت سخت الفاظ میں حضرت عثمانؓ سے گفتگو کی۔ حضرت عائشہؓ کی طرف سے پیغام آیا کہ آپ عبداللہ بن ابی سرح کو جس پر صحابہؓ کے قتل کا الزام ہے کیوں مصر کی امارت سے الگ نہیں کر دیتے؟۔ جب حضرت علیؓ نے بھی اس خیال کی تائید فرمائی تو ارشاد فرمایا۔ یہ لوگ اپنا امیر خود تجویز کر لیں۔ میں اس کو عبداللہ

بن ابی سرح کی جگہ مقرر کر دوں گا۔ لوگوں نے محمد بن ابوبکرؓ کو منتخب کیا تو آپ نے ان کی تقرری اور عبداللہ بن ابی سرح کی علیحدگی کا فرمان لکھ دیا۔ یہ فرمان لے کر محمد بن ابوبکرؓ بہت سے مہاجرین وانصار کے ساتھ تشریف لے گئے اور معاملہ ختم ہو گیا۔

اس واقعہ کے چند روز بعد مدینہ میں ناگہاں شور اٹھا کہ مفسدین کی جماعتیں پھر مدینہ میں آگھسی ہیں اور یورش پیدا کر رہی ہیں۔ شور سن کر تمام مسلمان اپنے اپنے گھروں سے نکل آئے دیکھا کہ مدینے کے تمام گلی کوچوں میں انتقام انتقام کا شور برپا ہے۔ جب مفسدین سے ان کی حیرت انگیز واپسی کا سبب دریافت کیا گیا تو انہوں نے حضرت عثمانؓ پر ایسا عجیب الزام لگایا کہ تمام لوگ دم بخود رہ گئے۔ انہوں نے کہا کہ محمد بن ابوبکر تیسری منزل میں تھے کہ وہاں سے خلافت کا ایک شتر سوار گزرا جو نہایت تیز رفتاری کے ساتھ مصر کی طرف چلا جا رہا تھا۔ محمد بن ابوبکر کے رفیقوں نے اسے پکڑ لیا اور اس سے دریافت کیا کہ تم کون ہو۔ اور کہاں جا رہے ہو؟۔ شتر سوار نے کہا کہ میں امیر المومنین کا غلام ہوں اور حکم مصر کے پاس جا رہا ہوں۔ لوگوں نے محمد بن ابوبکر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ یہ حاکم مصر، شتر سوار نے کہا یہ نہیں ہیں اور اپنے راستے پر چل دیا لوگوں نے اسے دوبارہ پکڑ لیا اور جب اس کی تلاشی لی گئی تو اس کے خشک مشکیزہ کے اندر سے ایک خط ملا۔ جس میں حضرت عثمانؓ کی مہر کے ساتھ یہ لکھا گیا تھا کہ محمد بن ابوبکر اور ان کے فلاں فلاں ساتھی جس وقت بھی تمھارے پاس پہنچیں انہیں قتل کر دیا جائے اور ہر شکایت کرنے والے کو تاحکم ثانی قید رکھا جائے۔

مفسدین نے کہا۔ حضرت عثمانؓ نے ہمارے ساتھ دھوکہ کیا ہے۔ اب ہم ضرور ان سے انتقام لیں گے۔ حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت سعدؓ اور بہت سے صحابہ کرامؓ جمع ہوئے اور مفسدین نے ''حضرت عثمانؓ '' کا خط ان کے سامنے رکھ دیا۔ حضرت عثمانؓ بھی یہاں تشریف لے آئے اور گفتگو شروع ہوئی۔

حضرت علیؓ: امیر المومنین یہ آپ کا غلام ہے۔

حضرت عثمانؓ: ہاں

حضرت علیؓ: امیر المومنین یہ اونٹنی آپ کی ہے۔

حضرت عثمانؓ: ہاں میری ہے۔

حضرت علیؓ: امیر المومنین اس خط پر آپ کی مہر ہے؟۔

حضرت عثمانؓ: ہاں میری مہر ہے۔

حضرت علیؓ: کیا یہ خط آپ نے لکھا ہے؟۔

حضرت عثمانؓ: میں اللہ کو حاضر و ناظر جان کر یہ حلف اٹھاتا ہوں کہ یہ خط میں نے نہیں لکھا۔ اور نہ میں نے کسی کو اس کے لکھنے کا حکم دیا اور نہ مجھے اس کے متعلق کچھ معلوم ہے۔

حضرت علیؓ: تعجب ہے کہ غلام آپ کا، اونٹنی آپ کی، خط پر مہر آپ کی اور پھر بھی آپ کو خط کے متعلق کچھ معلوم نہیں؟۔

حضرت عثمان: واللہ! نہ میں نے اس خط کو لکھا نہ کسی سے لکھوایا۔ نہ میں نے غلام کو دیا کہ وہ اسے مصر لے جائے۔

اب خط دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ مروان کا رسم الخط ہے۔ اس وقت مروان حضرت عثمانؓ کے مکان میں موجود تھا۔ لوگوں نے کہا۔ مروان کو ہمارے سپرد کر دیجئے مگر آپ نے انکار فرما دیا۔ اس پر ایک انتشار رونما ہوا۔ اکثر لوگوں کی رائے یہ تھی کہ حضرت عثمانؓ کبھی جھوٹی قسم نہیں کھاتے مگر بعض کرتے تھے کہ آپ مروان کو ہمارے حوالے کیوں نہیں کرتے تاکہ ہم تحقیق کر لیں۔ اگر مروان کی غلطی ثابت ہوئی تو ہم اسے سزا دیں گے لیکن حضرت عثمانؓ کو شبہ یہ تھا کہ اگر مروان مفسدین کے سپرد کیا گیا تو وہ قتل کر دیں گے۔ اس لئے آپ نے مروان کی سپردگی سے انکار کر دیا۔

اس کے بعد مفسدین نے حضرت عثمانؓ کے گھر کا محاصرہ کر لیا اور مطالبہ کیا، کہ حضرت عثمانؓ مسند خلافت سے کنارہ کش ہو جائیں۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا جب تک مجھ میں سانس باقی ہے میں اس خلعت کو جو خدا نے مجھے پہنایا ہے اپنے ہاتھ سے نہیں اتاروں گا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وصیت کی مطابق اپنی زندگی کے آخری لمحے تک صبر

سے کام لوں گا۔

محاصرہ چالیس دن تک جاری رہا۔ کوئی شخص کھانا یا پانی اندر نہیں لے جا سکتا تھا۔ بے احترامی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ بڑے بڑے اکابر صحابہ کی بھی شنوائی نہ تھی۔ ایک دفعہ ام المومنین حضرت ام حبیبہؓ خود کھانا اٹھا کر لے گئیں تو مفسدین نے حرم رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی بے ادبی سے واپس کر دیا۔

حضرت عثمانؓ نے حضرت علیؓ کو بلا بھیجا مگر باغیوں نے انہیں داخلہ کی اجازت نہ دی۔ حضرت علیؓ نے اپنا عمامہ اتار کر حضرت عثمانؓ کے پاس بھیج دیا تھا کہ آپ کو نزاکت حال کا علم ہو جائے اور خود ننگے سر واپس تشریف لے گئے۔

مدینہ کے تمام معاملات کی باگ حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کے ہاتھ میں رہتی تھی مگر اس ہنگامہ کرب وفساد میں ان اکابر کی آواز بھی بے اثر ہو گئی۔ حرم سرائے عثمانؓ کے محصورین کی تکالیف جب حد سے زیادہ بڑھ گئیں تو حضرت عثمانؓ خود بالا خانے پر تشریف لے گئے اور فرمایا! کیا تم میں علیؓ موجود ہیں؟ لوگوں نے کہا۔ نہیں پھر آپ نے فرمایا کیا اس مجمع میں سعدؓ موجود ہیں؟ جواب دیا گیا، وہ بھی نہیں۔ اب آپ رُک گئے تھوڑی دیر بعد فرمایا کیا تم میں کوئی ایسا شخص ہے جو حضرت علیؓ سے جا کر یہ کہہ دے کہ وہ ہم پیاسوں کو پانی پلا دیں۔ ایک دردمند آدمی نے نائب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یہ دردمند الفاظ سنے تو وہ بے تابانہ حضرت علیؓ کے پاس پہنچا۔ آپ نے پانی کے تین مشکیزے اسی وقت بھجوائے مگر یہ پانی بھی اتنی مشکل سے پہنچا کہ بنی ہاشم اور بنی امیہ کے چند غلام زخمی ہو گئے۔ اب مدینہ میں یہ خبر اُڑی کہ اگر مروان سپرد نہ کیا گیا تو حضرت عثمانؓ قتل کر دیئے جائیں گے۔ یہ سن کر حضرت علیؓ نے امام حسنؓ اور امام حسینؓ سے فرمایا کہ تم دونوں امیر المومنین کے دروازے پر ننگی تلواریں لئے کھڑے رہو اور کسی شخص کو اندر داخل نہ ہونے دو۔ حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ اور کئی دوسرے صحابہ نے بھی اپنے اپنے لڑکوں کو آپ کی حفاظت کیلئے بھیجا۔

حضرت عثمانؓ نے متعدد بار باغیوں کو سمجھانے کی کوشش فرمائی۔ ایک دفعہ آپ

محل سرائے کی چھت پر تشریف لے گئے اور باغیوں سے مخاطب ہو کر کہا۔

''اے لوگو! وہ وقت یاد کرو جب مسجد نبوی کی زمین تنگ تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کون ہے جو اللہ کیلئے اس زمین کو خرید کر مسجد کیلئے وقف کرے اور جنت میں اس سے بہتر جگہ کا وارث ہو۔ وہ کون تھا کہ جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس حکم کی تعمیل کی تھی؟۔''

آوازیں آئیں۔ ''آپ نے تعمیل کی تھی۔''

پھر فرمایا۔ ''کیا تم آج اسی مسجد میں مجھے نماز پڑھنے سے روکتے ہو؟۔''

پھر فرمایا۔ ''میں تمہیں خدا کی قسم دیتا ہوں کہ تم وہ وقت یاد کرو۔ جب مدینہ میں بیر رومہ کے سوا میٹھے پانی کا کوئی کنواں نہ تھا اور تمام مسلمان روزانہ قلت آب سے تکلیفیں اٹھاتے تھے۔ وہ کون تھا کہ جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے اس کنوئیں کو خریدا اور عام مسلمانوں پر وقف کر دیا؟۔''

آوازیں آئیں۔ آپ نے وقف فرمایا تھا۔

حضرت عثمانؓ نے فرمایا۔ '' آج اسی کنوئیں کے پانی سے تم مجھے روک رہے ہو۔''

پھر فرمایا۔ ''لشکر عسرت کا ساز وسامان کس نے آراستہ کیا تھا؟۔''

لوگوں نے کہا۔ آپ نے۔

پھر فرمایا۔ ''میں تم کو خدا کی قسم دیتا ہوں اور پوچھتا ہوں کہ تم میں سے کوئی ہے جو اللہ کیلئے حق کی تصدیق کرے اور یہ بتائے کہ جب ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم احد پہاڑ پر چڑھے تو وہ ہلنے لگا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس پہاڑ کو ٹھکرا دیا اور فرمایا۔ اے اُحد! ٹھہر جا کہ اس وقت تیری پیٹھ پر ایک نبی، ایک صدیق اور دو شہید کھڑے ہیں اور میں اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھا۔''

آوازیں آئیں۔ سچ فرمایا۔

پھر فرمایا۔ ''اے لوگو! خدا کیلئے مجھے بتاؤ کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم نے مجھے حدیبیہ کے مقام پر اپنا سفیر بنا کر قریش کے پاس بھیجا تو کیا واقعہ پیش آیا تھا؟۔ کیا یہ صحیح نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ایک ہاتھ کو میرا ہاتھ قرار دے کر میری طرف سے خود اپنی بیعت کی تھی۔''

مجمع میں سے آوازیں آئیں۔ آپ سچ فرماتے ہیں۔

لیکن افسوس کہ فضل وشرف کے اس اعتراف کے باوجود باغیوں کے پست دماغ سے بدنیتی کا خمار دور نہ ہوا۔ حج کی تقریب چند ہی روز میں ختم ہوئی چاہتی تھی اور باغیوں کو خطرہ تھا کہ مسلمان حج سے فارغ ہو کر مدینہ کی طرف پلٹیں گے اور اس کے ساتھ ہی ان کا سارا منصوبہ ختم ہو جائے گا۔ اس لئے انہوں نے آخری طور پر علان کر دیا کہ حضرت عثمانؓ کو قتل کر دیا جائے حضرت امیر المومنین نے یہ ندا اپنے کانوں سے سنی اور فرمایا۔

اے لوگو!'' آخر کس جرم میں تم میرے خون کے پیاسے ہو؟۔ شریعت اسلامی میں کسی شخص کے قتل کی تین ہی صورتیں ہیں۔ اس نے بدکاری کی ہو تو اسے سنگسار کیا جاتا ہے۔ اس نے قتل عمد کیا ہو وہ قصاص میں مارا جاتا ہے۔ وہ مرتد ہو گیا ہو تو اسے انکار اسلام پر قتل کر دیا جاتا ہے؟۔ تم اللہ کیلئے بتاؤ کیا میں نے کسی کو قتل کیا ہے؟۔ کیا تم مجھ پر بدکاری کا الزام لگا سکتے ہو؟۔ کیا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین سے پھر گیا ہوں؟ سنو، میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ ایک ہے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں۔ کیا اب اس کے بعد بھی تمھارے پاس میرے قتل کی وجہ جواز باقی ہے؟۔''

حضرت عثمانؓ کے ان دردناک الفاظ کا کسی کے پاس بھی جواب موجود نہ تھا لیکن پھر بھی مفسدین کے دلوں میں خدا کی پکڑ کا احساس پیدا نہ ہوا۔ مفسدین کی جماعت اپنے ناپاک ارادوں پر اب بھی قائم تھی۔

جب حالات زیادہ نازک ہو گئے تو حضرت مغیرہ بن شعبہؓ، حضرت عثمانؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ اے امیر المومنین! میں اس نازک وقت میں تین باتیں عرض کرتا ہوں۔ آپ کے طرف داروں اور جان بازوں کی ایک طاقتور جماعت

یہاں موجود ہے۔ آپ جہاد کا حکم دیجئے۔ اس وقت بے شمار مسلمان رفاقت حق کیلئے کمر بستہ ہیں۔ اگر یہ رائے مقبول نہ ہو تو آپ صدر دروازہ کے سامنے کی دیوار توڑ کر محاصرہ سے نکلیے اور مکہ معظمہ تشریف لے جائیے۔ اگر یہ بھی پسند نہ ہو تو پھر شام چلے جائیے۔ وہاں کے لوگ وفادار ہیں۔ آپ کا ساتھ دیں گے۔

پیکر استقلال حضرت عثمانؓ نے فرمایا میں مسلمانوں کے ساتھ جنگ نہیں کر سکتا۔ مجھے یہ منظور نہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خلیفہ ہو کر امت کا خون بہاؤں۔ میں وہ خلیفہ نہ بنوں گا جو امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں خون ریزی کی ابتدا کرے۔ میں مکہ معظمہ میں بھی نہیں جا سکتا کیونکہ میں نے اپنے آقا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ سنا ہے کہ قریش میں کوئی آدمی حرم محترم میں فتنہ وفساد کرائے گا اور اس پر آدھی دنیا کا عذاب ہو گا۔ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس وعید کا کبھی مورد نہیں بن سکتا۔ باقی رہا شام کا ارادہ تو میرے لئے یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ میں اپنے دار ہجرت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پڑوس کی نعمت کو پس پشت ڈال دوں اور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہمسائیگی ترک کر دوں۔

حالات پہلے سے بھی زیادہ نازک ہو گئے۔ اس وقت حضرت عبداللہ بن زبیر حاضر خدمت ہوئے اور عرض کی۔ اے خلیفہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! اس وقت سات سو جانبازوں کی جمعیت محل سرا کے اندر موجود ہے، ایک بار اجازت دیجئے کہ ہم باغیوں کی طاقت آزما لیں۔

ارشاد فرمایا۔ میں خدا کا واسطہ دیتا ہوں کہ ایک بھی مسلمان میرے لئے خون نہ بہائے۔ پھر بیس غلاموں کو جو گھر میں موجود تھے، طلب فرمایا وہ حاضر ہو گئے تو فرمایا۔ آج تم اللہ کیلئے آزاد ہو۔ اس وقت زید بن سعدؓ حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ اے امیر المومنین! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انصار دروازے پر کھڑے ہیں اور چاہتے ہیں کہ آج پھر اپنا وعدہ نصر پورا کر دیں۔ ارشاد فرمایا اگر لڑائی مقصود ہے تو اجازت نہ دوں گا۔ آج میری سب سے بڑی حفاظت یہ ہے کہ کوئی مسلمان میرے لئے تلوار نہ اٹھائے۔

حضرت ابو ہریرہؓ تشریف لائے اور نہایت انکسار کے ساتھ جہاد کی اجازت طلب کی۔ وہ جانتے تھے کہ نائب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے جہاد کا ایک لفظ لاکھوں مسلمانوں کو ان کے جھنڈے تلے جمع کر دے گا۔ ارشاد فرمایا۔ ''اے ابو ہریرہؓ! تمھیں یہ پسند آئے گا کہ تم تمام دنیا کو اور اس کے ساتھ مجھے بھی قتل کر دو۔'' حضرت ابو ہریرہؓ نے عرض کیا۔

''اے امیر المومنین! کوئی مسلمان اس چیز کو بھی پسند کر سکتا ہے''؟۔

ارشاد فرمایا۔ ''اگر تم نے ایک شخص کو بھی ناحق قتل کیا تو گویا تم نے مخلوق قتل کر دی۔ یہ سورہ مائدہ کی آیت کی طرف اشارہ تھا۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے یہ سنا تو چپ ہو گئے اور واپس تشریف لے گئے۔

شہادت:

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت عثمانؓ کی شہادت کے متعلق پیشنگوئی فرما چکے تھے۔ عام مسلمان حضرت عثمانؓ کی خاموشی اور باغیوں کی تباہ کاریوں پر خون کے آنسو رو رہے تھے مگر حضرت عثمانؓ بالکل چپ تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وصیت کی تکمیل کا انتظار فرما رہے تھے۔ ابھی جمعہ کا آفتاب طلوع نہ ہوا تھا کہ آپ نے روزہ کی نیت فرمائی۔ اسی صبح خواب میں دیکھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے ہیں اور حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت عمر فاروقؓ آپ کے ہمرکاب ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حضرت عثمانؓ نے فرمایا۔ میری شہادت کا وقت قریب آ گیا ہے۔ باغی ابھی مجھے قتل کر ڈالیں گے۔ انہوں نے دردمندانہ کہا۔ امیر المومنین ایسا نہیں ہوسکتا۔ ارشاد فرمایا۔ میں یہ خواب دیکھ چکا ہوں۔ جب بستر سے اٹھے تو آپ نے وہ پاجامہ طلب فرمایا جس کو آپ نے کبھی نہیں پہنا تھا۔ اور اسے زیب تن فرمایا۔ پھر بیس غلاموں کو آزاد کر کے کلام پاک کو کھولا اور یاد حق میں مصروف ہو گئے۔

یہ حضرت عثمانؓ کے حرم سرا کے اندرونی حالات تھے۔ ٹھیک اسی وقت محل سرا کے باہر محمد بن ابوبکرؓ نے تیر چلانے شروع کر دیئے۔ ایک تیر حضرت حسنؓ کو جو دروازہ پر

کھڑے تھے لگا اور وہ زخمی ہو گئے۔ دوسرا تیر محل کے اندر مروان تک پہنچا۔ ایک تیر سے حضرت علیؓ کے غلام قنبر کا سر زخمی ہو گیا۔ محمد بن ابی بکرؓ کو خوف پیدا ہوا کہ امام حسنؓ کا خون رنگ لائے بغیر نہیں رہے گا۔ یہ سوچ کر انہوں نے اپنے دو ساتھیوں سے کہا کہ اگر بنی ہاشم پہنچ گئے تو وہ حسنؓ کو دیکھ کر عثمانؓ کو بھول جائیں گے اور ہماری تمام کوششیں ناکام ہو جائیں گی۔ اس لئے چند آدمی اسی وقت محل سرا میں کود یں اور اپنا کام ختم کر دیں۔ محمد بن ابوبکرؓ کے ساتھیوں نے اس تجویز کے ساتھ اتفاق کیا اور اسی وقت چند باغی دیوار پھاند کر محل سرا میں داخل ہو گئے۔ اس وقت جتنے بھی مسلمان محل سرا میں موجود تھے۔ اتفاق سے وہ سب اوپر کی منزل پر بیٹھے تھے اور حضرت عثمانؓ نیچے کے مکان میں تن تنہا مصروف تلاوت تھے۔ محمد بن ابوبکرؓ نے قابل صد افسوس حرکت کا ثبوت دیا۔ آگے بڑھے اور ہاتھ بڑھا کر حضرت عثمانؓ کی ریش مبارک پکڑ لی اور اسے زور زور سے کھینچنے لگے۔ حضرت عثمانؓ نے ارشاد فرمایا۔ ''بھتیجے! اگر آج حضرت صدیق اکبرؓ زندہ ہوتے تو اس منظر کو پسند نہ فرماتے''۔ اب محمد بن ابوبکر پشیمان ہوا اور پیچھے ہٹ گیا مگر کنانہ بن بشر نے پیشانی مبارک پر لوہے کی سلاخ سے ایک دردناک ضرب لگائی اور رسول اللہ صلی علیہ وآلہ وسلم کا یہ بزرگ ترین نائب فرش زمین پر گر پڑا اور فرمایا۔ ''بسم اللہ توکلت علی اللہ'' دوسری ضرب سودان بن حمران نے ماری جس سے خون کا فوارہ چل نکلا۔ عمرو بن حمق کو یہ سفاہت ناکافی معلوم ہوئی۔ یہ ذلیل ترین بدوی حضرت عثمانؓ کے سینے پر کھڑا ہو گیا اور جسم مبارک ومطہر کو نیزے سے چھیدنے لگا اسی وقت ایک اور بے رحم نے تلوار چلائی اور حضرت نائلہؓ نے ہاتھ سے روکا تو ان کی تین انگلیاں کٹ کر گر گئیں اسی کش مکش کے دوران میں حضرت امیر المومنینؓ بے دم ہو رہے تھے کہ روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

جلاّدی اور بہیمت کا یہ دردناک واقعہ صرف نائلہؓ کی غم نصیب آنکھوں کے سامنے ہوا۔ انہوں نے حضرت عثمانؓ کو ذبح ہوتے دیکھا تو آپ کوٹھے پر چڑھ کر چیخنے لگیں۔ امیر المومنین شہید ہو گئے۔ امیر المومنین کے دوست دوڑتے ہوئے نیچے آئے تو حضرت عثمانؓ فرش خاک پر کٹے پڑے تھے۔ جب یہ مصیبت انگیز خبر مدینہ میں پھیلی تو لوگوں

کے ہوش اڑ گئے اور مدہوشانہ دوڑتے ہوئے محل سرا کی طرف آئے مگر اب یہاں کیا رکھا تھا؟۔حضرت علیؓ نے امام حسنؓ کو ایک طمانچہ مارا، ایک مکا امام حسینؓ کی چھاتی پر دیا مگر اب یہ سب کچھ بعد از وقت تھا۔حضرت عثمانؓ محل سرا کے اندر خون میں ڈوبے پڑے تھے۔ محاصرہ اب بھی جاری تھا دو دن تک نعش مبارک وہیں بے گوروکفن پڑی رہی ۔تیسرے دن چند خوش قسمت مسلمانوں نے اس خونی لباس میت کو کندھا دیا۔صرف سترہ مسلمانوں نے نماز جنازہ پڑھی اور کتاب اللہ کے سب سے بڑے خادم اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سب سے بڑے عاشق کو جنت البقیع کے گوشہ میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے سُلا دیا گیا۔

چونکہ حضرت عثمانؓ اس وقت تلاوت فرما رہے تھے اور قرآن مجید سامنے کھلا تھا اس لئے خون ناحق نے جس آیت پاک کو رنگین فرمایا وہ یہ تھی۔

فسيكفيكهم الله وهو العليه مه الحكيمه.

''خدا کی ذات تمہارے لئے کافی ہے۔وہ علیم ہے اور حکیم ہے۔''

حضرت علی مرتضٰی کرم اللہ وجہہ

ابتدائی زندگی

جب رسول خداﷺ دنیا میں تشریف لائے تو قریش کا قبیلہ دس خاندانوں میں بٹا ہوا تھا۔ ہر خاندان کے سردار کے ذمے الگ الگ کام تھے۔کوئی جھگڑے چکاتا اور مقدموں کے فیصلے کرتا تھا۔کوئی حاجیوں کو پانی پلاتا۔کسی کے پاس قریش کا جھنڈا رہتا تھا،قریش سے کسی دوسرے قبیلے کی لڑائی ہوجاتی تھی تو وہ جھنڈا ہاتھ میں لئے فوج کے آگے ہوتا تھا۔کوئی ایلچی بن کے دوسرے قبیلوں کے پاس جاتا تھا اور جن گتھیوں کو تلوار سُلجھا نہ سکتی تھی ۔ انہیں اپنی عقل اور تدبیر سے بڑی آسانی کے ساتھ سلجھا لیتا تھا۔ ان میں ہاشم کا گھرانہ بہت اونچا سمجھا جاتا تھا۔ عرب میں قریش کی عزت اس وجہ سے تھی کہ مکہ مکرمہ میں پرانے زمانے میں ایک مسجد چلی آئی ہے جسے خانہ کعبہ کہتے ہیں۔اس مسجد کے انتظام میں یوں تو قریش کے سارے خاندان شریک تھے لیکن اس کا اصل انتظام ہاشم کے گھرانے کے ہاتھ میں تھا۔اسی گھرانے کے لوگ حاجیوں کو پانی پلاتے تھے۔خانہ کعبہ کی دیکھ بھال کا کام بھی وہی کرتے تھے۔

ہاشم کے گھرانے کے سردار رسول اللہﷺ کے دادہ عبدالمطلب تھے۔ جب ایک حبشی سردار ابرہہ جو یمن کا حاکم تھا ۔ خانہ کعبہ کو ڈھانے کے لیے ہاتھیوں کی فوج لے کر آیا تو سارے قریش مکہ کے آس پاس کے پہاڑوں میں جاچھپے تھے اور عبدالمطلب خانہ کعبہ میں اکیلے رہ گئے تھے۔اللہ تعالیٰ کی قدرت دیکھو کہ جب یہ فوج خانہ کعبہ کی طرف بڑھی تو اس پر ایسی تباہی آئی کہ ابرہہ اور اس کے ساتھی ہاتھیوں سمیت ہلاک ہوگئے ۔ اس واقعہ کے بعد لوگوں کے دلوں میں عبدالمطلب کی قدر زیادہ ہوگئی اور قریش کے سارے خاندان پہلے سے زیادہ ان کی عزت کرنے اور انہیں اپنا سردار ماننے لگے۔

حضرت عبدالمطلب کے دس بیٹے تھے جن میں عبداللہ، حمزہ، عباس،ابوطالب اور ابولہب بہت مشہور ہیں۔عبداللہ رسول خداﷺ کے والد تھے لیکن ابھی رسول اللہﷺ پیدا بھی نہیں ہوئے تھے کہ عبداللہ نے وفات پائی ۔ آپﷺ کی عمر چھ برس کی تھی کہ ماں کا سایہ بھی

سر سے اٹھ گیا اور حضرت عبدالمطلب نے آپ ﷺ کی پرورش اپنے ذمہ لے لی۔ دو برس بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ یہ سہارا بھی جاتا رہا یعنی حضرت عبدالمطلب نے وفات پائی۔ وہ مرتے دم آپ ﷺ کو حضرت ابوطالب کے سپرد کر گئے تھے۔ حضرت ابوطالب بڑے شفیق چچا تھے۔ آپؐ پر جان دیتے اور اپنی اولاد سے زیادہ چاہتے تھے۔ پچیس برس کی عمر تک رسول خدا ﷺ چچا کے ساتھ ہی رہے پھر ان کی اجازت سے مکہ مکرمہ کی ایک شریف اور نیک خاتون حضرت خدیجہؓ سے شادی کر لی اور الگ رہنے لگے۔

حضرت علیؓ حضرت ابوطالب کے چھوٹے بیٹے اور رسول خدا ﷺ کے چچیرے بھائی تھے۔ جب وہ پیدا ہوئے تو رسول اللہ ﷺ تیسویں برس میں تھے۔ حضرت علیؓ ماں باپ دونوں کی طرف سے ہاشمی تھے۔ ان کی والدہ حضرت فاطمہ بنت اسد ابوطالب کے چچا کی بیٹی تھیں۔ ان نیک بی بی نے بڑی محبت اور پیار سے ان کی پرورش کی تھی۔ رسول خدا ﷺ بھی ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ انہوں نے خاصی عمر پائی، ہجرت کر کے مدینہ گئیں اور وہیں انتقال کیا۔ کہتے ہیں کہ جب آنحضرت ﷺ ان کے جنازہ پر گئے تو سرہانے بیٹھ کر کہنے لگے۔ اے میری ماں خدا تجھ پر رحم کرے تو میری ماں کے بعد میری ماں تھی۔ تو آپ بھوکی رہتی تھی اور مجھے کھلاتی تھی تو ننگی رہتی اور مجھے پہناتی تھی۔

حضرت ابوطالب کا کنبہ بہت بڑا تھا اس لیے بڑی تنگی ترشی میں گزر بسر ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ ملک میں قحط پڑا اور حضرت ابوطالب کی زندگی بڑی مصیبت اور پریشانی میں گزرنے لگی۔ یہ حالت دیکھ کر رسول خداؐ نے اپنے دوسرے چچا عباسؓ سے کہا کہ اس حالت میں ہم کو حضرت ابوطالب کا ہاتھ بٹانا چاہیے۔ حضرت عباسؓ نے حضرت علیؓ کے بڑے بھائی حضرت جعفر طیارؓ کی پرورش اپنے ذمہ لے لی اور رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ کو گود لے لیا۔ اس وقت ان کی عمر پانچ برس کی تھی۔ چنانچہ وہ پانچ برس کی عمر سے برابر آپ ﷺ کے ساتھ رہے۔ ان کی پرورش میں حضرت خدیجہؓ کا بھی بڑا حصہ تھا۔

رسول خدا ﷺ کو جب نبوت کا رتبہ ملا تو حضرت علیؓ کی عمر دس گیارہ برس کی تھی۔ ایک دن رسول اللہ ﷺ اور حضرت خدیجہؓ کو نماز پڑھتے دیکھا تو پوچھا۔ آپ یہ کیا کر رہے ہیں۔

آپ ﷺ نے نماز کا مطلب سمجھایا اور اسلام کی تلقین کی۔ چنانچہ حضرت علیؓ بھی مسلمان ہو گئے۔ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو سب سے پہلے ایمان لائے۔ آنحضرت ﷺ کو جب اللہ تعالیٰ نے نبوت کا درجہ عطا کیا تو سب سے پہلے حضرت خدیجہؓ ایمان لائی تھیں۔ ان کے بعد تین بزرگوں یعنی حضرت علیؓ، حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت زیدؓ بن حارثہ نے اسلام قبول کیا۔ یہ تینوں ساتھ ساتھ ایمان لائے تھے۔ اس لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ ان میں سے پہلے کس کو یہ عزت نصیب ہوئی۔

مکی زندگی کے تیرہ برس

حضرت علیؓ اسلام لانے کے بعد تیرہ برس مکہ ہی میں رہے۔ ان کے والد ابوطالب نے اگرچہ اسلام قبول نہیں کیا تھا لیکن وہ بڑے نیک شخص تھے۔ ان دنوں مکہ میں شراب خوری کا بڑا زور تھا، گھر گھر شراب کشید ہوتی تھی۔ لوگ کھلے بندوں پیتے تھے اور اپنی شراب خوری کے قصے بڑے فخر کے ساتھ بیان کرتے تھے لیکن ابوطالب نے کبھی شراب کو ہاتھ نہیں لگایا۔ ایک دن انہوں نے آنحضرت ﷺ اور حضرت علیؓ کو نماز پڑھتے دیکھ لیا پوچھا تم یہ کیا کر رہے ہو؟ آنحضرت ﷺ نے نماز کی حقیقت اور اسلام کے موٹے موٹے اصول بیان کرنے کے بعد کہا۔ چچا آپ بھی اسلام قبول کر لیجئے۔ ابوطالب کہنے لگے مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا۔ البتہ تم جس طرح چاہو خدا کی عبادت کرو۔ تمہیں روکوں گا نہیں۔ ابوطالب خود تو مسلمان نہ ہوئے البتہ انہوں نے مسلمانوں کی حمایت میں خون پسینہ ایک کر دیا۔ کافروں نے جب کبھی مسلمانوں کو ستانا چاہا۔ ابوطالب نے انہیں روک دیا۔ مسلمانوں کی حمایت میں خود انہیں بھی بہت سی مصیبتیں اٹھانی پڑیں۔

شروع شروع میں مسلمان چھپ چھپ کر نمازیں پڑھتے تھے۔ اسلام کی تبلیغ بھی چپکے چپکے ہوتی تھی۔ حج کے دنوں میں جب مکہ مکرمہ میں عرب بھر کے لوگ جمع ہوتے تھے تو آنحضرت ﷺ ان سے مل کر انہیں اسلام کی طرف بلاتے تھے۔ ان موقعوں پر حضرت علیؓ بھی آپؐ کے ساتھ ہوتے تھے۔ حضرت علیؓ کو بتوں سے سخت نفرت تھی۔ جب کبھی موقع ہاتھ

آتا تھا بتوں کو توڑ پھوڑ ڈالتے تھے۔اسلام تین برس تک تو یوں ہی پھیلتا رہا۔چوتھے برس کے شروع میں آنحضرت ﷺ نے کھلم کھلا اسلام کا وعظ کہنا شروع کیا۔آپؐ نے پہلے اپنے قبیلہ کے لوگوں کو کھانے کی دعوت دی۔اس دعوت کا انتظام حضرت علیؓ کے سپرد تھا۔اس وقت ان کی عمر مشکل سے چودہ برس کی تھی۔پھر بھی انہوں نے بہت اچھی طرح دعوت کا انتظام کیا تھا۔اس موقع پر کوئی چالیس آدمی دعوت میں شریک تھے۔لوگ کھانا کھا چکے تو آنحضرت ﷺ نے کھڑے ہوکر تقریر شروع کی اور اسلام کی خوبیاں بیان کر کے کہا تم میں سے کون میرا ساتھ دیتا ہے۔سب لوگ چپکے سے بیٹھے رہے۔اتنے میں حضرت علیؓ اٹھے اور کہنے لگے۔اگرچہ میں عمر میں سب سے چھوٹا ہوں۔میری ٹانگیں پتلی ہیں اور میری آنکھیں دکھتی ہیں لیکن میں آپ ﷺ کا ساتھ دوں گا۔آنحضرت ﷺ نے فرمایا تم بیٹھ جاؤ۔آپؐ نے پھر لوگوں کو اسلام کی طرف بلایا لیکن کسی نے جواب نہ دیا۔حضرت علیؓ پھر اٹھے اور وہی الفاظ کہے۔آنحضرت ﷺ نے انہیں پھر بٹھا دیا۔جب تیسری مرتبہ آنحضرت ﷺ نے اپنے کنبے کے لوگوں کے سامنے اسلام پیش کیا تو کسی نے جواب نہ دیا تو حضرت علیؓ پھر اٹھے۔آنحضرت ﷺ نے فرمایا بیٹھ جا تو میرا بھائی اور وارث ہے۔

اب قریش نے مسلمانوں کو طرح طرح کے دکھ دینے شروع کئے لیکن اسلام آہستہ آہستہ برابر پھیلتا رہا۔انہیں دنوں حضرت حمزہؓ جو آنحضرت ﷺ اور حضرت علیؓ دونوں کے چچا تھے۔مسلمان ہوگئے۔وہ بڑے بہادر شخص تھے اور ان کی بہادری کی دھاک سارے عرب میں بیٹھی ہوئی تھی۔اس لیے ان کے اسلام قبول کرنے سے مسلمانوں کے دل مضبوط ہوگئے۔ہاشم کے گھرانے میں سے زیادہ لوگ تو مسلمان نہیں ہوئے تھے پھر بھی یہ لوگ مسلمانوں کی طرفداری کرتے رہتے تھے اور جہاں تک بن پڑتا تھا قریش کے ظلم سے انہیں بچاتے تھے۔اس معاملہ میں ابوطالب سب سے آگے تھے۔جب قریش کا ظلم بہت بڑھ گیا تو کچھ مسلمان ہجرت کر کے حبش چلے گئے۔حضرت علیؓ کے بھائی حضرت جعفر طیارؓ ہجرت کرنے والوں کے اس قافلہ کے سردار تھے۔

قریش نے جب دیکھا کہ ابوطالب آنحضرت ﷺ کا ساتھ دے رہے ہیں اور ان

کے ساتھ ہاشم کے گھرانے کے سب لوگ آپ کی طرفداری کر رہے ہیں تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ جب تک ابوطالب آنحضرت ﷺ کی مدد سے باز نہیں آتے بنو ہاشم سے کوئی واسطہ نہ رکھا جائے اور ان سے میل جول لین دین بالکل بند کر دیا جائے۔سارے بنی ہاشم نے ایک گھاٹی میں پناہ لی جو ابوطالب کی گھاٹی کہلاتی ہے۔قریش نے اس بات کا بڑا انتظام کر رکھا تھا کہ اس گھاٹی میں اناج کا دانہ تک نہ پہنچنے پائے۔آنحضرت ﷺ حضرت علیؓ، حضرت حمزہؓ، ابوطالب اور ہاشم کے گھرانے کے دوسرے لوگوں نے اس گھاٹی میں بڑی مصیبت سے تین برس گزارے۔مسلمان جانوں پر کھیل کر کھانے پینے کی چیزیں پہنچاتے تھے اور کبھی کبھی کئی کئی وقت فاقے کرنے پڑتے تھے اور ہاشم کے خاندان کے بچے درختوں کے پتے کھا کھا کے گزارہ کرتے تھے۔آخر کچھ لوگوں نے بیچ میں پڑ کے قریش کو اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور کر دیا اور بنو ہاشم گھاٹی سے نکل کر اپنے اپنے گھروں میں آبسے۔اس واقعہ کو تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ ابوطالب نے وفات پائی۔دراصل انہوں نے ان تین برسوں میں ایسے ایسے صدمے اٹھائے تھے جنہوں نے انہیں بالکل نڈھال کر دیا تھا۔ابھی یہ صدمہ تازہ تھا یعنی ابوطالب کے انتقال کو چوتھا دن ہوا تھا کہ حضرت خدیجہؓ نے بھی دنیا سے رحلت کی۔یہ دونوں واقعات نبوت کے نویں برس پیش آئے۔حضرت علیؓ کی عمر اس وقت انیس برس کی تھی۔

حضرت علیؓ اپنے والد کی وفات کے بعد صرف چار برس مکہ میں رہے۔یہ چار برس سارے مسلمانوں نے بڑی مصیبت میں گزارے۔ابوطالب کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد کوئی روک ٹوک کرنے والا نہیں رہا تھا۔اس لیے کفار بے کھٹکے مسلمانوں کو ستاتے اور انہیں دکھ دینے کے لیے طرح طرح کی ترکیبیں سوچتے رہتے تھے۔ان دنوں مدینہ کی بستی میں جو مکہ سے دو سو میل کے فاصلے پر ہے۔اسلام پھیلنا شروع ہوگیا تھا۔مدینہ کے لوگوں کی آرزو تھی کہ آنحضرت ﷺ اپنے ساتھیوں سمیت ان کے شہر میں آبسیں۔نبوت کا تیرھواں برس تھا اور حضرت علیؓ کی عمر ۲۳ سال کی تھی کہ آنحضرت ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدینہ جانے کا حکم ملا اور حضرت علیؓ کو بھی اپنے باپ دادا کے وطن سے نکلنا پڑا۔

مدینہ میں

مدینہ والوں کی طرف سے اصرار تھا کہ آنحضرت ﷺ مدینہ تشریف لے چلیں۔ آپ خود تو نہیں گئے۔ البتہ صحابہؓ کو مدینہ منورہ جانے کی اجازت دے دی۔ کچھ دنوں میں مکہ مکرمہ مسلمانوں سے خالی ہوگیا اور اس شہر میں رسول خدا ﷺ، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ رہ گئے۔ قریش کو جب معلوم ہوا کہ مدینہ منورہ کے بڑے بڑے سردار مسلمان ہو چکے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی دیکھا کہ سارے مسلمان ایک ایک کرکے مدینہ چلے گئے ہیں تو انہیں بہت غصہ آیا۔ آخر مکہ مکرمہ کے سارے بڑے بوڑھے اور قبیلوں کے سردار ایک جگہ جمع ہوئے اور یہ صلاح ٹھہری کہ ہر قبیلے سے ایک ایک بہادر سپاہی لیا جائے۔ یہ سب رات بھر محمد (ﷺ) کے مکان کو گھیرے رہیں۔ صبح کے وقت وہ نماز پڑھنے نکلیں تو سب تلواریں سونت سونت کر ان پر ٹوٹ پڑیں۔

جس رات ادھر یہ کھچڑی پک رہی تھی۔ اسی رات رسول اللہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدینہ جانے کا حکم ملا۔ آپ ﷺ کے پاس مکہ کے اکثر لوگ اپنی امانتیں رکھ جایا کرتے تھے۔ بہت سی امانتیں پڑی تھیں جن کا ان کے مالکوں تک پہنچانا ضروری تھا۔ آپ ﷺ نے حضرت علیؓ کو بلا کر وہ سب امانتیں ان کے سپرد کیں، پھر انہیں اپنے بچھونے پر سلا کر مدینہ روانہ ہوئے۔ اندھیری رات، سنسان مکان، باہر ہر طرف ننگی تلواریں لیکن حضرت علیؓ کے ماتھے پر بل تک نہ پڑا اور وہ اسی طرح چادر تان کر سو رہے جیسے کوئی خطرہ کی بات ہی نہیں۔

قریش ساری رات ہاتھوں میں تلواریں لئے پہرہ دیتے رہے۔ اتنے میں پو پھٹی۔ مشرق کی طرف سے نور چاروں طرف پھیلا اور مکہ مکرمہ کے آس پاس کی پہاڑیاں اور اونچے اونچے مکان صاف نظر آنے لگے لیکن رسول اللہ ﷺ کا کہیں اتہ پتہ ہی نہ تھا۔ اب تو کافر گھبرائے۔ سب کی رائے یہ ہوئی کہ اب انتظار کرنا بے سود ہے۔ مکان کے اندر گھس پڑو۔ مکان میں قدم رکھا تو آنحضرت ﷺ کے بچھونے پر حضرت علیؓ کو پایا۔ سب جھنجھلائے۔ حضرت علیؓ کو اپنے ساتھ لے جا کر قید کردیا لیکن پھر خود ہی چھوڑ بھی دیا۔

حضرت علیؓ نے لوگوں کی امانتیں ان کے حوالے کیں۔ اس کام سے فارغ ہو چکے تو

مدینہ منورہ چلے۔ رسول خدا ﷺ ان دنوں مدینہ منورہ کے ایک بزرگ حضرت کلثوم بن ہدم کے مکان پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ حضرت علیؓ وہیں آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آنحضرت ﷺ نے انصار اور مہاجرین میں بھائی چارہ کرادیا تھا یعنی ایک مہاجر اور ایک انصاری کو بلا کر انہیں ایک دوسرے کا بھائی بنادیا تھا لیکن آپؐ نے حضرت علیؓ کو کسی انصاری کا بھائی نہیں بنایا بلکہ فرمایا کہ علیؓ اور میں بھائی بھائی ہیں۔

مدینہ منورہ میں آنحضرت ﷺ سات مہینے حضرت ابوایوب انصاریؓ کے ہاں رہے۔ اسی زمانے میں مسجد نبویؐ تعمیر ہوئی۔ حضرت علیؓ بھی مسجد کی تعمیر میں شریک تھے اور اینٹیں اور گارا اٹھا اٹھا کر لاتے تھے۔ مسجد کے ساتھ ہی رسول خدا ﷺ کے رہنے کے لیے حجرے تعمیر ہوئے۔ حضرت علیؓ بھی یہیں اٹھ آئے۔ وہ پانچ برس کی عمر سے رسول خدا ﷺ کے ساتھ تھے۔ مکہ مکرمہ میں اٹھارہ برس آپ ﷺ کی خدمت میں گزارے۔ مدینہ منورہ آئے تو یہاں بھی آپ ﷺ ہی کے پاس رہے۔ یوں کہنا چاہیے کہ ان کی پرورش نبوت کی گود میں ہوئی تھی۔ اس لیے ان کے دل پر اسلام کا نقش بڑا گہرا تھا۔ اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی محبت ان کے دل میں پوری طرح گھر کر گئی تھی۔ وہ قرآن پاک کے نکتے خوب سمجھتے تھے اور اگرچہ ان کی عمر زیادہ نہ تھی پھر بھی کوئی جھگڑا آپڑتا تھا تو ایسا فیصلہ کرتے کہ لوگ دنگ رہ جاتے تھے۔

ان دنوں عرب میں بہت کم لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے لیکن حضرت علیؓ نے بچپن ہی میں لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا۔ آنحضرت ﷺ کی جانب سے جو خط لکھے جاتے تھے۔ وہ انہیں کے قلم سے نکلتے تھے۔ ان کی زبان میں عجب مٹھاس تھی۔ باتیں کرتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں۔ تقریر کرنے کھڑے ہوتے تھے تو ان کی زبان موتی رولے چلی جاتی تھی۔

شہادت

نہروان کی لڑائی میں حضرت علیؓ کا ارادہ تھا کہ شام پر حملہ کیا جائے۔ ایک مرتبہ جمعہ کے خطبہ میں انہوں نے ایسی باتیں کہیں کہ لوگوں کے دل ہل گئے اور ہر طرف سے آوازیں

آ گئیں کہ " امیر المومنین ! ہم لڑنے پر تیار ہیں۔ چنانچہ لڑائی کی تیاریاں بڑے زور سے شروع ہوئیں۔ کچھ فوج کوفہ سے اکٹھی کی گئی اور دوسرے علاقوں میں فوج جمع کرنے کے لیے آدمی بھیجے گئے۔

ادھر تو یہ تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ادھر خارجی جو نہروان کی لڑائی میں شکست کھا چکے تھے۔ اسی فکر میں تھے کہ مسلمانوں سے جو خانہ جنگی ہو رہی ہے اس سے کیونکر نجات ملے؟ حج کے موقع پر بہت سے خارجی مکہ معظمہ میں جمع ہوئے اور بڑی بحثوں کے بعد یہ طے پایا کہ جب تک تین شخص یعنی حضرت علیؓ، امیر معاویہؓ اور عمرو بن العاصؓ دنیا میں موجود ہیں، مسلمانوں میں یونہی تلوار چلتی رہے گی۔ چنانچہ خارجیوں میں سے تین آدمیوں نے ان تینوں کے قتل کا بیڑہ اٹھایا۔ ان میں سے جس شخص نے حضرت علیؓ کے قتل کا ذمہ لیا تھا اس کا نام عبدالرحمٰن ابن ملجم تھا۔ وہ کوفہ پہنچا تو ایک خارجی عورت سے اس کی ملاقات ہوئی۔ یہ عورت بہت خوبصورت تھی اور اس کا خاوند اور بھائی نہروان کی لڑائی میں مارے گئے تھے۔ اس نے ابن ملجم سے کہا۔ تم اگر حضرت علیؓ کو قتل کر ڈالو تو میں تم سے شادی کر لوں گی۔ اس کی باتوں نے ابن ملجم کو اپنے ارادہ میں زیادہ مضبوط کر دیا۔ چنانچہ اس نے ایک ہزار درہم میں ایک تلوار خریدی۔ اسے زہر میں بجھایا۔ چنانچہ حضرت علیؓ صبح سویرے اٹھ کر مسجد میں نماز پڑھنے آئے تو شبیر اور ابن ملجم نے جو گھات لگائے بیٹھے تھے، حملہ کیا۔ شبیر کا وار خالی گیا لیکن ابن ملجم کی تلوار کا وار سر پر پڑا۔ زخم تو زیادہ معلوم نہیں ہوتا تھا لیکن تلوار زہر میں بجھی ہوئی تھی۔ زہر بڑی تیزی سے جسم میں سرایت کر گیا۔ شبیر تو وار کر کے بھاگ کھڑا ہوا اور بچ کے صاف نکل گیا۔ ابن ملجم نے بھی بھاگنا چاہا لیکن پکڑا گیا۔ حضرت علیؓ نے اپنے صاحبزادوں امام حسنؓ اور امام حسینؓ کو بلایا۔ انہیں نصیحتیں کیں۔ اپنے قاتل کے متعلق کہا۔ اسے کھانا کھلاؤ، پانی پلاؤ اور اچھی طرح رکھو۔ اگر میں مر گیا تو اسے قتل کر ڈالنا کیونکہ شریعت کا حکم یہی ہے۔ لیکن اسے ایذا نہ دینا۔ عرب کے پرانے قاعدے کے مطابق اس کے کان اور ناک وغیرہ نہ کاٹنا۔ اسلام نے ان باتوں کی ممانعت کر دی ہے اور اگر میں بچ گیا تو یہ میری مرضی ہے کہ چاہے اس سے اپنا بدلہ لوں، چاہے اسے بخش دوں۔ لوگوں نے پوچھا۔ ہم آپ کے بعد امام حسنؓ کو خلیفہ بنائیں۔ جواب

دیا، میں نہ تمہیں اس کا حکم دیتا ہوں نہ اس سے روکتا ہوں۔ یہ تمہارا اپنا معاملہ ہے جس طرح چاہو اسے طے کر لو۔

حضرت علیؓ پونے پانچ برس خلافت کر کے رمضان ۴۰ھ کی سترھویں تاریخ کو شہید ہوئے۔ شہادت کے وقت ان کی عمر ۶۳ برس کی تھی۔ ابن ملجم نے صبح کے وقت ان پر وار کیا اور وہ رات تک زندہ رہے۔ حضرت امام حسنؓ نے جنازہ کی نماز پڑھائی اور کوفہ کے ایک قبرستان میں دفن کر دیا۔ باقی دو خارجی جو امیر معاویہؓ اور عمروؓ بن العاص کو قتل کرنے کے ارادہ سے نکلے تھے ناکام ہوئے۔ امیر معاویہؓ کے معمولی سا زخم آیا جو چند دنوں میں اچھا ہو گیا اور عمرو بن العاصؓ کے دھوکے میں ایک اور شخص مارا گیا۔

حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ کی زندگی میں دوسری شادی نہیں کی۔ ان کی وفات کے بعد کئی شادیاں کیں جن سے سترہ صاحبزادیاں اور چودہ صاحبزادے پیدا ہوئے۔ ان میں حسنؓ، حسینؓ، محمد بن حنیفہؒ اور محمد عباسؒ مشہور ہیں۔

حضرت علیؓ کی خلافت کا زمانہ

حضرت علیؓ چار سال نو مہینے خلیفہ رہے۔ اگرچہ یہ زمانہ شورشوں اور آپس کے لڑائی جھگڑوں میں گزر گیا پھر بھی ان کی حکومت بڑے عدل و انصاف کی حکومت تھی۔ صوبوں کے حاکم اور بڑے بڑے عہدہ دار تو ان سے خوش نہیں تھے کیونکہ وہ ان پر بڑی سختی کرتے تھے اور انہیں بیت المال سے ایک پائی بھی نہیں لینے دیتے تھے۔ ہاں عام لوگ ان سے بہت خوش تھے۔ بیت المال میں جو کچھ آتا تھا وہ اسے محتاجوں اور غریبوں میں بانٹ دیتے تھے۔ اپنے رشتہ داروں کو ان کے حصہ سے زیادہ کچھ نہیں دیتے تھے۔ سارا مال لوگوں میں تقسیم ہو چکتا تھا تو وہ بہت خوش ہوتے تھے۔ بیت المال میں جھاڑو دلواتے۔ پانی چھڑکواتے پھر نماز پڑھتے اور خدا کا شکر ادا کرتے کہ یہ بوجھ سر سے اترا۔

خلافت کے زمانہ میں بھی ان کا یہ حال تھا کہ موٹا سا تہبند باندھے ہوئے ہیں۔ اس پر ایک موٹی سی رسی لپٹی ہے۔ یا دو موٹی موٹی چادریں ہیں۔ ایک اوڑھ لی ہے۔ دوسری کا

تہہ بند بنالیا ہے۔ اس حالت میں درہ لئے کوفہ کے بازاروں میں یہ دیکھتے پھر رہے ہیں کہ کہیں دکان دار ناپ تول میں بددیانتی تو نہیں کرتے۔ ایک دن بازار میں کھڑے تھے۔ دیکھا ایک لونڈی رو رہی ہے۔ پوچھا تم کیوں رو رہی ہو۔ وہ کہنے لگی، میرے آقا نے ایک درہم کی کھجوریں منگوائی تھیں۔ وہ اسے پسند نہیں آئیں اس لیے پھیر دیں۔ اب دکان دار واپس نہیں لیتا۔ حضرت علیؓ نے دکان دار سے کہا بھائی کھجور بیچنے والے کھجوریں لے لے اور درہم واپس کردے۔ اس نے آپؓ کو دھکا دیا۔ یہ دیکھ کر لوگ جمع ہوگئے اور کہنے لگے کیا تو نہیں جانتا۔ یہ امیر المومنین ہیں۔ دکاندار نے یہ سن کر کھجوریں لے لیں اور درہم واپس کردیا۔ پھر حضرت علیؓ سے کہنے لگا میں چاہتا ہوں آپ مجھ سے خوش ہوجائیں۔ انہوں نے فرمایا مجھے صرف یہی چیز خوش کرسکتی ہے کہ تو لوگوں کو ان کا پورا حق دے دیا کرے۔

ان کے کپڑوں میں کئی کئی پیوند ہوتے تھے۔ کپڑا پھٹ جاتا تھا تو خود اسے سی لیتے تھے۔ جوتی پھٹ جاتی تو اس کی مرمت بھی خود ہی کرتے تھے۔ جاڑے کے زمانے میں بھی ان کا یہ حال ہوتا تھا کہ ایک ہی چادر اوڑھے ہوئے ہیں اور سردی سے سارا جسم کانپ رہا ہے۔ ایک دفعہ کپڑا خریدنے نکلے۔ آپ کا غلام قنبر ساتھ تھا۔ دو موٹی موٹی چادریں خریدیں پھر قنبر سے کہنے لگے۔ ان میں جو تجھے پسند ہے لے لے۔ ایک اس نے لے لی۔ دوسری حضرت علیؓ نے اوڑھ لی۔ لوگ دیکھتے تھے تو تعجب کرتے تھے کہ معمولی معمولی لوگ بھی خلیفہ سے اچھا کھاتے پیتے اور اچھا پہنتے ہیں۔

حضرت علیؓ کو اتنی مہلت ہی نہیں ملی کہ ملک فتح کرتے۔ پھر بھی سیستان اور کابل کے علاقے میں مسلمانوں نے پیش قدمی کی۔ بمبئی کے ساحل پر کوکن کا علاقہ ہے جو ان دنوں سندھ میں شامل تھا۔ اس پر بھی مسلمانوں نے حملہ کیا۔

انہوں نے امیر معاویہؓ سے لڑائی کے زمانے میں جو فوجی انتظام کیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ کے طور طریقوں کو خوب سمجھتے تھے۔ مثلاً عراق اور شام کی سرحد پر انہوں نے فوجی چوکیاں قائم کیں۔ دریائے فرات پر پُل باندھا۔ ایران میں شورش ہوئی تو وہاں کئی مضبوط قلعے بنوائے۔

حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں جو تنخواہیں مقرر کی تھیں۔ ان میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا تھا کہ جو لوگ بدر کی جنگ میں شریک تھے انہیں سب سے زیادہ تنخواہ ملے جو بعد میں اسلام لائے انہیں اس سے کم لیکن حضرت علیؓ نے یہ فرق مٹا دیا اور سب کو یکساں تنخواہ ملنے لگی۔

حضرت علیؓ بچپن سے رسول خدا ﷺ کی خدمت میں رہے ان سے قرآن پاک پڑھا۔ دین کے نکتے سیکھے۔ آنحضرت ﷺ کی زندگی میں ان کی تلوار نے بڑی بڑی گتھیاں سلجھائیں اور حنین کی لڑائی میں جہاں بڑے بڑے بہادروں کے قدم اکھڑ گئے وہ چٹان کی طرح پاؤں جمائے کھڑے رہے۔ وہ جیسے بہادر تھے ویسے ہی عالم بھی تھے۔ بڑی بڑی الجھی ہوئی گتھیوں کو اتنی آسانی سے سلجھادیتے تھے کہ لوگ حیران رہ جاتے تھے۔ انہوں نے اپنی خلافت کے زمانے میں بہت سے الجھے ہوئے مقدموں کے فیصلے کئے ہیں جنہیں ایک جگہ جمع کردیا جائے تو اچھی خاصی کتاب ہوجائے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کی خلافت کے زمانے میں بھی اکثر باتوں میں ان کے مشوروں پر عمل کیا جاتا تھا اور ان کی رائے کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ اس لئے اگر انہیں اپنی خلافت کے زمانہ میں اطمینان نصیب ہوتا تو ضرور مسلمانوں کی حالت سدھر جاتی اور حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں جو خرابیاں پیدا ہوگئی تھیں۔ وہ دور ہوجاتیں لیکن آپس کے لڑائی جھگڑوں کی وجہ سے انہیں اتنی مہلت ہی نہ ملی اور جب انہوں نے لوگوں کی حالت سدھارنے کی کوشش کی تو صوبوں کے حاکم الٹا ان سے ناراض ہوگئے۔

لوگوں کی یہ حالت دیکھ کر حضرت علیؓ کو بے حد افسوس ہوتا تھا۔ اکثر راتوں کو اٹھ اٹھ کر رویا کرتے تھے۔ جب انہیں معلوم ہوتا کہ فلاں علاقہ کے حاکم نے کسی شخص سے بے انصافی کی ہے تو ان کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈباتے تھے۔ انہیں شان و شوکت کی زندگی سے سخت نفرت تھی اور وہ چاہتے تھے کہ دوسرے لوگ بھی ان کی طرح سیدھی سادی زندگی بسر کریں۔ مال و دولت کی طمع دلوں سے نکل جائے لیکن جن لوگوں کو عیش و آرام کی زندگی بسر کرنے کی چاٹ پڑ گئی تھی وہ کب ان کی بات سنتے تھے۔

لڑائی میں ان کا طریقہ یہ تھا کہ نہتے پر وار نہیں کرتے تھے۔ دشمن بدحواس ہو جاتا یا بھاگ کھڑا ہوتا تو ان کی جان بخش دیتے تھے۔ ایک دفعہ ایک شخص حضرت علیؓ کے مقابلہ پر آیا۔ حضرت علیؓ نے ایسا وار کیا کہ وہ زمین پر گر پڑا اور بدحواسی میں اس کا تہہ بند کھل گیا۔ حضرت علیؓ نے منہ پھیر لیا اور اس طرح اس کی جان بچ گئی۔ ایک اور موقع پر وہ اپنے دشمن کو گرا کے اس کے سینے پر چڑھ بیٹھے۔ اس حالت میں اس نے حضرت علیؓ کے منہ پر تھوک دیا۔ آپ فوراً اس کے سینے سے اٹھ بیٹھے اور اس کی جان بخش دی۔ کسی نے پوچھا۔ آپ نے یہ کیا کیا؟ کہنے لگے میں تو اس سے اللہ تعالیٰ کے لئے لڑ رہا تھا۔ اس کی اس حرکت کے بعد اگر میں اسے قتل کر ڈالتا تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ میں نے اس سے بدلہ لیا ہے۔

شروع شروع میں حضرت علیؓ کی حکومت بڑے وسیع علاقے پر تھی اور امیر معاویہؓ کے قبضہ میں صرف شام اور فلسطین کے علاقے تھے لیکن امیر معاویہؓ نے آہستہ آہستہ بہت بڑے علاقے پر قبضہ کر لیا اور حضرت علیؓ کے قبضہ میں تھوڑا سا علاقہ رہ گیا لیکن اس علاقے کی رعایا سے بہت اچھا سلوک کیا جاتا تھا۔ خاص طور پر ایرانی تو حضرت علیؓ کی انصاف پسندی سے بہت خوش تھے اور اکثر کہا کرتے تھے کہ نوشیرواں کا زمانہ پھر پلٹ آیا ہے۔

اس زمانہ میں عربی زبان کے قاعدے اور اصول بنے۔ ابوالاسود دیلی ایک شخص تھا۔ حضرت علیؓ نے اسے گرائمر کے موٹے موٹے قاعدے بتا دیئے تھے۔ انہیں پر اس نے عربی زبان کی گرائمر کی بنیاد رکھی۔ صوفیوں کے بہت سے سلسلے بھی حضرت علیؓ ہی سے چلے ہیں۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ حسن بصریؒ نے جن تک صوفیوں کے کئی خانوادوں کا سلسلہ جا پہنچتا ہے۔ حضرت علیؓ ہی سے فیض پایا تھا۔

حضرت علیؓ اپنی خلافت کے زمانے میں زیادہ تر کوفہ میں رہے تھے جو عراق کا مشہور شہر ہے اس لیے ان کی وجہ سے فقہ کے بہت سے مسئلے عراق میں پھیل گئے جو آگے چل کے فقہ حنفی کی بنیاد بنے۔ حدیث میں بہت سے بزرگوں نے آپؓ سے فیض حاصل کیا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے حلیہ، نماز اور دعاؤں کے بارے میں بہت سی حدیثیں حضرت علیؓ سے روایتیں کی گئی ہیں۔

خلافت راشدہ کا زمانہ جس کی مدت تیس سال ہے اور جسے رسول اللہ ﷺ کے مبارک زمانہ کے بعد سب سے اچھا زمانہ سمجھا جاتا ہے۔ حضرت علیؓ ہی پر ختم ہو گیا۔ آپؓ کے بعد جو لوگ حاکم ہوئے اگرچہ وہ بھی خلیفہ ہی کہلاتے ہیں لیکن اصل بات یہ ہے کہ حضرت علیؓ کے دور خلافت کے بعد خلافت بادشاہت میں تبدیل ہو گئی۔

حضرت جلال الدین سہروردیؒ

حضرت ابوالقاسم جلال الدین ایران کے ایک شہر تبریز میں پیدا ہوئے۔ آپ کے بچپن کے حالات کا ذکر کتابوں میں نہیں ملتا۔ کہتے ہیں کہ آپ ایک بہت بڑے بادشاہ تھے اور دن رات عیش و عشرت میں بسر کرتے تھے۔

ایک روز آپ کے ساتھ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ آپ کے خاص کمرے کے باہر ہمیشہ ایک دربان پہرا دیتا تھا۔ ایک روز سہ پہر کے وقت آپ دربار جانے لگے تو دربان غائب تھا۔ آپ نے غصے سے اس کو پکارا مگر وہ نہ آیا۔ آپ نے باہر نکل کر چاروں طرف نظر دوڑائی۔ کیا دیکھتے ہیں کہ دربان محل کے ایک گوشے میں عصر کی نماز پڑھ رہا ہے۔ اس نے نماز ختم کرکے دعا مانگی اور جب اٹھا تو حضرت جلال الدین کو سامنے کھڑے پایا۔ فوراً آداب شاہی بجالایا۔ اتنے میں محل کے دوسرے پہرے دار بھی آگئے تھے۔ خوف سے ان کے دل دھڑک رہے تھے۔ مگر اس دربان کے چہرے پر خوف کا نام نشان نہ تھا۔

حضرت جلال الدین نے اس سے پوچھا تم اس محل میں کیوں آئے ہو؟

شاہی خدمت بجالانے دربان نے ادب سے جواب دیا۔

مگر کچھ دیر پہلے تم اپنے فرض کو بھول کر دوسرا کام کر رہے تھے۔ حضرت جلال الدین نے غصے سے کہا کیا تمھیں اسی لیے ملازم رکھا گیا ہے؟ تمھاری بے خبری کا یہ عالم ہے تو تم کس طرح ہماری حفاظت کر سکتے ہو؟''

میں دربار شاہی کا ادنیٰ خدمت گار ہوں دربان نے کہا میں ایک لمحہ بھی اپنے فرائض سے غافل نہیں رہا۔ حضور جس چیز کو میری غفلت سمجھ رہے ہیں وہ میری فرض شناسی ہے۔ میں آپ کی حفاظت سے غافل نہیں رہتا۔ مگر جب اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضری کا وقت آئے گا تو میں دنیا کے کسی بادشاہ کا حکم نہیں سنوں گا۔ آپ کے آنے سے قبل اذان

ہوئی تھی اور مالک حقیقی نے مجھے اپنے دربار میں بلایا تھا۔ میں اس کی نافرمانی نہیں کر سکتا تھا۔ اگر آپ کی نظر میں یہ خطا ہے تو میں ہر سزا کے لیے تیار ہوں۔

حضرت جلال الدین کے چہرے سے غصہ غائب ہو گیا تھا۔ آپ نے فرمایا یقیناً تم فرض شناس خدمت گار ہو۔ تم کو حقیقی اور غیر حقیقی شہنشاہ کا فرق معلوم ہے۔ تم ایک جاگنے والے انسان ہو۔ افسوس صد افسوس کہ میں اب تک سوتا رہا۔

یہ کہہ کر آپ دربار جانے کے بجائے اپنے کمرے میں واپس چلے گئے اور بے چینی سے ٹہلتے رہے۔ صبح کو جیسے ہی اذان کی آواز آئی آپ بے اختیار رو پڑے اور کہا اے شہنشاہوں کے شہنشاہ میری نیند ٹوٹ گئی ہے، میں تیرے حضور آ رہا ہوں۔ ریشمی بستر نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔ اے آقا مجھے اپنے دامن رحمت میں چھپا لے۔ تیرا غلام جلال الدین آ رہا ہے۔

اس کے بعد آپ نے نماز فجر ادا کی پھر بچوں کو نصیحتیں کیں۔ تاج اپنے بیٹے کے سر پر رکھا اور بے شمار مال و دولت لے کر ایک بزرگ کی خانقاہ میں داخل ہوئے تمام زر و جواہر اس کے قدموں میں ڈال دیا۔ اور کہا یہ سب حضور کی نظر ہے۔ اسے قبول فرمائیے۔ یہ بزرگ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی تھے۔ انھوں نے تمام مال و دولت ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیا اور آپ کو اپنے مریدوں میں شامل کر لیا۔ پھر حضرت جلال الدین سے فرمایا کہ ابھی تم میں شہنشاہ ہیبت کی بو باقی ہے اس لیے کچھ دن درویشوں کی خدمت کرو۔ آپ چار سال تک درویشوں کے وضو کے لیے کنویں سے پانی بھر بھر کے لاتے رہے۔ مگر چہرے پر کبھی ناگواری کے آثار پیدا نہیں ہوئے۔ آپ کی خدمت گزاری کا یہ عالم تھا کہ سفر میں ہمیشہ چولھا سر پر اٹھائے پھرتے تھے کہ جیسے ہی پیرو مرشد کھانا طلب کریں فوراً تیار کیا جائے۔

آپ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کی صحبت میں سات سال رہے اور بہت فیض حاصل کیا۔ پھر آپ کو دہلی جانے کا حکم ہوا۔ آپ حضرت ذکریا ملتانیؒ کے ساتھ ہندوستان روانہ ہوئے۔ دہلی پہنچتے ہی سارے شہر میں آپ کے روحانی کمالات کا

چرچا ہونے لگا۔ حضرت قطب الدین بختیار کاکی جیسے بزرگ نے بھی اپنی خانقاہ سے باہر نکل کر آپ کا استقبال کیا۔ مگر دہلی کا شیخ الاسلام قاضی نجم الدین صغریٰ آپ سے خار کھاتا تھا۔ وہ آپ کے خلاف سازشیں کرنے لگا۔ اس پر آپ بدایوں تشریف لے گئے۔ بدایوں کے حاکم قاضی کمال الدین کو آپ سے بے حد عقیدت تھی۔ آپ نے بدایوں میں ایک مسجد بنوائی جو آج بھی موجود ہے۔

پھر آپ اودھ تشریف لے گئے۔ اس کے بعد بہار کی سیاحت کرتے ہوئے بنگال پہنچے اور ہندو میں سکونت اختیار کی۔ ہنڈو ضلع مالوہ میں لکھنوتی کے قریب ایک قدیم اور مشہور قصبہ تھا۔ یہاں ہندوؤں کے بہت سے مندر تھے ہر وقت ناقوسوں کی صدا گونجتی رہتی تھی۔ مشہور سیاح ابن بطوطہ نے اسی قصبے میں آپ سے ملاقات کی تھی۔ اس نے لکھا ہے کہ ہنڈو میں بے شمار مندر ہیں اور یہاں عام طور پر کالی دیوی کی پوجا ہوتی ہے۔ لیکن حضرت جلال الدین جس شخص کی طرف نظر ڈالتے ہیں وہ کلمہ پڑھنے لگتا ہے۔ اس طرح بہت سے ہندو اسلام قبول کر چکے ہیں تمام بنگال میں آپ کی کرامات کی دھوم مچی ہوئی ہے۔

ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ جب میں حضرت جلال الدین سے ملا تو اس وقت آپ بہت خوب صورت چغہ پہنے ہوئے تھے۔ اس کو دیکھ کر میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کاش! یہ چغہ مجھے مل جائے۔'' حضرتؒ نے بھانپ لیا اور فرمایا ''یہ لباس پہننا چاہتا ہے؟'' پہن لے مگر یاد رکھ یہ تیرے پاس نہیں رہے گا۔ ایک کافر بادشاہ تجھ سے چھین کر میرے بھائی کو دے دے گا۔'' یہ سن کر میں نے پکا ارادہ کر لیا کہ یہ لباس پہن کر کسی بادشاہ کے پاس نہیں جاؤں گا۔ اسی طرح کوئی اسے چھین نہیں سکے گا۔ آخر میں حضرت سے رخصت ہو کر چین پہنچا۔ وہاں کے بادشاہ نے میرے کپڑوں کی تلاشی لی اور وہ چغہ مجھ سے چھین لیا۔ میں نے بہت منت سماجت کی مگر وہ راضی نہ ہوا۔ اس واقعے کا میرے دل پر گہرا صدمہ تھا۔ میں سارا چین گھومتا رہا۔ آخر ایک دن ایک شہر میں ایک درویش نظر آیا۔ وہ حضرت جلال الدین کا وہی چغہ پہنے ہوئے تھا۔ جب میں نے ان سے نام پوچھا تو انھوں

نے شیخ برہان الدین بتایا۔ اس طرح حضرت کی پیشن گوئی صحیح ثابت ہوئی۔

حضرت جلال الدین آخر وقت تک بنگال میں رہے اور لاکھوں لوگوں کو مسلمان کیا۔ آخر ۶۴۲ھ میں روحانیت کا یہ آفتاب غروب ہوگیا۔

آپ کی وصیت کے مطابق آپ کو دیو محل کے ایک بت خانے میں دفن کیا گیا۔

حضرت غازی شیخ جلال الدین مجرد سہروردی سلہٹی

شیخ المشائخ حضرت مخدوم غازی شیخ جلال الدین مجرد سہروردی یمنی سلہٹی اُن جید اولیاء اللہ اور مجاہدین میں سے ایک ہیں جو برصغیر پاک و ہند میں اسلام کی تبلیغ کے لئے تشریف لائے تھے۔ آپ حضرت شاہ جلال الدین مجرد کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ ترک نسل سے تھے۔ اور ۱۲۷۱ء میں ترکی میں پیدا ہوئے آپ کے آباواجداد یمن سے ترکی ہجرت کر گئے تھے۔ آپ کے والد بزرگوار حضرت محمد بن ابراہیم ایک عظیم شیخ تھے اور یمن کے ایک مشہور قریش خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ نے ایک جہاد میں جام شہادت نوش کیا تھا۔ آپ کی والدہ ماجدہ بھی ایک سید خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ بچپن ہی میں والدین کا سایہ آپ کے سر سے اٹھ گیا تھا۔ آپ کے ماموں حضرت سید احمد کبیر سہروردی نے مکہ معظمہ میں آپ کی پرورش کی۔ یہیں آپ نے اپنی دینی تعلیم مکمل کی اور اپنے ماموں کے مریدین میں شامل ہو گئے۔ تعلیم و تربیت کی تکمیل کے بعد حضرت سید احمد کبیر سہروردی نے آپ کو اسلام کی تبلیغ کی خاطر ساری دنیا کی خاک چھاننے کی ہدایت کی۔ رخصت کرتے ہوئے ایک مٹھی بھر مٹی آپ کو دے کر نصیحت کی جس جگہ کی خاک کا رنگ، مزہ اور خوشبو اس مٹھی بھر خاک سے مل جائے اسی کو اپنا مستقل مسکن بنا لیں۔

آپ اپنے ایک درجن مریدوں کے ہمراہ مکہ معظمہ سے روانہ ہو کر یمن پہنچے۔ ایک مرید کے ذمے یہ فرض تھا کہ وہ ہر جگہ کی خاک کا اس مٹھی بھر خاک سے موازنہ کرتا

رہے۔ جب حاکم یمن کو آپ کی روحانی شہرت کا علم ہوا تو اس نے آپ کو ملاقات کی دعوت دی اور اس نے آپ کے روحانی مقام کا امتحان لینا چاہا۔ اس غرض سے اس نے شربت میں زہر ملا کر آپ کو پیش کیا۔ حضرت جلال کو اس کے ارادے کا فوراً علم ہو گیا۔ آپ نے بغیر کسی تامل کے زہر ملا شربت یہ کہہ کر نوش فرما لیا کہ جو جس طرح سوچتا ہے، اسی طرح پاتا ہے۔ آپ کو تو کچھ نہ ہوا مگر حاکم یمن مر گیا۔ یہ دیکھ کر اس کے ولیعہد نے بادشاہ بننے کی بجائے تخت و تاج کو ٹھکرا کر درویشی اختیار کر لی اور تمام عمر ایک سادہ انسان کی زندگی بسر کی۔

صحرائے عرب کا پیدل سفر کر کے آپ اپنے مجاہدین کے ہمراہ ایران اور افغانستان کے راستے دہلی پہنچے۔ آپ نے دہلی میں حضرت نظام الدین اولیاء کے ساتھ قیام فرمایا۔ وہاں سے آپ نے بہار ہوتے ہوئے۔ بنگال کے قصبے سات گاؤں کی راہ لی۔ روانگی کے وقت حضرت نظام الدین اولیاء نے آپ کو دو کالے کبوتروں کے جوڑے محبت و خلوص کی نشانی کے طور پر تحفتاً دیئے۔ اس وقت سات گاؤں پر ایک مسلمان حکمران تھا۔

اسی دور میں سلہٹ میں ایک ہندو حاکم کور گوندا کے نام سے حکمرانی کرتا تھا۔ سلہٹ میں ایک مسلمان برہان الدین نامی نے اپنے بچے کی پیدائش پر ایک گائے کی قربانی دی۔ چیلوں نے گائے کے گوشت کے کچھ ٹکڑے ہندو حاکم کے مندر کے احاطے میں گرا دیئے۔ جب اس کو گائے کی قربانی کا علم ہوا تو اس نے برہان الدین کے لڑکے کو قتل کروا دیا اور برہان الدین کا دایاں ہاتھ بھی کٹوا دیا۔ برہان الدین نے غور پہنچ کر سلطان شمس الدین فیروز شاہ سے فریاد کی۔ سلطان نے اپنے بھانجے سکندر غازی کی سرکردگی میں ایک لشکر سلہٹ روانہ کیا تا کہ برہان الدین پر ظلم و ستم کا بدلہ لیا جا سکے۔ دریائے برہما پترا کے کنارے حق و باطل کی جنگ ہوئی۔ سکندر غازی موسمی اور دیگر وجوہات کی بناء پر ہندو حاکم پر غلبہ نہ پا سکا۔ سلطان شمس الدین فیروز شاہ نے اللہ سے امداد کی دعا کی اسی دوران اس کو حضرت جلال کی روحانی مرتبہ کا علم ہوا اور اس کی ہدایت پر اس کے بھانجے نے آپ سے

امداد کی درخواست کی۔ اس وقت حضرت جلال کے ساتھ ۳۱۱ مریدین تھے اور وہ سب آپ کے ساتھ سلطان شمس الدین کی فوجوں سے مل کر جہاد میں شریک ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے ہندو حکمران کو شکست دی۔ حضرت جلال نے حکم دیا کہ فوراً اذان دی جائے۔ نماز شکرانہ ادا کرنے کے بعد آپ سلہٹ شہر میں داخل ہو گئے۔ مجاہدین نے سب سے پہلے چاند ستاروں والا سبز ہلالی پرچم ہندو کمانڈر انچیف کے قلعے پر لہرا دیا۔

اسی دوران جب حضرت جلال الدین نے سلہٹ کی مٹی کا اپنے پیرومرشد کی دی ہوئی مٹھی بھر مٹی سے موازنہ کیا تو اس کو ہو بہو ویسا ہی پایا۔ آپ نے اپنے پیرومرشد کے حکم کے عین مطابق سلہٹ میں سکونت اختیار کر لی اور وہیں تبلیغ اسلام کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ آپ نے اسی مقام پر بیس ذی قعدہ ۷۴۰ھ بمطابق ۱۸ مئی ۱۳۴۰ء کو وصال فرمایا۔ اس وقت آپ کی عمر ۶۹ سال تھی۔ آج بھی آپ کے مزار مبارک پر لوگ ہزاروں کی تعداد میں شریک ہوتے اور اللہ کے فضل و کرم سے اپنی مرادیں پاتے ہیں۔

حضرت پیر سید مہر علی شاہ جیلانیؒ

حضرت خواجہ پیر سید مہر علی شاہ کے بزرگوں میں سب سے پہلے حضرت شاہ قیس قادری جو حضرت غوث الاعظم کے فرزند جانشین حضرت شاہ عبدالرزاق جیلانیؒ کی نسل سے تھے۔ بغداد سے ہندوستان تشریف لائے اور ساڈھورہ (مشرقی پنجاب) میں سکونت اختیار کی۔ آپ کی تشریف آوری کی خبر سن کر مشہور بزرگ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی آپ کے استقبال کے لیے گنگوہ شریف سے ایران کی سرحد تک تشریف لے گئے تھے۔ اس وقت حضرت گنگوہیؒ کی عمر اسی سے زیادہ تھی۔ حضرت شاہ قیس قادریؒ نے ساڈھورہ میں قیام کیا اور وہیں آپ کا مزار مبارک ہے۔ ان کے وصال کے بعد ان کے دو صاحبزادوں نے گولڑہ شریف (ضلع راولپنڈی) میں سکونت اختیار کی اور یہ چھوٹا سا مقام تبلیغ دین اور اسلامی تعلیم و تربیت کا ایک اہم مرکز بن گیا۔

حضرت مہر علی شاہ کے والد حضرت سید نظیر الدین شاہ گیلانی بھی بہت بڑے ولی تھے۔ وہ راتوں کو گولڑہ کے قلعوں کے آس پاس نعرے لگاتے پھرتے تھے۔ راستے میں چلتے وقت ان کے آگے کوئی بسم اللہ بسم اللہ کی صدائیں لگاتا تھا۔ لوگ ان کے بولنے کے منتظر رہتے تھے۔ وہ جو کہتے تھے ہو جاتا تھا۔

حضرت مہر علی شاہ کی پیدائش کے بارے میں آپ کے خاندان کو پہلے سے بشارتیں مل چکی تھیں۔ پیدائش سے چند روز پہلے ایک مجذوب نے خانقاہ کے باہر ڈیرا ڈال دیا تھا۔ خانقاہ کے خادم اسے کھانا پہنچاتے تو وہ کھانے سے انکار کر دیتا اور کہتا ''ظالمو، میں تو آنے والے کو سلام کرنے آیا ہوں، میں نے اتنا لمبا سفر تمہارا کھانا کھانے کے لیے نہیں کیا ہے۔ جب (۱۸۵۹ء) میں حضرت سید مہر علی شاہ پیدا ہوئے تو مجذوب بے تاب

ہو کر حرم سرا کی ڈیوڑھی پر پہنچا اور پہلے میں پہلے میں کی دیوانہ وار صدائیں لگانے لگا۔ سجادہ نشین سید فضل نے لوگوں سے کہا سچ ہے، پہلا حق اس کا ہے بچے کی زیارت پہلے اسے کرائی جائے۔ چنانچہ بچے کو باہر لایا گیا۔ مجذوب نے عقیدت سے السلام علیکم یا مجدد یا ولی کہہ کر بچے کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور الحمدللہ کہہ کر واپس چلا گیا۔ پھر وہ کبھی نظر نہیں آیا۔

ابتدائی تعلیم کے لیے آپ کو خانقاہ کے مدرسے میں داخل کر دیا گیا۔ اس وقت آپ کی عمر اتنی کم تھی کہ ایک خادم آپ کو گود میں اٹھا کر مدرسے پہنچاتا تھا۔ لیکن حافظے کا یہ عالم تھا کہ قرآن کا سبق دوسرے دن حفظ کر کے بنا دیتے تھے۔ استاد کو اس پر حیرت ہوتی تھی اور وہ کہتے تھے کہ مہر علی تمھارے لیے تو مجھ سے بڑا کوئی استاد چاہیے۔ عربی، فارسی اور صرف ونحو کی تعلیم آپ نے ہزارے کے ایک مولوی غلام محی الدین سے حاصل کی۔ مگر جلد ہی انھوں نے سجادہ نشین سے کہہ دیا کہ انھیں اس خدمت سے معاف کیا جائے۔ کیوں کہ عرش کی جانب اڑتے ہوئے شاہین کو ایک ممولا تعلیم نہیں دے سکتا۔

اس کے بعد حضرت مہر علی شاہ کو مولانا قریشی کی درس گاہ میں داخل کیا گیا جہاں آپ نے ڈھائی سال میں منطق اور نحو کی تعلیم حاصل کی۔ پھر مولوی سلطان محمود کے شاگردوں میں شامل ہو گئے۔ آپ کو گھر سے جو ماہانہ خرچ ملتا تھا وہ نادار طلبہ میں تقسیم کر دیتے اور خود عموماً روزے سے رہتے تھے۔

ایک مرتبہ مولانا سلطان کہیں باہر جانے کے لیے گھوڑے پر سوار ہوئے۔ حضرت شاہ صاحب نے بڑھ کر گھوڑے کی لگام پکڑی اور احترام کے طور پر گھوڑے کے آگے چلنے لگے۔ پاس ہی ایک بزرگ خاتون رہتی تھیں جو حضرت سلطان باہو کی مرید تھیں۔ حضرت کو دیکھ کر انھوں نے کہا ''مولانا سلطان، آج تم اس شان سے سفر کر رہے ہو، لیکن کل جب اس سید زادے کے مرتبے سے آگاہ ہو گے تو اس کے آگے پیچھے پھرو گے۔'' کچھ عرصے بعد لوگوں نے دیکھا کہ مولانا سلطان حضرت مہر علی شاہ کے گھوڑے کے آگے آگے دوڑ رہے ہیں۔ حضرت صاحب سخت شرمندہ تھے، مگر استاد کا حکم ٹال بھی نہ سکتے تھے۔

پندرہ سال کی عمر میں آپ کان پور تشریف لے گئے اور مولانا احمد حسن محدث کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مولانا حج کے سفر کی تیاری کر رہے تھے۔ اس لیے آپ کو تعلیم نہ دے سکے۔ مگر بعد میں تمام عمر پچھتاتے رہے کہ اگر چند سبق پڑھا دیے ہوتے تو ہمیشہ ان کی دعاؤں میں شامل ہوتے۔ کان پور سے آپ علی گڑھ گئے اور مولانا لطف اللہ کے درس میں شامل ہو گئے۔ اس کے بعد آپ نے ہندوستان کا تمام بڑی بڑی درس گاہوں سے سندیں حاصل کیں۔

۱۸۷۶ء میں آپ تعلیم سے فارغ ہوئے تو پیر کامل کی تلاش ہوئی۔ اسی جستجو میں مختلف مقامات کی سیر کی اور آخر کار سیال شریف پہنچے۔ وہاں حضرت خواجہ شاہ سلیمان تونسویؒ کے مرید اور جانشین حضرت مولانا شمس الدین سیالوی کے مریدوں میں شامل ہو گئے۔ جلد ہی پیر کامل نے آپ کو خلافت سے سرفراز فرمایا۔

جب آپ گولڑہ پہنچے تو آپ کی شادی کر دی گئی۔ مگر آپ پر جلد ہی جذب کا عالم طاری ہو گیا۔ نماز ادا کرتے ہوئے۔ وظیفے پڑھتے ہوئے یہاں تک کہ باتیں کرتے ہوئے رونے لگتے۔ اسی حالت میں گھر سے نکل جاتے اور کئی کئی مہینے غائب رہتے۔ گھر والوں کو پتا نہ چلتا کہ آپ کہاں ہیں۔ شروع میں یہ سلسلہ پنجاب کے شہروں تک محدود رہا۔ آپ آگرہ، دہلی اور اجمیر کی درگاہوں پر جانے لگے۔ اجمیر ہی سے کسی غیبی اشارے پر آپ نے حجاز کا سفر اختیار کیا اور فریضہ حج ادا کر کے مدینہ منورہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روضے پر حاضری دی۔ آپ کے فضل و کمال سے متاثر ہو کر بے شمار لوگ آپ کے مرید ہو گئے۔

اس زمانے میں مشہور بزرگ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی حجاز میں رہتے تھے اور حضرت سید مہر علی شاہ صاحب ان کی خدمت میں اکثر حاضر ہوتے رہتے تھے۔ آپ حجاز میں کچھ عرصہ قیام کرنا چاہتے تھے مگر حضرت حاجی امداد اللہ نے آپ کو ہندوستان واپس جانے کے لیے فرمایا اور کہا:

''ہندوستان میں عنقریب ایک فتنہ ظاہر ہونے والا ہے۔ تم اپنے وطن واپس

جاؤ۔ اگر وہاں تم خاموش بھی رہو گے تو تمھاری برکت سے وہ فتنہ بڑھ نہ سکے گا، اور ملک میں سکون رہے گا۔''

آپ حضرت حاجی صاحبؒ کے اصرار پر ہندوستان واپس آگئے اور گولڑہ شریف میں قیام فرمایا۔ جلد ہی یہ مقام تبلیغ اسلام کا بہت بڑا مرکز بن گیا۔ اسی زمانے میں قادیانی فتنے نے سر اٹھایا۔ حضرت پیر مہر علی شاہ صاحبؒ نے مسئلہ ختم نبوت کی تائید اور قادیانی عقیدوں کی تردید میں بہت سی کتابیں اور رسالے لکھے۔ کئی بحثوں میں بھی حصہ لیا اس سلسلے میں آپ کی کتاب سیف چشتیائی بہت مشہور اور مقبول ہوئی۔ ایک دفعہ مرزا غلام احمد قادیانی نے آپ کو بحث و مباحثے کا چیلنج دیا جسے آپ نے خوشی سے منظور کر لیا۔ انجمن اسلامیہ لاہور کے ہاں میں مناظرہ قرار پایا۔ مقررہ وقت پر آپ لاہور پہنچ گئے۔ مگر مرزا غلام احمد قادیانی وہاں نہ پہنچے۔ مذہبی بحث کے سلسلے میں آپ کا رسالہ شمس الہدیٰ بھی بہت مشہور رہا۔

حضرت مہر علی شاہؒ اکثر حالت وجد میں رہتے تھے۔ ایک بار آپ پاک پتن شریف میں وجد طاری ہو گیا۔ قوالی میں حافظ کی ایک غزل گائی جا رہی تھی۔ غزل سنتے سنتے آپ نے یا حق کا نعرہ لگایا۔ مجلس میں کہرام مچ گیا عمارت کے دوسرے کمرے میں جو لوگ موجود تھے وہ بھی اپنی اپنی جگہ تڑپنے لگے۔ دو اصحاب نے آپ کو کمر سے تھام رکھا تھا اور وہ خود بھی روتے ہوئے جا رہے تھے۔ یک شخص چیختا چلاتا کبھی ایک طرف جاتا، کبھی دوسری طرف۔ پھر وجد کی حالت پورے محلے میں پہنچ گئی۔ جو بھی شور سن کر قوالی کا رخ کرتا رونے لگتا۔ پاک پتن شریف کے سجادہ نشین اپنے کمرے سے نکل آئے اور وہاں پہنچ کر وہ بھی وجد کرنے لگے۔ وہ کہتے تھے کہ کوئی قطب وجد میں آئے تو ہر شئے پر وجد طاری ہو جاتا ہے۔

حضرت پیر مہر علی شاہ کی کئی کرامتیں مشہور ہیں کہتے ہیں کہ کسی ستار نواز کی بینائی جاتی رہی تھی۔ اسے آپ کو پاس لایا گیا۔ آپ نے اسے ہدایت کی کہ آج رات ستار پر کونیسا راگ بجا کر سنانا۔ ستار بجانے والے نے ایسا ہی کیا۔ آپ برابر کے کمرے میں

کواڑ بند کر کے راگ سن رہے تھے۔ راگ جب عروج پر پہنچا تو اچانک ایسا محسوس ہوا کہ کوئی چیز نیچے آگری ہو ساتھ ہی ستار نواز کی آنکھیں روشن ہو گئیں۔ اس کے ہاتھوں میں خوشی سے رعشہ آگیا۔ اس نے اپنے ساتھی سے کہا مجھے دکھائی دے رہا ہے۔ اس کے ساتھی نے کہا ساز بے سرا نہ ہو پھر اس نے حضرت کے حجرے میں ایک جھری سے جھانک کر دیکھا تو آپ سجدے میں گرے ہوئے تھے۔ سجدے ہی میں آپ نے کہا بھاگ جاؤ، بھاگ جاؤ اپنی آنکھیں لے جاؤ میری آنکھوں کے لیے دعا کرو کہ درست رہیں۔''

ایک مرتبہ گولڑے سے ایک برات موضع ڈھیری شاہاں گئی۔ رواج کے مطابق وہاں نیزے بازی کا مقابلہ ہوا۔ لڑکی والوں نے یہ شرط رکھی کہ جب تک گولڑے کا کوئی شہسوار میخ اُکھاڑ کے میدان کے باہر نہیں پھینکے گا۔ اس وقت تک نکاح نہیں ہوگا۔ اس شرط کی وجہ سے تین دن تک نیزہ بازی ہوتی رہی۔ مگر گولڑے کا کوئی سوار میخ اکھاڑ کے باہر نہ پھینک سکا۔ دلہن والے ہر سوار کی ناکامی پر قہقہے لگاتے تھے۔ آخر لوگوں نے حضرت مہر علی شاہ سے آکر درخواست کی کہ بستی کی لاج رکھ لیجیے۔ حضرت گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں پہنچے پہلے بڑے غور سے میخ کا جائزہ لیا۔ پھر نیزہ ہاتھ میں لے کر گھوڑا دوڑایا اور میخ اکھاڑ کر میدان سے دور پھینک دی۔ لوگ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ میخ کے ساتھ آٹا پینے کی چکی کا ایک پاٹ بھی باہر آگرا ہے۔ دراصل میخ پاٹ کے سوراخ میں پھنسائی گئی تھی۔

حضرت کا اکثر وقت ذکر خدا میں صرف ہوتا تھا۔ فجر کی سنتیں پڑھ کر حجرے سے مسجد میں آتے اور نماز کے بعد دس بجے تک وظیفے میں مشغول رہتے۔ اس دوران میں کسی کو آپ کے پاس آنے کی اجازت نہ تھی کیوں کہ ایسے وقت میں قریب جانے والوں کے ہوش گم ہو جاتے تھے۔ ساڑھے دس بجے آپ دیوان خانے میں آتے تو پھر ہر شخص کو آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت ہوتی نصیحت و ہدایت کا سلسلہ بھی جاری رہتا۔ لوگوں سے گفتگو بھی ہو جاتی۔ نماز مغرب اور عشا خانقاہ سے باہر کسی دوسری مسجد میں ادا فرماتے۔

آپ کم کھاتے، کم بولتے اور کم سوتے تھے۔ کڑی عبادت کی وجہ سے آرام اور

نیند سے بے نیاز ہو چکے تھے۔ غالباً اسی وجہ سے آخری عمر میں آپ کے معدے نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اس کے باوجود اکہتر برس کی عمر تک صحت اچھی رہی۔ جیسے جیسے عمر بڑھتی رہی، عبادتیں طویل سے طویل تر ہوتی گئیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد آہ بھر کر سر اٹھا لیتے۔ چہرہ کبھی زرد، کبھی سبز اور کبھی سرخی مائل ہو جاتا۔ پھر بھی اپنے معمولات میں فرق نہیں آنے دیتے تھے۔ بعض لوگ آپ کی یہ کیفیت دیکھ کر رونے لگتے۔ آپ سر اٹھا کر لوگوں کے فکر مند چہرے دیکھتے تو مسکرا کے انھیں تسلی دیتے۔

آخر آپ اس منزل پر پہنچ گئے کہ آپ کو اپنا ہوش نہ رہا۔ کسی سے واسطہ نہ رہا۔ صرف نماز کے وقت بے چین ہو جاتے اور اشاروں میں نماز ادا کرتے۔ اسی زمانے میں ایک روز آپ کی بڑی صاحب زادی عیادت کو آئیں۔ آپ نے ان سے پوچھا تم کون ہو۔ انہوں نے اپنے بھائی کا نام لے کر کہا۔ ''میں غلام محی الدین کی بہن ہوں۔'' انہوں نے پھر پوچھا کون غلام محی الدین؟ لڑکی نے کہا۔ پیر مہر منیر کے بیٹے اور جانشین حضرت نے کہا یہاں کوئی مہر منیر نہیں ہے۔ کوئی غلام محی الدین نہیں ہے۔

۳۰ صفر ۱۳۵٦ھ بروز بدھ (۱۲ مئی ۱۹۳۷ء) عصر کے وقت آپ نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا کہ سہارا دو آپ کو سہارا دے کر اٹھایا گیا۔ آپ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ پھر آپ نے دروازے کی طرف دیکھ کر احترام سے گردن جھکا دی، جیسے کسی کا استقبال کر رہے ہوں۔ فضا میں قرآن خوانی کی آواز اُبھری۔ حاجی خدا بخش ٹوانہ اس وقت آپ کے پاؤں دبا رہے تھے۔ انھیں ایسا محسوس ہوا جیسے رحمت کے فرشتے اور اولیاء اللہ کی روحیں موجود ہوں۔ تھوڑی دیر بعد حضرت کے کہنے پر آپ کو پھر لٹا دیا گیا۔ آپ کے چہرے پر سکون تھا اور ہونٹوں پر تبسم۔ اچانک آپ نے آہستہ سے اللہ کہا اور آپ کا پورا جسم روشنی میں نہا گیا۔ مولانا غلام محمد سرہانے کھڑے تھے۔ انھوں نے جھک کر آپ کی پیشانی کو بوسہ دیا اور پھر رونے لگے۔

حضرت کا مزار گولڑہ شریف میں ہے۔ یہ مقام راولپنڈی سے گیارہ بارہ میل کے فاصلے پر ہے۔ سینکڑوں لوگ روزانہ آپ کے مزار پر فاتحہ خوانی کے لیے آتے ہیں۔ خاص کر شب جمعہ اور نماز جمعہ میں بہت ہجوم ہوتا ہے۔ عرس شریف اور گیارہویں شریف

کے موقع پر زائرین کی تعداد لاکھوں تک پہنچ جاتی ہے اور ان سب کے قیام و طعام کا انتظام بہت وسیع پیمانے پر ہوتا ہے۔ آپ کے مریدوں کی تعداد کئی لاکھ کے قریب ہے۔

حضرتؒ کا مزار مبارک پہاڑوں کی اوٹ میں ہے اور ہرے بھرے درختوں کے جھرمٹ میں خاص کر صبح کے وقت سنگ مرمر کے گنبد کا نظارہ بہت دل کش ہوتا ہے۔ مزار کے ساتھ ایک خوب صورت مسجد ہے، جس کا حوض شفاف پانی سے ہر وقت لبریز رہتا ہے۔ مسجد کے پہلو میں آپ کا کتبہ خانہ ہے، جس کا شمار پاکستان کے بہترین کتب خانوں میں ہوتا ہے۔ خانقاہ میں قرآن مجید اور دینی تعلیم کا انتظام ہے۔ بے شمار طلبہ علم دین حاصل کرنے کے لیے یہاں آتے ہیں۔ ان کے قیام و طعام کے تمام اخراجات خانقاہ شریف کے ذمے ہیں۔

حضرت سید محمد گیسودراز

آپ ۷۲۱ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کا اسم گرامی سید محمد اور کنیت ابوالفتح ہے۔ آپ کے والد گرامی کا نام سید یوسف حسینی عرف سید راجا اور دادا کا نام سید علی تھا۔ آپ حسینی سادات کے مشہور خاندان سے تعلق رکھتے تھے، جو ہرات سے آکر دہلی میں مقیم ہو گیا تھا۔

حضرت سید محمد، گیسودراز کے نام سے بہت مشہور رہوئے۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ایک بار آپ اپنے پیرومرشد حضرت شیخ نصیرالدین چراغ دہلوی کی پالکی کو مریدوں کے ساتھ مل کر اٹھا رہے تھے کہ بال بڑے بڑے ہونے کی بنا پر پالکی کے پایہ سے الجھ گئے۔ آپ پالکی کو کندھے پر رکھ کر دور تک نکل گئے۔ اس وجہ سے آپ کو بہت تکلیف ہوتی رہی لیکن اپنے مرشد کی محبت میں اس کو برداشت کرتے رہے اور عقیدت کی بنا پر بالوں کو پالکی کے پایہ سے نہ نکال سکے۔ جب پیرومرشد کو اس کی خبر ہوئی تو وہ ان کی محبت سے بہت خوش ہوئے اور آپ اسی وقت سے گیسودراز کے لقب سے یاد کئے جانے لگے۔

چار سال کی عمر میں حضرت کے والد دہلی سے دیوگیر منتقل ہو گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ آپ کے ماموں ملک الامراء سید ابراہیم مستوفی دولت آباد کے صوبہ دار تھے۔ آٹھ سال کی عمر سے دینی تعلیم میں حد درجہ دلچسپی لینے لگے۔ ہمیشہ باوضو رہتے اور پابندی سے نماز ادا کرنے لگے۔ دس سال کی عمر تھی کہ والد کا سایہ ۷۳۱ھ میں ان کے سر سے اٹھ گیا۔ اور وہ دولت آباد میں سپرد خاک ہوئے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے نانا سے حاصل کی۔ پھر دوسرے استادوں سے مزید تعلیم پائی۔ آپ کو بچپن ہی سے حضرت نظام الدین اولیا اور حضرت نصیرالدین چراغ دہلوی سے عقیدت پیدا ہو گئی۔ والد ماجد کے

انتقال کے بعد آپ کی والدہ محترمہ نے دولت آباد کو خیرآباد کہہ دیا اور دہلی میں مقیم ہو گئیں اور اس طرح حضرت گیسودراز کو حضرت چراغ دہلی سے نیاز حاصل کرنے کا موقع نصیب ہوا۔

آپ نے ۱۶ رجب ۷۳۶ھ کو حضرت چراغ دہلوی کی مریدی اختیار کی اور اس کے بعد سے آپ کو عبادت سے ایک نیا لطف آنے لگا۔ آپ کی محبت اور عبادت سے پیرومرشد بہت خوش تھے۔ ایک مرتبہ حضرت گیسودراز شدید بیمار ہوئے تو حضرت چراغ دہلوی نے ان کے لئے طبیب اور دوا کا انتظام کیا اور روزانہ ایک آدمی آپ کی خیریت دریافت کرنے کیلئے باقاعدگی سے بھیجتے رہے۔ جب آپ شفایاب ہوئے تو حضرت چراغ دہلوی بہت خوش ہوئے اور اپنا کمبل حضرت کو عنایت فرمایا۔

حضرت چراغ دہلی کی وفات پر حضرت گیسودراز نے انہیں غسل دیا اور جس پلنگ پر غسل دیا تھا اس کی ڈوریاں پلنگ سے جدا کر کے اپنی گردن میں ڈال لیں کہ یہی میرا لباس ہے۔ مرشد کی وفات کے بعد آپ ان کے جانشین مقرر ہوئے اور چالیس برس تک دہلی میں لوگوں کو ہدایت فرمائی۔

دہلی سے رخصت ہو کر آپ دکن کی طرف روانہ ہوئے۔ جہاں سے بھی گزرے لوگوں نے پرجوش استقبال کیا اور ہزاروں کی تعداد میں مرید ہوئے۔ جب گلبرگہ کے قریب پہنچے تو سلطان فیروز نے اپنے خاندان، امراء اور دربار کے علماء اور شاہی لشکر کے ساتھ آپ کا استقبال کیا اور عقیدت و احترام سے آپ کو گلبرگہ لایا گیا۔ دکن کے عوام میں آپ بے حد مقبول ہوئے اور ایک عالم کو اپنے انوار سے منور کیا۔ گلبرگہ شریف میں آپ نے بائیس سال تک لوگوں کی ہدایت کا سلسلہ جاری رکھا۔ ۱۶ ذیعقد ۸۲۵ھ کو گلبرگہ شریف میں آپ کا وصال ہوا۔ آج بھی گلبرگہ شریف میں ہزاروں کی تعداد میں زائرین آپ کے مزار شریف پر حاضر ہوتے ہیں اور فاتحہ پڑھتے ہیں۔

حضرت گیسودراز باوضو رہنے پر بہت زور دیتے تھے۔ نماز پنج گانہ کی سختی سے تاکید فرماتے تھے۔ حلال روزی کھانے کی ہدایت فرماتے تھے۔ شہرت سے نفرت کرتے تھے۔ آج کا

کام کل پر اٹھا رکھنے کے سخت مخالف تھے۔ پاکیزگی اور طہارت کی تلقین فرماتے تھے امیروں کی محفلوں سے دور رہنے کا مشورہ دیتے تھے۔غصہ سے پرہیز کرنے کی تاکید فرماتے تھے تلاوت کلام پاک کی ہدایت فرماتے تھے۔اسی قسم کی ہزاروں ہدایات و مشورے آپ سے منسوب ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر ہم ایک سچے مسلمان بن سکتے ہیں اور دین و دنیا میں خدا کی خوشنودی حاصل کر سکتے ہیں۔

حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ

حضرت خواجہ سلیمان تونسویؒ ۱۷۶۴ء میں تونسہ شریف کے قریب ایک گاؤں گڑ گوجی میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد کا نام زکریا بن عبدالوہاب تھا۔ وہ افغان نسل کے تھے اور گڑ گوجی میں انھیں روہیلے کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔حضرت خواجہ سلیمانؒ ابھی کم سن ہی تھے کہ باپ کا سایہ آپ کے سر سے اٹھ گیا اور آپ کی تربیت کی ذمے داری ماں کے کندھوں پر آ پڑی۔

چار سال کی عمر میں آپ کو قرآن پڑھنے کے لیے ملا یوسف جعفر کے پاس بھیجا گیا۔آپ نے ملا یوسف سے پندرہ سپارے پڑھے۔ایک حاجی صاحب سے پورا قرآن حفظ کیا۔اس کے بعد آپ کو میاں حسن علی کے مکتب میں بھیج دیا گیا۔میاں حسن علی کا مکتب تونسہ میں بڑے بازار کے پاس کی مسجد میں تھا۔ وہ اپنے شاگردوں میں
حفظ کیا۔اس کے بعد آپ کو میاں حسن علی کے پاس کی مسجد میں تھا۔وہ اپنے شاگردوں میں
عاجزی اور انکسار پیدا کرنے کے لیے ان سے بھیک منگواتے تھے۔حضرت سلیمانؒ کی والدہ آپ کو نصیحت کی تھی کہ بیٹا خدا کے سوا کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانا۔ جب آپ کو بھیک مانگنے کے لیے بھیجا گیا تو آپ سخت پریشان ہوئے۔لیکن میاں صاحب اصول کے پکے تھے۔انہوں نے حضرت سلیمانؒ سے بھیک منگوانے کا ارادہ ترک نہ کیا۔ناچار حضرت کو آمادہ ہونا پڑا۔حالانکہ بلند آواز سے بھیک مانگنا تو ایک طرف وہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانا نہیں جانتے تھے۔لہذا اکثر رات گئے بھوکے پیاسے لوٹتے اور مسجد میں سو جاتے۔

میاں صاحب اپنے شاگردوں کو محنت کرنے کی عادت ڈالنے کی غرض سے ان سے مزدوری بھی کراتے تھے۔ مگر حضرت سلیمانؒ سے یہ بھی نہ ہو سکا۔ کیوں کہ نوعمری ہی میں ان سے عجیب وغریب کمالات ظاہر ہونے لگے تھے۔

حضرت خواجہ سلیمانؒ کی ماں آپ سے بے حد محبت کرتی تھیں وہ گڑگوجی ہی میں مقیم تھیں۔ انھوں نے کئی بار کوشش کی کہ بیٹے کے لیے کچھ رقم یا کپڑے وغیرہ تونسہ بھیج میاں حسن علی نے انہیں کہلا بھیجا کہ لڑکے کو شہزادہ بنانا ہے تو اپنے پاس بلا لو۔ اور اگر تعلیم دلانا ہے تو جس طرح میرے مدرسے کے دوسرے غریب طالب علم رہتے ہیں اسی طرح سلیمانؒ کو بھی رہنا پڑے گا۔

ایک دن حضرت خواجہ سلیمانؒ تونسے سے دو کوس کے فاصلے پر موضع سوگر میں ایک کتاب خریدنے گئے۔ ایک اللہ والے بزرگ حضرت نور محمد نارووالا اپنے گھوڑے پر سوار مریدوں کے ساتھ بازار سے گزر رہے تھے۔ کتب فروش کی دکان پر انھیں حضرت سلیمانؒ کا چہرہ دکھائی دیا تو فوراً گھوڑے سے اتر گئے، آگے بڑھ کر حضرت سلیمانؒ کی قدم بوسی کی، بڑھاپے کے باوجود خود پیدل چلے اور حضرت خواجہؒ کو گھوڑے پر سوار کیا اور اسی طرح تونسے تک پہنچایا۔

حضرت سلمان جب اس شان سے مدرسے کے احاطے میں داخل ہوئے تو مولانا حسن علی نے کہا سلیمان تو بار بار ادب کی حد سے نکل جاتا ہے۔ یہ مدرسہ ہے اور تو یہاں کا ایک معمولی طالب علم ہے، یہ سن کر حضرت سلیمان پر عجیب عالم طاری ہو گیا۔ وہ روتے ہوئے بے اختیار استاد کے قدموں میں گر پڑے اور کہا قبلہ میرے اختیار میں کچھ نہیں ہے۔ میں بے بس سا ہو کر رہ گیا ہوں۔ میرے حق میں دعا کیجیے کہ لوگ مجھے صرف ایک طالب علم رہنے دیں اور مجھے وہ نہ سمجھیں جو میں نہیں ہوں۔"

اس دن سے مولانا حسن علی۔ آپ کو اپنے خاص حجرے میں تعلیم دینے لگے۔ وہ کوشش کرتے کہ حضرت سلیمان عام طلبہ میں زیادہ نہ گھلیں ملیں۔ وہ تنہائی میں آپ کے سامنے دوزانو بیٹھ جاتے۔ لیکن دوسروں کے سامنے اسی طرح سخت رویہ رکھتے۔ آپ نے

مولانا حسن علی سے خواجہ فرید الدین عطار کی کتاب پند نامہ اور سعدی کی گلستان و بوستان پڑھیں۔

مولانا حسن علی کے مدرسے سے فارغ ہو کر حضرت سلیمانؒ لانگھ پہنچے، جو تونسے سے پانچ کوس کے فاصلے پر تھا۔ وہاں مولوی دل محمد سے فارسی تعلیم مکمل اور کوٹ مٹھن چلے گئے۔ یہاں آپ نے قاضی محمد عاقل کے مدرسے میں فقہ اور حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ اس وقت آپ کی عمر پندرہ برس تھی۔ ایک دن آپ نے سنا کہ قاضی محمد عاقل کے مرشد خواجہ نور محمد آئے ہوئے ہیں۔ آپ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھوں نے انھیں اپنا مرید بنا لیا۔ آپ چھ سال تک اپنے مرشد سے ظاہری اور باطنی علم حاصل کرتے رہے۔

خواجہ نور محمد کی وفات کے بعد تونسے کی مسند پر خواجہ سلیمان بیٹھے۔ سب سے پہلے شیخ جمال الدین چشتی اور مولانا محمد ہارون آپ کے مرید بنے رفتہ رفتہ آپ کی شہرت پھیلتی گئی۔ آپ کے مریدوں اور خلیفوں کی تعداد بے شمار اور وہ مختلف مقامات میں پھیلے ہوئے تھے۔ آپ تقریباً ساٹھ برس تک اس مسند پر رہے۔ تونسے میں آپ نے ایک بہت بڑا دارالعلوم (کالج) تعمیر کرایا تھا جہاں طالب علم دُور دُور سے آ کر تعلیم حاصل کرتے تھے۔

دارالعلوم میں پچاس کے قریب استاد تھے۔ حضرت سلیمانؒ خود بھی درس دیتے تھے۔ درس گاہ سے دو ہزار طلبہ کو تینوں وقت کھانا دیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ لنگر سے روزانہ ڈھائی ہزار مسکینوں کو صبح شام کھانا ملتا تھا۔

خواجہ سلیمانؒ دن بھر درس و تدریس میں مصروف رہتے تھے اور رات کو حجرہ بند کر کے اس طرح بیٹھ جاتے کہ دنیا ان کے نزدیک مر جاتی۔ مرید حجرے کے قریب سے گزرنے کی جرات نہ کرتے تھے۔ آپ فجر کی نماز کے لیے صبح باہر آتے تو چہرہ گلاب کی طرح شگفتہ نظر آتا تھا۔ آپ پر اکثر وجد کی کیفیت طاری رہتی۔ بعض اوقات آنکھوں سے بے اختیار خون جاری ہو جاتا۔ سماع کی محفل میں قوال سے کوئی اچھا شعر سن کر اکثر بے ہوش ہو جاتے لیکن اس کے باوجود آپ نے ساری عمر کبھی سنت کے خلاف کوئی کام نہ کیا۔

ساری عمر کوئی نماز قضا نہیں کی۔

حضرت خواجہ سلیمانؒ کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔قرآن اور حدیث پر آپ کو پورا عبور حاصل تھا۔آپ اپنی نصیحت کو پر اثر بنانے کے لیے مختلف اشعار قرآنی آیات اور احادیث کا استعمال کرتے تھے۔اپنے مرشد کے فرزندوں کی بے حد عزت کرتے تھے۔خود ان کے ہاتھ دھلاتے، ان کے برتن دھوتے۔ یہاں تک کہ ان کے پاؤں بھی دباتے۔ ایک بار کسی نے اس کی وجہ پوچھی تو آپ نے فرمایا کہ اللہ والوں کی اولاد جیسی بھی ہو، اس کی عزت کرنی چاہیے کیوں کہ اس کے بزرگ اس کے مددگار ہوتے ہیں۔ بزرگوں کی اولاد میں سے کوئی شخص کسی سے ملاقات کے لیے آتا ہے تو وہ بزرگ مزار سے سینے تک باہر آ کر دیکھتے ہیں کہ یہ شخص میری اولاد کے ساتھ کس طرح پیش آتا ہے۔

ایک روز آپؒ سے کسی نے پوچھا کہ جب خدا ہمارا حال دیکھ رہا ہے تو ہمیں اس پر تکیہ کرنا چاہیے یا خدا کے خاص بندوں سے التجا کرنی چاہیے؟ آپؒ نے فرمایا کہ تم کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ یاد نہیں؟ جب وہ آگ میں ڈالے جا رہے تھے تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے ان سے پوچھا تھا کہ اگر آپ کو کوئی حاجت ہو تو حکم دیجیے۔ حضرت ابراہیمؑ نے جواب دیا کہ مجھے کوئی حاجت نہیں ہے۔ میرا رب میرے حال سے واقف ہے۔

خواجہ سلیمانؒ نے اپنا ایک واقعہ بیان کیا کہ میں رات تنہا بیٹھا تھا۔ اتنے میں ایک شخص ایک گدھا لایا اور اس کو مجھ سے کچھ فاصلے پر باندھ کے بیٹھ گیا۔ میں نے اس سے اس کا نام پوچھا۔ اس نے جواب دیا ''شیطان ہوں اور آپ کے پاس کچھ دیر بیٹھنے کے لیے آیا ہوں۔'' میں نے دل میں دعا کی کہ مولا! مجھے شیطان کے مکر سے بچا اور اپنی امان میں رکھ۔

شیطان نے کہا'' آپ فکر نہ کیجیے۔ خدا نے آپ کو میرے مکر سے بچا کر پہلے ہی اپنی امان میں لے رکھا ہے۔''

پھر میرے اور اس کے درمیان گفتگو ہوتی رہی۔ باتوں باتوں میں اس نے

بڑے فخر سے کہا کہ میں بھی کبھی خدا کے بہت نزدیک ہوتا تھا۔ میں نے کہا کہ اگر تو اب بھی سچے دل سے حضرت آدمؑ کی قبر پر سجدہ کر لے تو امید ہے کہ خدا تجھے پہلا سا رتبہ عطا کر دے گا۔ شیطان نے جواب دیا کہ چونکہ میں نے اس وقت خدا کا حکم نہیں مانا تھا۔ اس لیے اب مجھے ایسا کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ یہ کہہ کر وہ جانے لگا تو میں نے کہا تیرے نزدیک جو بہتر نصیحت ہو وہ مجھے کر۔ شیطان نے کہا ہر شخص کو اپنے سے بہتر سمجھیے۔ آپ کا رتبہ ہمیشہ بڑھتا رہے گا۔''

ایک دن ایک نوجوان آپ کا مرید بننے آیا۔ اس دن اور بھی بہت سے لوگ آپ کے مرید ہوئے تھے۔ نوجوان مرید ہو کے گھر چلا گیا اور رات کو سوتے وقت، سوچنے لگا کہ میرے پیر کے تو بے شمار مرید ہیں۔ اتنے بہت سے مریدوں میں وہ بھلا میری کیا خبر رکھیں گے۔ اسی رات اس نے خواب میں دیکھا کہ خواجہ سلیمانؒ اس کے بستر کے پاس کھڑے ہیں اور مسکراتے ہوئے کہہ رہے ہیں۔ حسن علی کے بیٹے، ہمیں خبر ہے کہ تیرے دانتوں میں سے ایک دانت ہلتا ہے۔ فکر نہ کر، صبح وہ دانت بھی ٹھیک ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ تو اور کیا چاہتا ہے؟ نوجوان صبح اٹھا تو اس کا ہلتا ہوا دانت جم چکا تھا۔ وہ بھاگا ہوا آپ کی خدمت میں پہنچا تو آپ نے پوچھا حسن علی کے بیٹے تیرا دانت اب تو نہیں ہلتا؟

۱۸۲۶ء میں افغانستان میں افراتفری مچی ہوئی تھی۔ وہاں کے امیر دوست محمد نے درانی خاندان کو کابل اور غزنی سے نکال دیا تھا۔ درانی خاندان کے تخت و تاج کے مالک شاہ شجاع نے ہندوستان میں پناہ لے لی تھی۔ وہ خواجہ سلیمانؒ کی شہرت سن کر تونسہ شریف آیا۔ خواجہ سلیمانؒ نے اس کی داستان سنی اور پھر اس سے پوچھا ''افغانستان کی فتح کا ارادہ تو کر رہے ہو لیکن یہ تو بتاؤ کہ وہاں کس کی پناہ میں جا رہے ہو؟'' شاہ شجاع نے جواب دیا ''کہن دل خان اور پردل خان کی حمایت میں جا رہا ہوں۔'' جب شاہ شجاع چلا گیا تو خواجہ سلیمانؒ نے لوگوں سے کہا کہ شاہ شجاع نے اپنے لیے خود موت چن لی ہے۔ کوئی اس کی کیا مدد کر سکتا ہے۔ کاش وہ کہن دل خان اور پیر دل خان کے نام لینے کے بجائے یہ کہہ دیتا کہ خدا کی پناہ میں جا رہا ہوں۔ اگر ایسا ہوتا تو درانی خاندان ہمیشہ خدا کی

پناہ میں رہتا لیکن اب جلد ہی اس کے مرنے کی خبر آئے گی ۔ چند دنوں بعد شاہ شجاع کے قتل کے خبر آ گئی۔

حضرت خواجہ سلیمانؒ نے ساٹھ سال کی عمر پائی ۔ ایک دن صفر کے مہینے کا چاند دیکھ کر فرمانے لگے کہ اب ہماری رخصتی کا وقت آ گیا ۔ صفر ہمارے سفر کا مہینہ ہے ۔ اس بات کو سات دن ہوئے تھے کہ آپ خالق حقیقی سے جا ملے ۔ بہاول پور کے نواب نے سنگ مرمر کا عالی شان روضہ تعمیر کروایا ۔ آپ کا فیض آج بھی جاری ہے ۔ لوگ ہزاروں کی تعداد میں آپ کے مزار پر حاضری دیتے ہیں اور خدا کے فضل سے اپنی مرادیں پاتے ہیں ۔

حضرت شاہ کلیم اللہ جہان آبادیؒ

حضرت شاہ کلیم اللہ ۲۴ جمادی الثانی ۱۰۶۰ھ کو جہان آباد میں پیدا ہوئے یہ وہی جہان آباد ہے جو بعد میں دہلی کے نام سے مشہور ہوا۔ آپ کے والد حاجی نوراللہ دہلی کے مایہ ناز خطاط اور خوش نویس تھے۔ دہلی جامع مسجد کے دروازوں پر جو کتبے کنداں ہیں وہ ا ن کے تراشے ہوئے ہیں۔

حضرت شاہ کلیم اللہ نے اس وقت کے مشہور علما شیخ بہلول اور شیخ ابوالرضا سے تعلیم حاصل کی۔ تحریر کے ساتھ ساتھ تقریر میں بھی کمال حاصل تھا۔ تقریروں میں ایسے ایسے نکتے بیان کرتے کہ سننے والے دنگ رہ جاتے۔ تعلیم سے فارغ ہو کر درس کا سلسلہ شروع کیا جو کئی سال جاری رہا۔ اس کے بعد آپ مدینے تشریف لے گئے۔ اس زمانے میں شیخ یحییٰ کو مدینے کا قطب کہا جاتا تھا۔ شاہ کلیمؒ خاک میں اٹے ہوئے ان کی خدمت میں پہنچے تو انھوں نے آپ کو سینے سے لگا لیا اور اپنے مریدوں میں شامل کر دیا۔

شاہ کلیم اللہ مدینے میں ایک مدت تک رہے۔ اس کے بعد شیخ یحییٰ نے آپ کو خلافت دی اور دہلی واپس جانے کا حکم دیا آپ سب سے پہلے خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی درگاہ پر گئے اور رات بھر عبادت کرتے رہے۔ پھر دہلی میں جامع مسجد اور لال قلعے کے درمیان خانم بازار میں قیام کیا اور درس ق تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ یہاں آپ نے ایک وسیع خانقاہ تعمیر کرائی۔ اس میں ایک طرف عبادت خانہ تھا تو دوسری طرف مجلس خانہ۔ ایک طرف لنگر تھا تو دوسری طرف زنان خانہ۔ حضرت شاہ کلیم اللہ کے پاس جو کچھ آتا تھا، لنگر خانے پر صرف کر دیتے تھے۔ اپنے اوپر ایک پائی تک خرچ نہ کرتے۔ بادشاہ فرخ سیر نے آپ کا شاہی خزانے سے وظیفہ مقرر کرنے کی بہت کوشش کی۔ مگر آپ راضی نہ ہوئے۔ آپ نے اپنا ذاتی مکان کرائے پر دے رکھا تھا جس سے آپ کو ڈھائی روپے وصول ہوتے تھے آپ اسی سے اپنے اہل وعیال کے اخراجات پورے کرتے تھے۔

آپ نے کبھی کسی کو بددعا نہ دی۔ فرماتے تھے کہ جو ہمیں تکلیف پہنچائے اسے راحت

نصیب ہو۔ آپ کی محبت اور شفقت کا یہ عالم تھا کہ ہر مرید یہ سمجھتا تھا کہ وہ اس سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ حالانکہ آپ سب سے یکساں محبت و شفقت سے پیش آتے تھے۔ کسی مرید کو تکلیف میں دیکھتے تو بے قرار ہو جاتے۔ کسی عقیدت مند کی بیماری کا سنتے تو فوراً عیادت کو پہنچتے اور اس کی صحت کی دعا کرتے۔

آپ حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت پر سختی سے کاربند رہتے تھے۔ آپ کی زندگی سنت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نمونہ تھی۔ حجاز کے سفر کے دوران میں آپ مدینے پہنچے اور مسجد قبا جانے کا ارادہ کیا تو ایک مرید نے سواری پیش کی مگر آپ نے فرمایا ”نہیں۔ اگر ہمیں سواری درکار ہوتی تو مل سکتی تھی۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد قبا میں پیدل جایا کرتے تھے۔ محبوب الٰہی خدا نے فرمایا تھا کہ اللہ کی راہ میں جس شخص کے پاؤں غبار آلود ہو جائیں، اللہ اس پر دوزخ کی آگ حرام کر دیتا ہے۔“

آپ روزانہ صبح سویرے بیدار ہوتے، غسل کرتے، صاف ستھرا لباس پہنتے اور پھر خوشبو لگاتے تھے۔ عموماً اپنے تمام کام خود کرتے تھے۔ خود تکلیف اٹھاتے مگر اپنے خادموں کو زیادہ آرام پہنچانے کی کوشش کرتے۔ آپ کے رعب اور جلال کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے سردار اور امیر سامنے آتے ہوئے گھبراتے تھے۔ آپ جمعے کی نماز شاہ جہانی مسجد میں پڑھتے تھے۔ وہاں بادشاہ فرخ سیر بھی نماز پڑھنے آتا تھا مگر اس کی ہمت نہ تھی کہ آپ سے بات کرے۔

جو لوگ آپ کے مرید ہوتے وہ سچے مسلمان بن جاتے تھے آپ کی تقریر میں بے حد اثر تھا جس سے ہزاروں بھٹکے ہوئے لوگ سیدھی راہ پر آ گئے۔ آپ وعظ کہتے تو آپ کی آواز دور و نزدیک کے تمام سننے والوں تک یکساں پہنچتی تھی۔

ایک بار جمنا میں اتنا زبردست سیلاب آیا کہ دہلی کے غرق ہونے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ جب تمام ناکام ہو گئیں تو لوگ آپ کے پاس آئے۔ آپ فوراً جمنا کے کنارے پہنچے۔ آپ کے ہاتھ میں قرآن مجید تھا۔

آپ نے دعا فرمائی ”یاالٰہی! تیری مقدس کتاب ہمارے پاس ہے، کیا تو اس کی موجودگی میں ہمیں غرق کر دے گا؟“ آپ نے یہ کہا ہی تھا کہ دریا کا پانی اترنا شروع ہو گیا۔

اسلام کی تبلیغ اور اشاعت میں شاہ کلیم اللہ نے نمایاں حصہ لیا۔ آپ کی کوشش سے غیر مسلم اسلام کے دائرے میں داخل ہو گئے آپ نے بتیس کے قریب کتابیں لکھیں۔ آپ اپنے مریدوں کو مندرجہ ذیل نصیحتیں فرماتے تھے۔

۱۔ دولت مندوں اور امیروں کے نذرانے قبول نہ کیا کرو۔ کیا معلوم ان کے نذرانے جائز ہیں یا ناجائز۔

۲۔ جھوٹے آدمی سے دور رہو۔ وہ تمھیں خرابی کی طرف لے جائے گا۔

۳۔ جھوٹی تعریفیں کرنے والوں سے دُور رہو۔ وہ تم میں غرور پیدا کر دے گا۔

۴۔ خود غرض آدمی سے دور رہو۔ وہ تمھیں دھوکا دے گا۔

۵۔ جو چیز اپنے لیے پسند کرو، وہی دوسروں کے لیے پسند کرو۔ کسی سے حسد نہ کرو۔ دوست زیادتی کرے تو برداشت کرو۔ اس کی نیکی یاد رکھو اور اپنی بھول جاؤ۔

۶۔ اپنی خواہشات خدا کی رضامندی پر قربان کر دو۔

۷۔ موت کو ہمیشہ اپنے سرہانے سمجھو۔

۸۔ کسی بھی گناہ کو کم یا حقیر مت سمجھو۔

عمر کے آخری دور میں آپ بہت کمزور ہو گئے تھے۔ اکیاسی سال نو مہینے کی عمر میں آپ تیمم کے ساتھ بیٹھ کر نماز پڑھتے تھے۔ مگر نماز ترک نہ کرتے تھے۔ آخر اسی عالم میں ۲۴ ربیع الاول ۱۱۴۲ھ کو آپ کا انتقال ہو گیا۔ آپ کا مزار دہلی میں جامع مسجد لال قلعے کے درمیان، پریڈ گراؤنڈ میں ہے۔ آج بھی ہزاروں مسلم و غیر مسلم آپ کے مزار کی زیارت کو جاتے اور عقیدت کے پھول چڑھاتے ہیں۔

حضرت ابن اُمِّ مکتوم رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ تعالیٰ عنہ بڑے درجہ کے صحابی ہیں، آپ سابقین اولین میں سے ہیں اور حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ماموں زاد بھائی ہیں، نام عبداللہ تھا اور بعض علماء نے عمرو بتایا ہے، ایک قول یہ ہے کہ ان کا نام حسین تھا آپ نسلاً قریشی تھے اور مکہ معظمہ کے رہنے والے تھے، آپؓ کا شمار مہاجرین اولین میں ہوتا ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہجرت فرمانے سے پہلے ہی مدینہ منورہ کو ہجرت کر گئے تھے، والد کے نام میں بھی علماء سیر کا اختلاف ہے کسی نے قیس بن زائدہ بتایا ہے اور کسی نے عمرو اور کسی نے شریح بن مالک لکھا ہے۔

ام مکتوم ان کی والدہ تھیں جن کا نام عاتکہ تھا۔ مکتوم کا معنی ہے چھپا ہوا۔ چونکہ حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ تعالیٰ عنہ (ایک قول کے مطابق) نابینا پیدا ہوئے تھے اس لئے ان کی والدہ کو ام مکتوم کہا جانے لگا یعنی ایسے لڑکے کی ماں جس کی آنکھیں چھپائی ہوئی ہیں۔ (یعنی بینائی کے اعتبار سے بند ہیں) اور بہت سے علماء نے فرمایا ہے کہ پیدائشی نابینا نہ تھے بلکہ پہلے بینا تھے بعد میں بینائی جاتی رہی تھی۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ تعالیٰ فتح الباری میں لکھتے ہیں کہ والمعروف انہ عمی بعد بدر بسنتین. یعنی علماء سیر میں یہی معروف و مشہور ہے کہ غزوۂ بدر کے دو سال بعد وہ نابینا ہوئے تھے لیکن یہ قول صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ حضرت ابن مکتوم کا ذکر سورۂ عبس میں موجود ہے اور وہ مکہ میں نازل ہوئی تھی۔ لہٰذا بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بعثت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دو سال بعد نابینا ہوئے ہوں گے۔ راوی نے بعد البعثۃ کی جگہ بعد بدر نقل کر دیا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

(من اوجز المسالک)

خدمتِ اذان:

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے موذنین میں حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ بھی شمار کیے جاتے ہیں۔ حضرت بلالؓ اور ابن ام مکتوم رضی اللہ تعالیٰ عنہما دونوں مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے موذن تھے۔ بخاری شریف میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرات صحابہؓ سے ارشاد فرمایا کہ بلالؓ کی اذان تم میں سے کسی کو سحری کھانے سے نہ روکے کیونکہ وہ ایسے وقت میں اذان دیتے ہیں جبکہ رات باقی ہوتی ہے اور ان کی اذان اس لئے ہوتی ہے کہ جو تہجد کی نماز میں مشغول ہو اس کو (سحری کھانے کے لئے یا نماز فجر کے واسطے ذرا ستانے کے لئے، لیٹنے بیٹھنے کی جگہ) واپس کر دیں اور تا کہ سونے والے کو جگا دیں۔ بخاری کی دوسری روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ بیشک بلال رات میں اذان دیتے ہیں لہٰذا تم ان کی اذان سن کر کھاتے پیتے رہو (یعنی سحری ختم نہ کرو) یہاں تک ابن مکتومؓ اذان دینا شروع کر دیں۔ راوی کا بیان ہے کہ ابن ام مکتومؓ نابینا تھے۔ جب تک ان سے یہ نہ کہا جاتا کہ صبح ہوگئی ہے اس وقت تک اذان نہ دیتے تھے اس سے معلوم ہوا کہ کوئی شخص اس بات لئے مقرر تھا کہ صبح ہوتے ہی حضرت ابن ام مکتومؓ کو خبر کر دیتا، فتح الباری میں ایک حدیث نقل کی ہے کہ حضرت ابن ام مکتومؓ (گو نابینا تھے مگر) طلوع فجر کی ان کو ایسی پہچان تھی کہ ان سے خطا نہ ہوتی تھی (جہاں فجر نمودار ہوئی فوراً اذان دیدی)

امام طحاوی کا فرمانا ہے کہ حضرت بلالؓ کی اذان سحری کی اطلاع کے لئے یا تہجد گذار کو قرب صبح کی اطلاع دینے کے لئے ہوتی تھی اور حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اذان نماز فجر کے لئے تھی۔ محدث ابن القطانؒ نے فرمایا کہ یہ دو اذانیں صرف رمضان میں ہوتی تھیں، اس حدیث سے سحری کے وقت اذان دینے کا پتہ چلا مگر حضرات صحابہ کرامؓ کے زمانہ ہی سے اس پر عمل متروک ہوگیا تھا۔ چونکہ خلفشار کا اندیشہ ہے کہ لوگ اذان فجر سمجھ کر سحری سے محروم رہ جائیں گے، اس لئے آج کل نہیں پڑھی جاتی ہے، طحاوی شریف میں حضرت علقمہ (تابعی) سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے ایک شخص کو طلوع

فجر سے قبل اذان دیتے سنا تو فرمایا کہ خبردار اس شخص نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہؓ کے طریقہ کی مخالفت کی۔

سورۂ عبس کا نزول اور حضرت ابن ام مکتومؓ کا اعزاز:

صاحب روح المعانی سورۂ عبس کا شان نزول لکھتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ ایک دن نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم قریش مکہ کے بڑے بڑے سرداروں کو دعوت اسلام دے رہے تھے جن میں ابوجہل اور عتبہ اور شیبہ اور امیہ بن خلف اور ولید بن مغیرہ تھے۔ ان لوگوں کے مسلمان ہو جانے سے امید تھی کہ دوسرے لوگ بھی ان کو دیکھا دیکھی اسلام قبول کریں گے اسی وقت حضرت ابن مکتوم رضی اللہ تعالیٰ عنہ بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ مجھے پڑھایئے اور اللہ تعالیٰ نے جو علوم آپ کو دیئے ہیں ان میں سے مجھے سکھایئے اور یہ بات ایک ہی دفعہ کہہ کر خاموش نہیں ہو گئے بلکہ بار بار کہتے رہے اور چونکہ نابینا تھے اس لئے ان کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حاضرین کو دعوت دینے میں مشغول ہیں۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کی یہ قطع کلامی ناگوار ہوئی جس کا اثر آپ کے چہرۂ انور پر ظاہر ہو گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی طرف اعراض فرمایا اور جن لوگوں دعوت میں مشغول تھے ان ہی میں مشغول رہے اور آپ کی دلی خواہش یہ ہوئی کہ ابن ام مکتومؓ اس وقت سوال نہ کرتے تو اچھا تھا۔ اس پر آیات ذیل نازل ہوئیں۔

ترجمہ: پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرۂ پر ناگواری کے باعث) شکن پڑ گئی۔ اور رُخ موڑ لیا اس بات سے کہ ان کے پاس نابینا آیا اور آپ کو کیا خبر شاید وہ سنور جاتا یا وہ نصیحت قبول کرتا تو اس کو نصیحت کرنا فائدہ پہنچاتا لیکن جو شخص بے پروائی کرتا ہے تو آپ اس کی فکر میں پڑتے ہیں حالانکہ آپ پر اس کا کوئی الزام نہیں کہ وہ نہ سنورے اور جو شخص آپ کے پاس دوڑتا ہوا آتا ہے اور خدائے پاک سے، ڈرتا ہے آپ اس سے بے توجہی برتتے ہیں۔ ہرگز ایسا نہ کیجئے۔ بیشک قرآن نصیحت کی چیز ہے سو جس کا جی چاہے اس کو

قبول کرے۔

صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت ابن مکتوم رضی اللہ تعالیٰ کے اعزاز و اکرام کا خاص دھیان فرماتے تھے اور ان کے حاضر ہونے پر فرمایا کرتے تھے کہ مرحبا بمن عاتبنی فیہ ربی. اور ان سے یہ بھی دریافت فرمایا کرتے تھے کہ ھل لک من حاجۃ (یعنی کیا تمہیں مجھ سے کچھ کام ہے)

خلافت اور امامت:

نیز حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یوں بھی ان کا اکرام فرمایا کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جہاد وغیرہ کے لئے تشریف لے جاتے تو ان کو مدینہ منورہ میں اپنا خلیفہ مقرر کرتے جس کی وجہ سے مسلمانوں کے امور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی واپسی تک آپؓ سے متعلق ہو جاتے تھے اور اس زمانہ میں مسجد نبویؐ کے امام بھی وہی ہوتے تھے اسماء الرجال کی کتابوں میں لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ۱۳ مرتبہ ان کو خلیفہ بنا کر اپنے پیچھے مدینہ منورہ میں چھوڑ گئے۔

شوقِ جہاد اور شہادت:

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ (کاتب وحی) کا بیان ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے (سورۂ نساء کی) یہ آیت اس طرح املا کرائی۔ ترجمہ (جہاد میں شرکت نہ کر کے گھروں میں بیٹھ جانے والے مومنین اور اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے والے برابر نہیں ہیں۔) ابھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس آیت شریفہ کا املا کرا ہی رہے تھے کہ ابن ام مکتومؓ آ گئے اور انھوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ اگر میں جہاد کر سکتا تو ضرور آتا (چونکہ) وہ نابینا تھے (اس لئے انہوں نے یہ بات کہی) ان کے اس کہنے پر اسی وقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی اور آیت بالا میں لفظ غیر اولی الضررؓ کا اضافہ فرمایا حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ جب یہ وحی نازل ہوئی ہے اس وقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم کی مبارک ران میری ران پر تھی، وحی کے بوجھ سے مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میری ران کچل جا رہی ہے اس کے بعد وہ کیفیت جاتی رہی جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نزول وحی کے وقت طاری ہوا کرتی تھی۔ (ترمذی شریف کتاب التفسیر)

غیر اولی الضرر کے نزول کے بعد اب پوری آیت اور اس کا ترجمہ اس طرح ہوا۔

ترجمہ: وہ مسلمان جو بلا عذر کے گھر میں بیٹھے رہیں اور وہ لوگ جو اپنے مالوں سے اور جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کریں برابر نہیں ہوں گے۔

جو لوگ معذوری کی وجہ سے شریک جہاد نہیں ہو سکے مگر ان کے دلوں میں عزم کامل ہے اور شوق جہاد بھرپور ہے تو ایسے حضرات اپنی سچی نیت اور تڑپ کے باعث جہاد کرنے والوں ہی کے برابر ہیں ہاں غیر معذورین کو شریک جہاد ہو کر مجاہدین کی برابری ہی کا فکر کرنا چاہیئے۔ چونکہ ہر موقع پر جہاد فرض عین نہیں ہے اس لئے ہر غزوہ میں اگر بعض نہ جاویں گے تو گنہ گار تو نہ ہوں گے لیکن جہاد کرنے کے جو فضائل موجود ہیں جہاد کرنے ہی سے ملیں گے۔

حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ تعالیٰ عنہ گونا بینا ہونے کی وجہ سے شرکت جہاد سے معذور رہتے مگر شوق جہاد ان کو کشاں کشاں قادسیہ کی جنگ کے میدان میں لے گیا اور اسی موقعہ پر جام شہادت نوش فرمایا۔ یہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کا زمانہ تھا حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے جنگ قادسیہ میں ان کو اس حال میں دیکھا کہ لوہے کی زرہ پہنے ہوئے اور ہاتھ میں سیاہ جھنڈا لئے ہوئے تھے۔ (بینائی نہ ہونے کے باعث چونکہ شمشیر زنی سے عاجز تھے اس لئے جھنڈا سنبھالنے ہی کی خدمت اپنے ذمہ لے لی) ایک قول یہ بھی ہے کہ فتح قادسیہ کے بعد مدینہ منورہ واپس آ کر وفات پائی۔ رضی اللہ عنہ۔

حضرت خزیمہؓ بن ثابت خطمی ذوالشہادتین

عہد رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر ہے کہ ایک دن ایک صاحب جن کی پیشانی نور سعادت سے چمک رہی تھی رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کی:

''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرے ماں باپ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قربان جائیں گزشتہ شب میں نے خواب میں دیکھا کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جبین مبارک کو چوم رہا ہوں۔''

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کی بات سن کر متبسم ہو گئے اور فرمایا: ''تم اپنے خواب کی تصدیق کر سکتے ہو۔''

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد سن کر فرط محبت سے بے خود ہو گئے اور والہانہ انداز میں آگے بڑھ کر فخر موجودات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جبین پاک کو چوم لیا۔ دیکھنے والوں کے لیے یہ ایک تحیر خیز منظر تھا۔ وہ رشک کرتے تھے کہ کاش یہ سعادت عظمٰی ان کے حصے میں آئی ہوتی، لیکن اللہ کی دین ہے وہ جس کو چاہے اپنے فضل کے لیے چن لے۔

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

کائنات ارضی و سماوی کی مقدس ترین ہستی شہ لولاک، فخر جن وانس، سید المرسلین، امام الانبیاء رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جبین اطہر پر بوسہ دینے کا شرف عظیم حاصل کرنے والے یہ صاحب حضرت خذیفہؓ بن ثابت خطمی انصاری تھے۔

سیدنا حضرت خذیمہؓ بن ثابت کا شمار آسمان ہدایت کے ان درخشندہ ستاروں

میں ہوتا ہے کہ جن کی تابانی سے تاریخ اسلام کے اوراق ابد تک جگمگاتے رہیں گے۔ ان کا تعلق قبیلہ اوس کی شاخ بنوخطمہ سے تھا۔ سلسلہ نسب یہ ہے:

خذیمہؓ بن ثابت بن فاکہ بن ثعلبہ بن ساعدہ بن عامر بن عیاں بن عامر بن خطمہ (عبداللہ) بن چشم بن مالک بن اوس۔

والدہ کا نام کبشہ بنت اوس تھا۔ وہ خزرج کی شاخ بنوساعدہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ حضرت خذیمہؓ کی کنیت ابوعمارہ تھی اور لقب ذوالشہادتین تھا جو انھیں بارگاہ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عطا ہوا تھا۔

حضرت خذیمہؓ کو اللہ تعالیٰ نے نہایت صالح فطرت ودیعت کی تھی۔ سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مدینہ منورہ میں نزول اجلال سے پہلے حضرت مصعبؓ بن عمیر اسلام کے دائی اول کی حیثیت سے مدینہ آئے تو ان کی تبلیغی مساعی کے نتیجہ میں اوس و خزرج کے بیشتر گھرانے سعادت اندوز اسلام ہو گئے۔ حضرت خذیمہؓ بھی اسی زمانے میں شرف اسلام سے بہرہ یاب ہوئے۔ قبول حق کے بعد انھیں بتوں سے ایسی سخت نفرت ہوئی کہ اپنے ایک پرجوش ساتھی عمیر بن عدی کو ساتھ لے کر بنوخطمہ کے تمام بت توڑ ڈالے۔

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے اور غزوات نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سلسلہ شروع ہوا تو حضرت خذیمہؓ نے تقریباً سبھی غزوات میں آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا۔ مولوی سعید انصاری مرحوم نے سیر انصار میں حضرت خذیمہؓ کو اصحاب بدر میں شمار کیا ہے۔ لیکن سیر و مغازی کی بیشتر کتابوں میں بدری صحابہ کرامؓ کی فہرست میں ان کا نام شامل نہیں ہے۔ اگر فی الواقع وہ غزوۂ بدر میں شریک نہ ہو سکے تو اس کا کوئی خاص سبب ہوگا۔ ہوسکتا ہے مدینہ منورہ سے باہر ہوں یا علیل ہوں ورنہ ان کے جذبہ فدویت سے بعید تھا کہ کسی عذر کے بغیر اس سعادت سے محروم رہے ہوں۔

فتح مکہ کے موقع پر وہ ان دس ہزار قدوسیوں میں شامل تھے جن کے بارے میں ''کتاب استثنا'' میں پیشن گوئی کی گئی تھی کہ وہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے

ہمرکاب ہوں گے۔ اس وقت حضرت خذیمہؓ کو خاص امتیاز یہ حاصل ہوا کہ سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنومعظمہ کا علم انھیں مرحمت فرمایا اور یہ علم لہراتے ہوئے وہ اس شان سے مکہ میں داخل ہوئے کہ بنومعظمہ کے بیسیوں مسلح سرفروش ان کے جلو میں تھے اور ان کے ہتھیاروں کی چمک دمک نگاہوں کو خیرہ کر رہی تھی۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عثمانؓ ذوالنورینؓ کے زمانہ خلافت میں حضرت خذیمہؓ بن ثابت کے ایام حیات کیسے بسر ہوئے؟ کتب سیر اس کے بارے میں خاموش ہیں۔ ان کا نام دوبارہ حضرت علیؓ کے عہد خلافت میں منظر عام پر آتا ہے۔ حضرت علیؓ نے دارالخلافہ مدینہ منورہ سے کوفہ منتقل کیا تو وہ بھی کوفہ جا کر مقیم ہو گئے۔

۳۶ھ میں جمل کی جنگ پیش آئی تو حضرت خذیمہؓ، حضرت علیؓ کے ساتھ تھے تاہم انھوں نے اس لڑائی میں عملی طور پر حصہ نہیں لیا۔ اس کے بعد وہ جنگ صفین ۳۷ھ میں بھی حضرت علیؓ کے حامی تھے ''مسند امام احمد بن حنبلؒ'' میں ہے کہ جب حضرت عمارؓ بن یاسر نے شامی فوج کے ہاتھ سے شہادت پائی تو حضرت خزیمہؓ کو جوش آ گیا اور وہ شمشیر بدست یہ رجز پڑھتے ہوئے دشمن کی صفوں میں گھس گئے۔

(جب ہم نے علیؓ سے بیعت کر لی تو یہ ہم کو کفایت کرتی ہے اور اب ہم کو کسی فتنے کا ڈر نہیں ہے۔

علیؓ میں اہل شام کی تمام بھلائیاں موجود ہیں لیکن اہل شام علیؓ کی بعض خوبیوں سے بھی تہی دامن ہیں)۔

دیر تک نہایت شجاعت سے لڑتے رہے آخر شامیوں نے نرغے میں لے کر تیروں اور تلواروں کا مینہ برسا دیا اور اللہ کا یہ شیر جام شہادت پی کر معبود حقیقی سے جا ملا۔

حضرت خزیمہؓ نے اپنے پیچھے دو لڑکے عمارہ اور عمرو اور ایک لڑکی عمرہ چھوڑی۔

حضرت خذیمہؓ کی زندگی کا سب سے تابناک واقعہ وہ ہے جس میں رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی شہادت کو دو آدمیوں کی شہادت کے برابر قرار دیا

اور وہ ''ذوالشہادتین'' کے منفرد لقب سے مشہور ہوئے۔ مسند امام احمد بن حنبلؒ۔ مسند ابوداؤد، نسائی اور طبقات ابن سعد وغیرہ میں روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک اعرابی سے (جس کا نام طبرانی اور ابن شاہین نے سوار بن الحرث لکھا ہے) ایک گھوڑا خریدا تو وہ اعرابی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے پیچھے چلا۔ یہ سودا راستے میں کسی ایسی جگہ پر طے ہوا جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کاشانہ اقدس سے کچھ دور تھی اور قیمت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس نہ تھی۔ چنانچہ آپ اس اعرابی کو قیمت دینے کے لیے اپنے ساتھ لے چلے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چلنے میں جلدی کی تاکہ گھر جلد پہنچ کر قیمت ادا کریں، لیکن اعرابی نے چلنے میں سستی کی (یہاں تک کہ بہت پیچھے رہ گیا) اسی اثناء میں اس سے کچھ لوگ ملے اور اس سے گھوڑے کا بھاؤ تاؤ کرنے لگے۔ انھیں علم نہیں تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ گھوڑا خرید لیا ہے۔ یہاں تک کہ بعض لوگوں نے اعرابی کو اس قیمت سے زیادہ قیمت کی پیش کش کی جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے طے پا چکی تھی۔ اس پر اعرابی نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بآواز بلند پکارا (کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آگے بڑھ چکے تھے) ''آپ یہ گھوڑا خریدتے ہیں یا نہیں ورنہ میں اس کو کسی دوسرے کے ہاتھ بیچتا ہوں۔'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اعرابی کی آواز سنی تو کھڑے ہو گئے یہاں تک کہ اعرابی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریب آ گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''تم تو گھوڑا میرے ہاتھ بیچ چکے ہو''۔

اعرابی مکر گیا اور بولا۔ ''واللہ میں نے اس کو آپ کے ہاتھ نہیں بیچا۔''

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں تو اس کو میرے ہاتھ بیچ چکا ہے اور میں نے تجھ سے اس کو خریدا ہے۔''

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بار بار یہ بات فرمائی اور اعرابی نے ہر مرتبہ انکار کیا اور کہا کہ اگر میں نے اسے آپ کے ہاتھ بیچا ہے تو اس کا کوئی گواہ لائیے۔ اسی دوران میں بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ انھوں نے اعرابی سے کہا کہ یہ اللہ کے رسول ہیں

جھوٹ نہیں بول سکتے جو آپ فرما رہے ہیں۔ یقیناً یہی سچ ہے۔ تو غلط کیوں اصرار کر رہا ہے لیکن وہ بار بار گواہ مانگے ہی جا رہا تھا۔

اتنے میں حضرت خذیمہؓ بن ثابت بھی وہاں پہنچ گئے۔ انھوں نے اعرابی کو مخاطب ہو کر کہا کہ میں اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ تو نے یہ گھوڑا ان کے ہاتھ بیچا ہے۔ اس پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت خذیمہؓ سے پوچھا کہ تم تو اس وقت موجود نہ تھے۔ تم شہادت کس طرح دے رہے ہو۔ انھوں نے عرض کیا:

اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بات کی تصدیق کر رہا ہوں (یعنی چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو کچھ فرماتے ہیں حق ہی فرماتے ہیں اس لیے میں نے یہ گواہی دی) ان کا جوش اخلاص دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ خذیمہؓ جس کے مخالف یا موافق گواہی دیں تو بس صرف ان کی تنہا گواہی کافی ہے یعنی ان کی شہادت دو آدمیوں کے برابر ہے۔ چنانچہ حضرت خذیمہؓ اسی دن سے ذوالشہادتین کے لقب سے مشہور ہو گئے۔

بعض لوگوں نے اس روایت کا اس بناء پر انکار کیا ہے کہ یہ صحیحین میں موجود نہیں ہے لیکن صحیح بخاری کی ایک حدیث میں اس واقعہ کا ضمناً ذکر آیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام بخاریؒ کو اس واقعہ کی صحت پر یقین تھا۔ حدیث کاتب وحی جرالامت حضرت زیدؓ بن ثابت سے مروی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب ہم نے مصاحف نقل کیے تو سورۂ احزاب کی یہ آیت جس کو ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا تھا نہیں پائی۔

ترجمہ: ایمان لانے والوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جنھوں نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو سچا کر دکھایا ہے۔ ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا ہے اور کوئی وقت آنے کا منتظر ہے انھوں نے اپنے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔

یہ آیت حضرت خذیمہؓ بن ثابت انصاری سے ملی جن کی شہادت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دو آدمیوں کی شہادت کے برابر قرار دیا تھا۔ (سورۃ احزاب)

حضرت خذیمہؓ بن ثابت کے گلشن اخلاق میں جوش ایمان اور حب رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب سے خوش رنگ پھول ہیں۔ اس کا اندازہ اوپر دیے گئے واقعات سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ ایک روایت کے مطابق اگر ان کو سرور کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جبین مبارک چومنے کا شرف حاصل ہوا تو ایک اور روایت کے مطابق انھوں نے خواب میں اپنے آپ حضور اقدس کے سامنے سجدہ ریز پایا۔ بیدار ہو کر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں یہ خواب بیان کیا تو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی جبین اطہر ان کی پیشانی سے مس فرمائی اور فرمایا یہی تیرے خواب کی تعبیر ہے۔

یہ نصیب اللہ اکبر، لوٹنے کی جائے ہے

قبیلہ اوس کے لوگ حضرت خذیمہؓ کے شرف اور عظمت پر فخر کیا کرتے تھے۔

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے ''الاصابہ فی تمیز الصحابہ'' میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ اوس اور خزرج میں باہم مفاخرت ہوئی تو اوس نے اپنی جن جلیل القدر شخصیتوں کو خزرج کی شخصیتوں کے مقابلے میں پیش کیا ان میں ایک شخصیت حضرت خذیمہؓ بن ثابت کی تھی۔

حضرت خذیمہؓ سے ۱۳۸ احادیث مروی ہیں۔ ان کے راویوں میں حضرت جابر بن عبداللہؓ، ابراہیم بن سعدؓ بن ابی وقاص، ابوعبداللہ جدلیؓ اور عطاء بن یسارؓ کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

حضرت سلمان فارسیؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

اگر کبھی دنیا میں ان خوش نصیب انسانوں کی تاریخ لکھی گئی جن کی پوری زندگیاں صرف حق وصداقت کی تلاش میں گزریں تو انشاءاللہ حضرت سلمان فارسیؓ کا نام نامی سرفہرست رہے گا۔

خدا نے انہیں بڑی طویل عمر عطا فرمائی تھی۔ ڈھائی سو سال یا شاید اس سے بھی زیادہ! لیکن اتنے طویل عرصے تک اس دنیا میں رہنے کے باوجود ان کا دل دنیا سے بہت دور اور آخرت سے بے حد نزدیک رہا۔

وہ ایران کے ایک شہر اصفہان سے ظاہر ہوئے شام، موصل، نصیبین اور عموریہ کی خاک چھانتے ہوئے جزیرہ نمائے عرب تک اس آدمی کو ڈھونڈتے ہوئے آئے جو ان کو ان کے سچے خدا تک پہنچا سکے کبھی انہوں نے اصفہان کے آتش کدوں کی رونی میں خدا کو تلاش کیا۔ کبھی اس تلاش حق پر گھربار نثار کر کے مسیحی عبادت گاہوں میں اپنے خدا کو آواز پر آواز دی۔ جستجو کا ہر نیا مرحلہ ایک نئے مرحلے کی طرف ان کو دھکیلتا اور آگے بڑھاتا چلا گیا۔ آتش پرستی سے وہ مسیحی نماز کی طرف لپکے تھے اور جب کفر وشرک کی عالمی طوفانی آندھیوں میں عیسائیت کا چراغ گل ہونے لگا تو دم توڑتی ہوئی عیسائیت نے ان کو اسلام کی صبح نو کے افق کی طرف اشارہ کیا۔ اب ہر طرف سے سمٹ کر ان کی پرشوق نظر اسی افق پر جم کر رہ گئی تھی۔ جہاں سے ایمان ویقین کا آخری سورج طلوع ہونے والا تھا۔ عموریہ کے گرجا میں دم توڑتے ہوئے دنیا کے آخری حقیقی عیسائی کے آخری الفاظ سننے کے بعد ان کی تمام امیدوں اور آرزوؤں کا واحد مرکز ''کھجوروں والی سرزمین'' ہی ہو کر رہ گئی تھی۔

جہاں کھجوروں کی پراسرار چھاؤں میں سیدھی سچی راہ کے مٹے ہوئے نقوش آخری بار اور

ہمیشہ کے لئے اجاگر ہونے والے تھے۔

''اس قدر دکھ بھری گھاٹیاں طے کرتا ہوا میں آپ کے پاس پہنچا تھا۔'' سلمان فارسی جان بلب اسقف کے بالیں پر کھڑے ہوئے پکار اٹھے ''اور۔۔۔اور اب آپ بھی مجھے اس دنیا میں تنہا چھوڑ کر دوسری دنیا کی طرف سدھارنے والے ہیں۔۔۔کچھ میرا سامان بھی تو کرتے جائیے۔''

پادری نے یہ آواز سنی اور بند آنکھیں بے اختیار کھول دیں۔ یہ درد بھرے فقرے سن کر بجھتی ہوئی، رشک، عقیدت، رقت اور محبت کے ساتھ اسقف اس عجیب آدمی کو تک رہا تھا۔ جس کو صرف اسی ذات سے عشق تھا جس سے عشق ہونا ہی چاہیے اور صرف محض اسی شے کی تلاش تھی جس کی تلاش ہی کا دوسرا نام زندگی ہے۔

''میرے بیٹے! میں تمہارے لئے کیا سامان کروں؟'' دنیا کے آخری سچے عیسائی نے سلمان کی آنکھوں میں اپنے آنسو انڈیلتے ہوئے کہا ''حیف! کہ دنیا میں اب کوئی ایسا شخص نہیں رہا جس سے ملنے کا میں تمہیں مشورہ دے سکوں آج دنیا ایسی ہستیوں سے خالی ہو چکی ہے لیکن۔۔۔لیکن آج کل وہ نبی آنے والا ہے۔'' یہ بات کہتے کہتے پادری کی آنکھوں میں شوق کی آگ میں پگھلے ہوئے دو آنسو تیرنے لگے۔ جیسے اس آنے والے کے ذکر نے اس کی روح کے لطیف گوشوں کو چھو لیا ہو جس کی آمد کے اعلان سے دنیا بھر کے صحیفے گونجتے چلے آ رہے ہیں اور جس کے لئے عیسائیت سب سے زیادہ گوش برآواز تھی۔

''کون سا نبی۔۔۔؟ کون سا نبی؟؟ اے مسیحی بزرگ! والہانہ شوق میں حضرت سلمان نے سوال کیا۔

''جو ریگستان عرب سے اٹھ کر دین ابراہیم میں زندگی کی نئی روح دوڑائے گا''۔ پادری کہہ رہا تھا اور اس کے ڈوبتے ہوئے دل کی بے قرار دھڑکنیں اس کے لفظ لفظ میں وجد کر رہی تھیں۔ جو کھجوروں والی بستی کی طرف ہجرت کرے گا۔۔۔ جو ہدیہ قبول کرے گا۔۔۔مگر صدقہ اپنے لئے حرام سمجھے گا۔۔۔اور۔۔۔اور۔۔۔جس کے دونوں

شانوں کے درمیان مہر نبوت ہوگی دیکھو اگر تم اس سے مل سکو تو ملنا۔۔۔ضرور ملنا۔۔۔''

کیسی حیات انگیز تھی یہ دم توڑنے ہوئے اسقف کی پرسوز آواز! یہ بات کوئی ان سلمان کے دل سے پوچھتا جو ایک گھٹا ٹوپ اندھیرے میں کھڑے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر روشنی کی کرن ڈھونڈ رہے تھے پادری کے ان الفاظ سے اس گہری تاریکی میں جگنو سے چمکے۔ پادری خدا کے پاس چلا گیا اور حضرت سلمان فارسی ان جگنوؤں کی روشنی میں اپنے خدا کو ڈھونڈتے ہوئے عرب جا پہنچے۔

لیکن حقیقی خدا کے سنگ آستان تک پہنچنے سے پہلے انہیں انسانی غلاموں کی ایک اور کڑی آزمائش جھیلنی تھی وہ مدینے میں ایک یہودی کے دام غلامی میں پھنس گئے۔ مگر غلامی کی صعوبتوں میں گرفتار ہو کر جب انہوں نے دیکھا کہ وہ کھجوروں والی سرزمین پر آ پہنچے ہیں تو بے اختیار انہیں اپنے پیروں میں پڑی ہوئی غلامی کی بیڑیوں پر بھی پیار آنے لگا۔ غلامی کے تمام دکھ بھرے احساسات اس ایک امید حسین میں جذب ہو کر رہ گئے کہ وہ آنے والا ضرور اسی راہ سے گزرے گا۔ وہ بھول گئے تھے کہ ان کی گردن میں پڑا ہوا انسانی غلامی کا آہنی طوق کس کس طرح گھائل کر رہا ہے انہیں تو کسی کا بہت ہی پرشوق انتظار تھا۔ کسی سے ملنے کی آس تھی اور یہی انتظار و امید کی قوت انہیں مجبور کر رہی تھی کہ وہ جینے کی آرزو کریں خوشی اور امید کا ایک جذبہ نامعلوم کبھی ان کی آنکھوں سے آنسو بن کر ٹپکنے لگتا تو کبھی ہونٹوں پر ہنسی بن کر چمکتا اور کبھی وہ بالکل چپ ہو کر خود اپنے دل کی آواز سننے لگتے۔

وہ خدا کے آخری رسول کی راہ تک رہے تھے۔

صبح کو سورج مشرق سے سر نکالتا تو دیکھتا کہ سلمان فارسی اسی ہستی کی راہ تک رہے ہیں جس کی آمد کی اس قدر یقینی خبر خدا کی کتابیں زمانوں سے زمانوں کی طرف نشر کرتی آ رہی ہیں۔ دن بھر وہ اسی انتظار میں کھوئے ہوئے یہودی آقا کے باغ میں کام کیا کرتے۔ یہاں تک کہ شام کا دھندلکا چھا جاتا اور پھر اس جذب انتظار کا حسین منظر دیکھنے کے لئے بے شمار ستارے آسمان کی بلندیوں سے زمین کی طرف جھانکتے ہوئے محسوس ہوتے تاروں کی چھاؤں میں یہ عجم کا خانہ بدوش انسان عرب کی فضاؤں میں نالہ نیم شبی کا

سوز و گداز پھیلا رہا تھا۔

غلامی نے ان کو پابجولاں بنا چھوڑا تھا۔ ان کے لئے یہ بھی ممکن نہ تھا کہ دل جس کو شب و روز ڈھونڈ رہا ہے پاؤں بھی اس کی کھوج میں صحرا نوردی کا لطف لے سکیں انہیں کیا خبر تھی کہ جس ہستی کی انہیں تلاش ہے وہ مکے میں دنیا کے سامنے طلوع ہو چکی ہے اور جن قدموں پر عقیدت و سپردگی کے آنسو ٹپکانے کے انتظار میں وفور ضبط سے ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں انہیں کے قدموں پر طائف میں انسانی درندے بے رحمانہ پتھراؤ کرنے میں مشغول ہیں اور وہ محبوب ہستی ریگ زار کے ذروں پر اپنے پاکیزہ لہو کی لکیریں بناتی ہوئی گمراہوں کے لئے سیدھی راہ کے مٹے ہوئے نقوش اجاگر کرتی جا رہی ہے۔

ہائے وہ مکمل بے خبری اور بے بسی کا عالم اور پھر انتظار۔۔۔ جتنا جان گداز تھا اتنا ہی جاں نواز بھی تھا۔ انتظار ان تھک انتظار۔۔۔ مسلسل انتظار! سنسنی خیز۔۔۔ حیات انگیز!

آخر یہ عرصہ انتظار پایہ تکمیل کو پہنچ ہی گیا۔ اس دن وہ درخت پر چڑھے ہوئے اپنے کام میں جتے ہوئے تھے اور ان کا یہودی آقا پیڑوں کی چھاؤں میں بیٹھا نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ کہ اچانک اس کا چچا زاد بھائی ہانپتا ہوا باغ میں داخل ہوا جیسے اس کے پاس مدینے کی تاریخ کی سب سے بڑی خبر رہی ہو۔

''خدا بنو قبیلہ کو غارت کر دے۔ آتے ہی وہ نفرت اور جوش سے بھرے ہوئے لہجہ میں چلایا۔ سب کے سب قبا میں ایک شخص کو گھیرے ہوئے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ شخص جو مکہ سے یہاں آیا ہے خدا کا رسول ہے۔''

درخت پر چڑھے ہوئے سلمان فارسی کے کانوں میں جونہی یہ آواز پہنچی وہ بھول گئے کہ میں کہاں ہوں کیا کر رہا ہوں ان کے دل کی تیز دھڑکن ان کے کانوں سے ٹکرانے لگی اور خون کی تیز گردش نے ان کے سارے وجود کو سنسنا کر رکھ دیا۔ وہ درخت سے اس طرح اترے جیسے کوئی درخت سے گر پڑا ہو۔

تم۔۔۔ تم لوگ۔۔۔ کیا کہتے ہو؟۔ نیچے آتے ہی انہوں نے بے تابانہ سوال

کیا اور ان کا سانس درخت سے زمین تک پہنچنے میں اس بری طرح پھول گیا تھا کہ جیسے وہ ہزاروں میل اور سینکڑوں ماہ کا سفر طے کر کے آ رہے ہوں۔

خدا کے پاس سے کوئی آیا ہے!۔ میرے خدا کے پاس سے کوئی آیا ہے۔۔۔ آخر کون ہے وہ؟۔۔۔ کہاں ہے وہ۔۔۔؟ حضرت سلمان فارسی کا دل دھک دھک کرتا ہوا اندر ہی اندر یہ سوالات کر رہا تھا۔ مگر سلمان جذب و جنوں کی سنسنی خیز کیفیت میں ڈوبے ہوئے بس اتنا ہی اپنے آقا سے پوچھ سکے تھے۔

تم۔۔۔ تم لوگ کیا باتیں کر رہے ہو؟۔

یہودی نے چونک کر غلام کی یہ کیفیت دیکھی اور اس بے تحاشہ مداخلت پر بری طرح جھلا اٹھا۔ خبردار! غضبناک ہو کر یہودی نے حضرت سلمان فارسی کے ایک گھونسہ مارتے ہوئے کہا۔ ''تم! کون باتوں سے غرض؟۔'' جاؤ اپنا کام کرو لیکن وہ پاکیزہ روح جو خدا کی غلامی کے لئے بے قرار تھی انسانی غلامی کے اس آہنی گھونسہ سے پسپا ہونے والی کہاں تھی۔ پہلی ہی فرصت میں حضرت سلمان عموریہ کے مرحوم اسقف کی بتائی ہوئی علامتوں کو جانچنے کے لئے گھر سے نکل کھڑے ہوئے اور صدقہ کی کھجوریں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیں۔ یہ دیکھ کر کہ صدقہ کی وہ کھجوریں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود نہیں کھائیں بلکہ دوسروں کو بھی کھلا دیں۔ حضرت سلمان کی آنکھوں میں خوشی اور کامیابی کے چراغ روشن ہو گئے۔ دوسرے دن وہ ہدیہ کے طور پر کچھ کھجوریں لئے ہوئے خدمت رسول میں باریاب ہوئے اور ہدیہ قبول کر لیا گیا۔ یہ کھجوریں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود بھی کھائیں اور دوسروں کو کھلائیں۔ دو علامتیں صحیح نکل چکیں تو تیسری علامت کے لئے حضرت سلمان بے قرار سے بے قرار تر ہونے لگے۔ جس دن مہر نبوت کی تیسری علامت بھی ان کی آنکھوں کے سامنے آ گئی اس دن حضرت سلمان فارسی خوشی سے بے قابو ہو کر جھکے اور بے اختیار اپنے پرشوق گرم گرم ہونٹوں سے مہر نبوت کو بے تابانہ چوم بیٹھے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مڑ کر دیکھا تو سلمان خوشی کے مارے پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔ کتنا بلند تھا وہ انسان جس نے مہر نبوت کو چوم کر کلمہ پڑھا تھا اور کیسی خوش

نصیب تھیں وہ آنکھیں جو آنسوؤں کی آڑ میں سے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھوں سے چار ہوئیں۔

سامنے تو آؤ! حضور صلی اللہ علے وآلہ وسلم نے جاں نواز تبسم کے ساتھ حضرت سلمان کو اپنے قریب کرلیا اور تمام صحابہؓ اس عجیب صورت حال کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو گئے۔

حضرت سلمان فارسی نے ان سب کے سامنے اپنی کہانی بیان کی کہانی ختم ہو چکی۔ نہ جانے کتنی آنکھیں ۔۔۔عقیدت اور ایمانی رشک سے بھیگی ہوئی آنکھیں اس تاریخی مسلمان کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں جس کو عیسائیت نے اسلام کے پاس بھیجا تھا۔ جو دو مذاہب اور دو مختلف زمانوں کے درمیان ایک تاریخی کڑی اور ایک تاریخی پل کی حیثیت رکھتا تھا جس کی زندگی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کا ایک تاریخی ثبوت تھی۔

آہ وہ انسان جو حق کا ایک دعویٰ بھی تھا اور دعوے کا ثبوت بھی۔

یوں تو وہ خدائے واحد۔۔۔خدائے حقیقی کا سنگ در اپنے بے قرار سجدوں سے چھوتے ہی دنیا بھر کی غلامیوں کی لعنت سے ہمیشہ کے لئے آزاد ہو چکے تھے۔ لیکن اس یہودی کی عہد غلامی کی ایک رسمی سی زنجیر ان کے پاؤں میں ابھی تک پڑی ہوئی تھی یہ زنجیر خود خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہ نفس نفیس اپنے ہاتھوں سے کاٹ دی۔ آپ نے حضرت سلمانؓ سے کہا کہ وہ اپنے یہودی آقا سے آزادی حاصل کرنے کا معاہدہ کر لیں۔ چنانچہ یہ بات طے پا گئی کہ جس دن وہ کھجوروں کے تین سو درخت لگا دیں گے اور چالیس اوقیہ سونا پیش کر دیں گے اسی دن سے وہ یہودی کی غلامی سے آزاد سمجھے جائیں گے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے یہ درخت لگانے کے لئے حضرت سلمانؓ کے ساتھ باغ میں کام کیا اور جب ہدیہ کے طور پر ایک دن کچھ سونا آیا اور وہ ٹھیک چالیس اوقیہ نکلا وہ سونا بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت سلمانؓ فارسی کو پیش کر دیا۔ خدا کی رحمت سے دونوں شرطیں پوری ہو گئیں اور اللہ کا غلام اللہ والوں کی صفوں میں

آزادانہ شامل ہو گیا۔

اپنے گرم گرم آنسوؤں سے اپنی سجدہ گاہ کو تر رکھنے والا بندۂ مومن شہادت حق کے لئے بے تاب ہو کر سب سے پہلے جس جہاد میں شامل ہو سکا وہ غزوہ احزاب کا وہ تاریخی معرکہ تھا جو صرف اسی بندۂ حق کی برکت سے غزوہ خندق کے نام سے تاریخ میں مشہور ہوا۔ ایک معرکہ حق و باطل جہاں عرب کی تمام باطل قوتیں سر جوڑ کر اور کاندھے سے کاندھا ملا گرجتی کڑکتی گھٹاؤں کی طرح امڈتی آ رہی تھیں۔ جہاں ۲۴ ہزار خون آشام دشمن اسلام کے خلاف متحدہ محاذ بنا کر آئے تھے۔ وہاں خدا نے اپنے ایک بندے حضرت سلمان ہی کے دل کو اس تجویز کے القا کے لئے منتخب کیا جس کے نتیجے میں باطل کی یہ طوفانی یلغار آگے بڑھنے کی بجائے تھک ہار کر الٹے پاؤں لوٹ گئی۔ عرب کی تاریخ میں پہلی بار یہ خندق کھود کر دشمن کی پیش قدمی روک دینے کی جنگی تدبیر تھی۔ جس کا مشورہ حضرت سلمان فارسیؓ ہی نے دیا تھا اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فوراً قبول کر لیا تھا۔

حضرت سلمان فارسیؓ کی تجویز کے مطابق جب اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دس دس گز زمین کا قطعہ مجاہدوں کی مختلف ٹکڑیوں میں تقسیم کر رہا تھا جب جہاد عزیمت کی مقدس فضا میں رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولولہ انگیز درد بھری آواز اس طرح ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔

میرے اللہ!۔۔۔زندگی تو بس آخرت ہی کی زندگی ہے تو ان سب کو بخش دے جنھوں نے اپنا گھر بار چھوڑا اور ان کو بھی جنھوں نے تیرے ان بے سروسامانوں کے لئے نصرت و اخوت ایمانی کے پرشوق بازو پھیلائے۔

جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس وجد انگیز پکار کے جواب میں تمام صحابہ کرامؓ تمام مہاجر و انصار جوش و خروش میں چیخ اٹھے تھے۔

''ارے ہم ہیں وہ لوگ جنھوں نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ پر یہ عہد کیا کہ جب تک جان میں جان باقی ہے ہم راہ مولا میں جہاد کرتے رہیں گے۔'' ہاں۔۔۔ٹھیک اسی ولولہ انگیز موڑ پر یہ بحث بھی گرم تھی کہ فارس والے سلمانؓ ہم میں

سے کس کے ہیں؟۔

''سلمان ہمارے ہیں۔'' مہاجرین نے کہا۔

''سلمان تو ہمارے ہیں'' انصار نے تابانہ صدا بلند کی۔

''سلمان تو ہمارے ہیں۔'' خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پکار اٹھے۔ سلمان تو ہمارے ہیں۔ ہمارے اپنے گھر کے آدمی ہیں۔

ان الفاظ کی صحیح قدر و قیمت کچھ وہی لوگ سمجھ سکتے تھے جو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاک پا سے نسبت رکھنے کے مقابلہ میں دنیا کے شاہی خزانوں پر بے جھجک ٹھوکر مار سکتے تھے۔ جذبات کی کیا کیفیت ہو گی اس سینے میں جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنا اور اپنے گھر کا آدمی فرما رہے تھے۔ حضرت سلمان فارسیؓ کی روح یقیناً وجد کر رہی ہو گی جب سیکڑوں روشن آنکھیں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان الفاظ کے بعد ان کے عظیم وجود پر رشک و عقیدت سے جم کر رہ گئی تھیں۔ ہائے یہ الفاظ جن کے لئے ہزار بار ایک مومن گھر بار لٹا سکتا ہے اس عمر بھر کے دکھ درد کی کیسی اچھی قیمت ملی جو سالہا سال سے حضرت سلمانؓ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تلاش میں ہنستے کھیلتے چلے آ رہے تھے۔

اور حق یہ ہے کہ اس نعمت عظمیٰ کی قدر و قیمت حضرت سلمانؓ نے جی جان سے پہچانی۔ انہوں نے پوری زندگی سمیٹ کر ان قدموں پر لا ڈالی کہ جو قدم جدھر اُٹھ گئے، ادھر خدا کی جنت کا راستہ بن گیا۔ آپ نے سچ مچ اپنے آپ کو رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں فنا کر دیا تھا۔ جلوت و خلوت کے اس جان نواز کیف نے جو حضرت سلمانؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معیت میں جی بھر کر لوٹ رہے تھے انہیں شمع رسالت کا پروانہ بنا دیا تھا۔ آہ وہ تقرب جو ہر لحہ بڑھ رہا تھا۔ ہائے وہ نزدیکی جو ہر ساعت ترقی پذیر تھی۔ جہاں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب و نظر کی چھاؤں میں حضرت سلمانؓ حیات و موت اور دنیا و آخرت کے راز سمجھنے اور سمجھ کر ان کو اپنی زندگی بنا دینے میں شب و روز غرق تھے۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ یہ کیسا عجب عالم تھا کہ حضرت سلمان فارسیؓ کا تقرب خاص اس حد کو پہنچ چکا تھا۔ کہ رات گئے اس قدر دیر تک انہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس

دیکھ کر کبھی کبھی ہمیں یہ اندیشہ ستانے لگتا کہ کہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم سے غافل نہ ہو جائیں۔

اور شبانہ روز کا یہ روحانی استفادہ حضرت سلمانؓ کو آخر ان عرش بوس منزلوں تک لے اڑا تھا جہاں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا کے الفاظ میں خدا کی جنت کو حضرت سلمانؓ کا پر شوق انتظار تھا۔ اور جو خدا کے ان محبوب بندوں میں شامل ہو چکے تھے کہ جس سے وہ خفا ہو جائیں۔ خدا بھی ان سے خفا ہو جائے۔

غزوۂ خندق کے بعد ہر ایک جہاد میں انہوں نے بیتابانہ جست کی اور خدا کے قدموں پر سر نیاز نذر کر دینا چاہا۔ تلواروں کی چھاؤں میں جہاد عزیمت کی وہ ولولہ انگیز نماز پڑھتے رہے اور تیروں کی آندھیوں نے دیکھا کہ وہ اذان حق بلند کر رہے ہیں۔ کیسی پیاری تھی وہ زندگی جو اپنے خدا سے جا ملنے کے شوق میں ''موت'' کو ڈھونڈتی پھرتی تھی۔ اسی طرح شہادت کی تڑپ میں ان کا یہ ''رقص بسمل'' عہد رسالت سے عہد فاروقی تک برابر جاری رہا۔ اسی دوران میں خود ان کے اپنے وطن ایران میں بھی جنگ برپا ہوئی۔ مگر خدا کے حریم قدس کو اپنا ماویٰ و ملجا اور اپنی منزل شوق بنا لینے کے بعد اب دنیا میں کوئی ایک ان کا وطن نہ تھا۔ وہ عرب کی اسلامی صفوں سے عجم کے کفر و شرک کے خلاف ننگی تلوار چلاتے ہوئے نکل رہے تھے ہاں ''تلوار'' سے اپنے ارباب وطن کی قسمت کا فیصلہ کرنے سے قبل انہوں نے یہ بھی اپنا مومنانہ فرض سمجھا کہ دل کی پر سوز دھڑکنوں اور زبان کی ایمان افروز جنبشوں سے ایرانی کفر کے جمود کو توڑ دینے کی دردمندانہ کوشش کر دیکھیں۔

کبھی میں تمہارا ہم قوم تھا۔ فارس والوں کو حضرت سلمانؓ نے محاذ جنگ سے پکار سنائی لیکن خدا نے اس دولت سے نوازا ہے جس کا نام ''اسلام'' ہے یاد رکھو! تم اب یا عربوں کے غلام بنو گے یا خدا کے غلام! خدا کی غلامی قبول نہیں ہے تو پھر عربوں کی حلقہ بگوشی سے بچ کر تم نہ جا سکو گے۔۔۔ ہاں آؤ! اللہ کے غلام بن کر اللہ والوں سے آملو۔ ایسا کرو گے تو دنیا میں یہ انعام ہے کہ عربوں جیسے حقوق تمہیں حاصل ہوں گے۔ ورنہ پھر ذمیوں کی زندگی بسر کرنا تمہاری تقدیر بنا دیا جائے گا۔

قوم نے اپنے ایک ہم قوم کی یہ نوائے دردمنی اور اثر قبول نہ کیا۔ حضرت سلمانؓ تمام حجت کر چکے تو ایمانی غیرت سے جوش میں آ گئے۔

''اب ان بدنصیبوں کی قسمت کا فیصلہ تلوار سے کر دیا جائے۔ خاک وخون کے تمام رشتوں پر ایمانی قوت نے بزن بولتے ہوئے کہا۔

حضرت سلمان فارسیؓ محسوس کرتے تھے کہ دولت ایمانی پا جانے کے بعد وہ دنیا جہاں کی ہر قیمتی شے سے بے نیاز ہو چکے ہیں خدا ان کا ایسا سہارا تھا کہ جس کے بعد کسی دوسرے سہارے کا تصور کرنا بھی انہیں اپنے ایمان ویقین کی بدترین توہین محسوس ہوتا تھا۔ وہ تو ''اسلام'' کو پانے کے لئے اپنا سب کچھ بے دریغ نثار کر چکے تھے۔ پھر جب ''اسلام'' کو وہ پا گئے تو ان کی سپردگی اور جان نثاری کا کیا عالم ہوگا۔ حق یہ ہے کہ یہ بات محض سہنے کی ہے کہنے کی نہیں۔

اس دنیا میں ایک رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات تھی جس سے ان کی روح وجاں کا والہانہ تعلق قائم تھا۔ اس کے علاوہ دنیا کی ہر شے سے جیتے جی ان کے قلب وروح کا تعلق ٹوٹ کر خدا کے تعلق میں جذب ہو چکا تھا۔ اسی لئے وہ اس دنیا میں صرف دو جگہ نظر آتے تھے اور کہیں نہیں، یا تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قربت میں وہ اللہ کی باتیں سنا کرتے یا خدا سے جا ملنے کی تڑپ انہیں اشک آلود مصلّے اور خونریز جنگی میدانوں کی طرف کشاں کشاں لئے پھرتی تھی۔ خدا سے ملنے کے لئے وہ آدمی کس قدر بیکل اور بے قرار رہا ہوگا جس کے دل پر یہ تصور بھی شاق تھا کہ وہ دنیا میں اپنا کوئی گھر بنانے کی بات بھی سوچے۔ یہ دنیا جو مومن کے لئے واقعی ایک پردیس ہے حضرت سلمانؓ اس میں ہمیشہ ہی ایک خانہ بدوش پردیسی بن کر رہے۔ دنیا میں قبر ہی وہ واحد گھر تھی جہاں پہنچنے کی آرزو انہیں تھی۔

''ہمارا جی چاہتا ہے کہ ہم آپ کا اپنا گھر تعمیر کرا دیں۔'' حضرت حذیفہؓ نے حضرت سلمانؓ سے کہا۔

''جی نہیں!'' حضرت سلمانؓ نے روک دیا۔ کیا میرے لئے بھی ایسا ہی گھر بنانا چاہتے ہو جیسا تم نے اپنے لئے مدائن میں بنوایا ہے؟'' ''نہیں، نہیں! حضرت حذیفہؓ نے جلدی سے تردید کی۔ ہم تو آپ کے لئے بانس کا ایسا مکان بنوائیں گے جس کی چھت خس و خاشاک کی ہوگی جو صرف اتنا ہوگا کہ آپ کھڑے ہوں تو آپ کا سر اس کی چھت کو لگے اور لیٹیں تو دونوں پہلوؤں کی دیواریں چھو رہی ہوں۔''

ایک ایسے مکان کی تجویز حضرت سلمانؓ کو بہت ہی پسند آئی۔ ان کا خیال تھا کہ ایک سرائے فانی میں ایک مسافر کو ایسا ہی مکان چاہیئے۔

تم نے حذیفہؓ وہ خوشی سے مسکراتے ہوئے بولے۔ ''بھئی تم نے میرے دل کی بات پالی۔'' اللہ اللہ! کیسے سادہ دل اور سادہ لوح تھے یہ تیرے بندے!!

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جو حضرت سلمانؓ کا بے حد احترام کرتے تھے ان کو مدائن کی گورنری پر مامور کیا۔ انہوں نے امارت کے تمام فرائض کو پوری طرح انجام دیا لیکن وہ فقر و غنا کی دولت سینے سے چمٹائے رہے۔ وہی تنگ اور چھوٹی سی عبا!۔۔۔ وہی جانگھیہ زیب تن رہا جس سے پنڈلیاں کھلی رہتیں۔ اور وہی گدھا ان کی محبوب سواری تھا جس پر نہ کبھی گورنری سے پہلے زین لگی اور نہ اس کے بعد، ایسا بھی ہوا کہ اپنے امیر کو اس حالت میں دیکھ کر بچے ان کے پیچھے لگ گئے اور فوجیوں سے ہنسی ضبط نہ ہو سکی مگر یہ کہاں ہوا اور کیسے ہو سکتا تھا کہ حضرت سلمانؓ انسانی پسند و ناپسند کا لحاظ کر کے فقر کا وہ لباس اتار پھینکے جو اللہ کے عشق اور آخرت کے جذب وجنوں نے انہیں اپنے ہاتھ سے پہنایا تھا۔ کبھی کبھی بات اس سے بھی آگے بڑھ جاتی اور لوگ انہیں غلط فہمی سے مزدور سمجھ کر اپنا بوجھ ان کے اوپر لاد دیتے۔ لیکن اللہ کا وہ سادہ دل بندہ ٹھیک ایک خادم اور ایک خدا کے غلام کی طرح خدا کے بندوں کی یہ خدمت بھی انجام دے دیتا اور جبیں ایک شکن سے بھی یہ ظاہر نہ ہونے دیتا کہ میں مزدور نہیں اس علاقہ کا گورنر ہوں۔

''ذرا میرے جانور کا گھاس چارہ گھر تک پہنچا دو۔'' کسی نے ایک دن گھاس کا ڈھیر ان کے سر پر رکھتے ہوئے کہا بلا تکلف انہوں نے وہ ڈھیر سر پر اٹھا لیا اور اس آدمی کے ساتھ ہو لئے بیچ راہ میں پہچاننے والوں نے ان کو پہچانا اور یہ بوجھ اٹھانے کے لئے

لپکے اور اس شخص کو برا بھلا کہنا شروع کیا تو حضرت سلمانؓ جواب تک چپ چاپ چلے جا رہے تھے پکار اٹھے۔

''نہیں نہیں!'' میں نیت کر چکا ہوں کہ یہ بوجھ گھر تک پہنچا کر دم لوں گا۔ اب یہ بوجھ گھر آنے سے پہلے میرے سر سے نہ اترے گا۔

مجھے معاف کر دیجئے وہ آدمی گڑگڑاتے ہوئے بولا اب زحمت نہ اٹھایئے۔

نہیں نہیں۔ حضرت سلمانؓ نے اس کو تسلی دی اس میں میرے لئے نیت کا ثواب ہے۔

نیت کا یہ اجر ہی وہ چیز تھی جو ان کو ۲۴ ہزار آدمیوں کا خدمت گار بنائے ہوئے تھی جن پر حکومت کرنے کا شاندار موقع خدا نے انہیں دیا تھا وہ تو اس خدمت کا حق خدمت بھی اپنے اوپر صرف کرنے کو اپنا اخروی نقصان تصور کرتے تھے۔ اپنی پوری تنخواہ وہ دوسروں پر خرچ کرتے اور خود چٹائی بن بن کر اپنا پیٹ پالتے تھے۔ ان کا جی چاہتا تھا کہ وہ اپنی پوری مزدوری اپنے خدا کے دست خاص ہی سے قبول کریں۔

کیسا حسین تھا وہ ''فقر'' جو ''مسند اقتدار'' سے بھاگنے کے بجائے اس مسند پر بوریا نشینی کے مزے لے سکتا تھا! کیسا مقدس تھا وہ ایمانی توازن جس کی برکت سے انسان نے رہبانیت اور لذت پسندی کے درمیان جینا سیکھا اور سکھایا۔ حضرت سلمانؓ نہ راہب تھے اور نہ لذت پسند۔۔۔ وہ تو مومن تھے جو آخرت بنانے کی دھن میں خود کو پیوند خاک بنا لینے کے باوجود اس خاکدان ارضی کو ڈھانے کے بجائے سدھارنے پر کمربستہ رہتا ہے۔ جس کے زہد و تقدس کے آنسوؤں سے زندگی کے پھول مسکراتے ہیں اور حیات دنیا کی تاریک محفلوں میں چراغاں ہوا کرتا ہے جو دنیا کے گیسو سنوارتا ہے۔ مگر خود ان گیسوؤں کا اسیر نہیں ہوتا۔ جو دنیا سے فرار کو خودکشی سمجھتا ہے مگر موت آنے سے پہلے دنیا میں رہتے ہوئے اس طرح دنیا کو چھوڑ چکا ہوتا ہے کہ موت آتی ہے تو دنیا میں محض اس کا جسم ہی باقی ہوتا ہے۔ دل و روح تو پہلے ہی خدا کے پاس جا چکے ہوتے ہیں۔

خدا کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ سے مدینے میں جب خون

رنگ و نسل کے بجائے عقیدہ و ایمان کی بنیادوں پر اخوت و قرابت کا محل کھڑا کیا جا رہا تھا تو حضرت سلمانؓ فارسی اور حضرت ابودرداؓ کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھائی بھائی بنا دیا۔ یہ بھائی ان کو اپنے حقیقی ماں باپ اور بہن بھائیوں سے زیادہ پیارا تھا۔ انہوں نے حق کی تلاش پر خون کے تمام رشتے قربان کر دیئے تھے۔ اس ایمانی اخوت کے رشتے میں تو ان کی جان اٹکی ہوئی تھی اسی لئے وہ بڑی پابندی سے اپنے ایمانی بھائی ابودرداؓ کے گھر آتے جاتے رہتے تھے۔

یہ تم نے کیا حال بگاڑ رکھا ہے اپنا؟۔ ایک دن حضرت سلمانؓ نے حضرت ابودرداؓ کی اہلیہ کی زیب و زینت کو اجڑا ہوا دیکھ کر کہا۔ آخر کس کے لئے بناؤ سنگھار کروں؟۔'' وہ بولیں تمہارے بھائی کو دنیا کی ضرورت ہی نہیں رہی۔۔۔''

یہ جواب پا کر حضرت سلمانؓ کا چہرہ اتر گیا حضرت ابودرداؓ کی ایسی کثرت عبادت ان کے لئے اچھی خبر نہ تھی جس کی وجہ سے وہ بیوی کے حقوق سے غافل ہو گئے ہوں۔ دل پر اس خبر سے جو چوٹ لگی تھی اس نے انہیں اس دن وہیں روک لیا وہ کچھ سوچ رہے تھے۔

کھانا لایئے۔ جیسے ہی حضرت ابودرداؓ گھر میں آئے حضرت سلمانؓ نے فرمائش کی۔

کھانا لایا گیا مگر وہی ہوا جس کی حضرت سلمانؓ کو توقع تھی حضرت ابودرداؓ روزے سے تھے۔

''معاف کرنا میں تمہارے ساتھ کھانا نہ کھا سکوں گا۔'' انہوں نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

''تو پھر میں بھی نہ کھاؤں گا حضرت سلمانؓ نے کہا اور ایک معنی خیز نظر حضرت ابودرداؓ کے اوپر ڈالی۔

رات کو بھی وہ اس دن وہیں قیام پذیر رہے۔ جس وقت حضرت ابودرداؓ تہجد کے لئے اٹھنے لگے حضرت سلمانؓ نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"کیا بات ہے؟" وہ چونک اٹھے۔

"بات یہ ہے کہ تم پر تمہارے رب، تمہاری ذرات اور تمہاری بیوی کا بھی حق ہے۔" حضرت سلمانؓ نے جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ "روزوں کے ساتھ افطار اور شب بیداری کے ساتھ سونا بھی ضروری ہے۔"

"ضروری ہے؟" حضرت ابودرداؓ نے حیرت سے پوچھا۔

اور پھر اس مسئلے میں دونوں میں دیر تک تبادلہ خیال ہوتا رہا۔ صبح کو دونوں بارگاہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں استصواب رائے کے لئے حاضر ہوئے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا۔

"ابودرداؓ۔۔۔ سلمانؓ تم سے زیادہ دین کی سمجھ رکھتے ہیں۔"

پھر وہ دور بھی آیا جب حضرت سلمانؓ عراق میں اور حضرت ابودرداؓ شام چلے گئے جہاں اللہ نے ان کو مال و اولاد سے نوازا۔ ان کو خیال گزرا کہ حضرت سلمانؓ جوان کی گھریلو زندگی اور خانگی رشتوں کی تعمیر سے بہت خوش ہوں گے۔ اس لئے انہوں نے حضرت سلمانؓ کو خط لکھا اور یہ خوشی کی خبر سنائی۔ اس خط کے جواب میں حضرت سلمانؓ نے بالکل دوسری بات کہی۔ یہ وہ موڑ تھا جہاں مومن کی فراست دنیا کی خوشی کا رخ غم آخرت کی طرف موڑ دیا کرتی ہے۔ انہوں نے عراق سے جواب میں لکھا۔

"سن لو۔۔۔! کہ مال و اولاد کی کثرت یا ارض مقدس میں رہنا سہنا کوئی خیر نہیں، بلکہ خیر یہ ہے کہ تم کوئی ایسا عمل کرو جو خود تمہاری ذات کے لئے نفع بخش ہو۔

رسالت کے عہد سے خلافت فاروقی تک کا عرصہ طویل وہ ٹھیک اسی شان سے بسر کرتے رہے کہ دنیا میں محض بدن پڑا ہوا تھا اور دل و جان کسی اور میں کہیں اور اٹکے ہوئے تھے انہوں نے فی الواقع زندگی ہی میں یہ سمجھ لیا تھا کہ آنے والی موت مجھے پہلے ہی آچکی ہے۔ آخر عہد عثمانی میں وہ روز عید سے ہمکنار ہوئے۔ جب موت آتی ہے اور بندے کو اس کے خدا تک پہنچا دیتی ہے ایک دن جس کے تصور ہی سے ایک کافر کی روح فنا ہوتی ہے۔ ایک دن جس کے خیال ہی سے مومن کی جان میں جان آجاتی ہے۔

مرض وفات میں حضرت سعدؓ ابن وقاص عیادت کے لئے آئے۔ ان کو دیکھ کر اچانک حضرت سلمانؓ پر گریہ طاری ہو گیا۔ حضرت سعدؓ سخت حیران ہوئے کہ موت کو قریب پا کر حضرت سلمانؓ جیسا آدمی رو کیوں رہا ہے؟

"اے ابو عبداللہ۔" حضرت سعدؓ نے حیرت اور افسوس کے انداز میں کہا۔ "رونے کی کیا بات ہے؟ ارے بھائی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تم سے قطعی خوش بہ خوش دنیا سے گئے اب تم ان سے حوض کوثر پر ملنے جا رہے ہو۔۔۔ بچھڑے ہوئے ساتھیوں سے ملاقاتیں ہوں گی۔"

"خدا کی قسم" حضرت سلمانؓ فارسی نے دردبھرا جواب دیا۔ "موت سے نہیں گھبراتا اور۔۔۔ اور نہ دنیا میں ٹھہرے رہنے کی ہوس ہے۔"

"پھر۔۔۔؟" حضرت سعدؓ کی حیرت دوبالا ہو گئی۔

سلمانؓ کی آنکھیں آنسوؤں سے چھلک اٹھیں ہچکیوں کے درمیان سے ان کی آواز لرزتی ہوئی اٹھی۔ "رونا تو یہ ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عہد کیا تھا کہ ہمارا توشہ ایک مسافر کے توشے سے بڑھنے نہ پائے۔۔ اور۔۔۔ اور حال یہ ہے کہ میرے گرداگرد اس قدر سانپ ہیں!!"

حضرت سعدؓ نے ایک دردبھری نظر حضرت سلمانؓ کی اشک ریز صورت پر ڈالی اور پھر پلٹ کر ان کے ان تمام دنیاوی ساز و سامان کا جائزہ لیا جس کو "سانپ" کہہ کر وہ اس طرح رو پڑے تھے۔ یہ سامان محض ایک بڑے پیالے ایک لگن اور ایک تسلے پر مشتمل تھا۔ حضرت سعدؓ نے سر جھکا لیا اور رونے والے کے ساتھ مل کر دیر تک روتے رہے مگر نہیں! یہ رونا تو بہترین ہنسنا تھا۔ وہ آنسو پانی نہیں آب حیات کے قطرے ہیں کہ جن سے دل و روح پر بہار آتی ہو جس سے ایمان و یقین شاداب ہوتے ہوں۔ جو جہاں ٹپک جائیں وہاں جنت کے باغ لہلہا اٹھتے ہیں۔ لوگ آرہے تھے اور جا رہے تھے، اور وہ مومن جو آخرت کے گھر کے لئے پا بر کاب موت کی گھڑیاں گن رہا تھا آنے والوں کے سینوں میں اپنا سوز بھرے دے رہا تھا۔ شمع کے بجھنے سے پہلے ایک بار پوری قوت سے بھڑک رہی

تھی۔ایک انسان مرجانے سے پہلے زندگی میں ابدی زندگی کا خون دوڑ رہا تھا۔

''تم میں سے جس سے ہو سکے اس کی کوشش کرے'' وہ رک رک کر دھیرے دھیرے کہہ رہے تھے۔کہ وہ حج ادا کرتے ہوئے۔۔۔عمرہ کرتے ہوئے۔۔۔خدا کی راہ میں تلوار چلاتے ہوئے یا پھر قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہوئے دم توڑے۔۔دیکھو!۔۔۔دیکھو! فسق و فجور اور خیانت و بے ایمانی کی حالت میں ہرگز نہ مرنا۔۔۔ہرگز نہ مرنا۔

آنسوؤں میں ابال آرہے تھے روتے روتے چہرے اس ایک چہرے پر جھکتے جا رہے تھے جہاں سے اس کی زندگی کی آخری آواز آرہی تھی اور دھیرے دھیرے ڈوبتی جا رہی تھی اچانک یہ ڈوبتی ہوئی آواز تیز ہوئی اور ایک بے قرار سی ہوک سنائی دی۔سب لوگ چلے جائیں۔۔۔سب لوگ ہٹ جائیں۔۔۔ہٹ جائیں۔اور فی الفور سب لوگ تعمیل حکم میں ذرا دیر کے لئے ہٹ گئے۔لوگ ڈر رہے تھے کہ شاید یہ پکار اس بات کا اعلان تھی کہ آخرت کے مسافر کا سفر تمام ہو رہا ہے۔زمین اور اہل زمین سے تعلق ٹوٹ رہا ہے اور آسمان والے بندۂ مومن کو لینے کے لئے آپہنچے ہیں تھوڑی دیر بعد لوگ اس خلوت گاہ میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ وہاں حضرت سلمانؓ کا ''جسم'' تو پڑا ہے مگر خود حضرت سلمانؓ اپنے مولا کے پاس تشریف لے جا چکے ہیں۔

''انا للہ وان الیہ راجعون.''

اور۔۔۔ہائے یہ الفاظ!

حیات و موت کی پوری دنیا میں تہلکہ ڈال دینے والے چند لفظ!

بڑی بڑی مغرور کھوپڑیوں کو پاش پاش کر دینے والے اور پتھر سے سخت تر دلوں کو آخرت کے لئے تڑپا دینے والے الفاظ!!

''انا للہ وان الیہ راجعون.''

آہ کیا ہم۔۔ہم بھی ان کا مطلب سمجھتے ہیں؟۔

ہم؟۔۔۔کہ جن کا دل اس وقت بھی دنیا میں اٹکا ہوتا ہے جب ہماری

پیشانیاں اللہ کے قدموں میں پڑی ہوتی ہیں۔

ہم۔۔؟۔کہ جو آخرت سے اس قدر دور جا پڑے ہیں کہ ویران قبروں کے کنارے کھڑے ہو کر بھی ہم دنیا ہی کی طرف دیکھتے رہتے ہیں۔جنازوں کو کاندھا دیتے ہوئے بھی ہمیں موت یاد نہیں آتی۔حیف! ہمیں اپنی موت یاد نہیں آتی۔

تو کیا ہم اندھے ہیں؟۔

نہیں!

کیا ہم بہرے ہیں؟۔

نہیں۔۔۔نہیں!

تو کیا ہم پاگل ہو چکے ہیں؟۔

نہیں۔۔۔نہیں۔۔۔ہرگز نہیں۔

اچھا تو کیا ہم مسلمان ہیں؟۔۔۔بولو!۔۔۔کیا ہم۔۔۔مسلمان۔۔۔ہیں؟

کون ہے جو اس کے جواب میں ''ہاں'' کہنے کے لئے تڑپ نہیں اٹھتا؟۔۔۔

مگر نہ جانے کیوں شرم و ندامت سے ہم زمین میں گڑنے لگتے ہیں اور ہماری آواز ہمارے حلق میں گھٹ جاتی ہیں۔

حضرت الحسین بن منصور الحلاج

حضرت ابو منعیت الحسین بن منصور الحلاج ۸۵۸ء میں پیدا ہوئے۔ حلاج کے معنی ہیں اون دھننے والا چونکہ وہ اسی پیشہ سے منسلک تھے، اس لئے منصور حلاج کے نام سے مشہور ہوئے۔ وہ عظیم صوفیائے کرام حضرت مثنورؒ، حضرت جنید بغدادیؒ اور حضرت امر مکیؒ کے شاگردوں میں سے تھے۔ انہوں نے کچھ عرصہ حضرت عمر بن عثمان المکیؒ کی صحبت میں بھی گزارا۔ آپ کی شادی حضرت یعقوب الاقطعیؒ کی دختر سے ہوئی۔ جس کے بعد بغداد شریف میں آپ حضرت جنید بغدادیؒ کی صحبت میں رہنے لگے۔ آپ نے تین مرتبہ حجاز مقدس کا بھی سفر کیا۔ اپنی زندگی میں انہوں نے سیوستان، کرمان، ہمزوز، ہندوستان اور چین کا سفر بھی اختیار کیا۔ وہ بیس سال تک ایک ہی لباس استعمال کرتے رہے۔

مذہبی تعلیم کے علاوہ سیر و سیاحت اور مشہور صوفیائے کرام کی صحبت میں آپ نے بہت فیض حاصل کیا اور بہت بڑا روحانی مرتبہ پایا۔ ان پر ایک بے خودی کا سا عالم طاری رہتا تھا۔ وہ یادِ الٰہی میں اس قدر کھو گئے کہ انہوں نے اپنے آپ کو بالکل بھلا دیا۔ اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس سے لو لگانے کا ہی نتیجہ تھا کہ وہ ہر وقت ''انا الحق'' کا نعرہ لگانے لگے انا الحق کے لفظی معنی ہیں ''میں سچ ہوں۔'' میں حقیقت ہوں مگر اس کے ایک اور معنی ''میں خدا ہوں'' بھی نکلتے تھے۔ اس بنا پر اس دور کے عالم ان کے خلاف ہو گئے اور کفر کے فتوے صادر کرنے لگے۔

خلیفہ وقت نے انا الحق کہنے پر حضرت منصور کو پھانسی پر لٹکا دینے کا حکم دیا۔ انہیں تین سو مرتبہ کوڑے لگائے گئے اور ہر کوڑے پر وہ یہی کہتے کہ منصور گھبرانے والا نہیں۔ سولی پر لٹکانے کے لئے ایک سٹیج بنایا گیا۔ جس کے آس پاس تقریباً ایک لاکھ کا مجمع ہو۔ حضرت

منصور نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اور پھر نعرہ لگایا، حق حق انا الحق (سچ، سچ میں سچ ہوں) حضرت منصور نے سولی پر چڑھنے سے پہلے کعبۃ اللہ کی طرف منہ کر کے فرمایا۔ یا اللہ! جو لوگ میرا تماشا دیکھنے آئے ہیں تو انہیں معاف فرما دے۔ تو مجھے سزا دینے والوں کو بھی معاف کر دے، اس لئے کہ تو نے جو کچھ مجھے دکھایا ہے اگر یہ لوگ وہ سب کچھ دیکھ لیتے تو پھر ایسی حرکت نہ کرتے۔ یہ راز کی باتیں بھلا وہ کیا جانیں۔

خلیفہ کے حکم پر حاضرین نے حضرت منصور پر سنگ باری کی۔ اس کے بعد ان کے ہاتھوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے گئے۔ پھر ان کے پاؤں کاٹ دیئے گئے۔ اس موقع پر حضرت منصور نے فرمایا کہ میں اس وقت بہت خوش ہوں۔ اس لئے کہ میرے چہرے پر شہادت کا غازہ مل دیا گیا ہے۔ اس کے بعد حضرت منصور کی دونوں آنکھیں نکال لی گئیں۔ زبان کاٹ دی گئی، ان کے جسم کا عضو عضو الگ کر دیا گیا۔ مگر ان کے ہر عضو سے ''انا الحق'' کی آوازیں آتی رہیں۔

حضرت منصور نے جو آخری الفاظ کہے تھے۔ وہ یہ تھے کہ لوگو! اگر تم خدا کو نہیں پہچانتے تو کم از کم اس کے نشان کو تو پہچانو! میں اس کا نشان ہوں۔ میں خدا کی سچائی ہوں۔ انا الحق کیونکہ میں ظاہری حقیقت ہی نہیں بلکہ اندرونی حقیقت بھی ہوں۔

جب حضرت منصور کو پھانسی گاہ کی طرف لے جایا جا رہا تھا تو ان کے خادم نے کہا کہ حضرت مجھے کوئی نصیحت فرمائیں۔ آپ نے فرمایا کہ اپنے نفس کے سامنے ہرگز ہتھیار مت ڈالنا۔ اسی طرح آپ کے فرزند نے جب اپنے لئے کوئی ہدایت طلب کی تو آپ نے فرمایا کہ دنیا ظاہری رسم و رواج کو دیکھتی ہے۔ مگر تم خدا کی خوشنودی کے لئے اس کی پرواہ نہ کرنا۔

حضرت منصور نے دینیات اور اصول قوانین پر بے شمار کتابیں تصنیف کیں۔ مشہور بزرگ حضرت فرید الدین عطارؒ نے فرمایا کہ یہ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ اس قدر عظیم صوفی کو کسی نے سمجھنے کی کوشش نہ کی۔ جب کوئی عظیم صوفی ایسے الفاظ کہتا ہے تو وہ خدا کی زبان سے کہتا ہے وہ خدا ہوتا ہے۔ جو صوفی کی زبان سے کہتا ہے صوفی کی ذات تو

ختم ہو جاتی ہے۔ ایک اور مشہور بزرگ حضرت شبلیؒ نے فرمایا کہ منصور اور میں ایک ہی نظریات رکھتے تھے۔ مجھے میری دیوانگی نے بچا لیا جب کہ منصور کو ان کی ذہانت اور ہوشیاری نے مروا دیا۔ انا الحق سے یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ وہ خود کو خدا کہتے تھے بلکہ وہ حقیقت میں خدا کو جان گئے تھے اور انہوں نے اسے پا لیا تھا۔

حضرت منصور کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے بعد اس کو جلا کر خاک کر دیا گیا اور پھر وہ خاک دریائے دجلہ میں بہا دی گئی۔

حضرت غوث الاعظمؒ

حضرت غوث الاعظمؒ بہت بڑے عالم دین اور صوفی بزرگ تھے۔ حضرتؒ کے والد کا نام حضرت سید ابو صالح موسیٰ جنگی دوستؒ تھا۔ نسب کے لحاظ سے حضرت غوث پاکؒ ماں باپ دونوں کی جانب سے حسنی اور حسینی سید تھے۔ یعنی ماں کی طرف سے نسب کا سلسلہ حضرت امام حسن تک اور باپ کی طرف سے حضرت امام حسین تک پہنچتا ہے۔ آپؒ کی والدہ بھی اللہ والی خاتون تھیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ آپؒ کی پیدائش سے قبل آپؒ کی والدہ نے خواب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیشانی بجلی کی طرح چمک رہی ہے۔ اسی وقت میں اللہ کا نور ہوں۔ کی آواز ان کے کانوں میں گونجنے لگی۔

آپؒ ۴۷۱ھ (۱۰۷۷ء) میں اتوار کی رات اور ماہ رمضان کی آخری تاریخ کو عراق کے ایک مقام گیلان یا جیلان میں پیدا ہوئے۔ دایہ کا نام سموسہ بنت جفان تھا جو حضرت ابوبکر صدیقؓ کی اولاد میں سے تھیں اور حضرت غوث پاکؒ کے والد کی مریدہ بھی تھیں۔ ماں باپ نے آپؒ کا نام سید عبدالقادر رکھا۔

حضرت غوث الاعظمؒ ابھی تین برس ہی کے تھے کہ ایک دن آپؒ کے والد کو یوسف گیلانی نامی ایک بزرگ نے اطلاع دی کہ ہرمز صفیان آپ لوگوں کو قتل کرنے کی فکر میں ہے۔ آپؒ کے والد گھر آئے اور اس سے پہلے کہ اپنی بیوی کو یہ خبر سنائیں، انھوں نے کہا لڑکا بار بار کہتا ہے کہ بغداد چلو۔ حضرت غوث الاعظمؒ کے والد بزرگوار اسی وقت گھر والوں کو لے کر بغداد روانہ ہو گئے۔

بغداد پہنچ کر آپؒ نے مولانا شمس الدین بن عماد الدینؒ سے دس برس تک تعلیم

پائی جو اس زمانے کے بہت بڑے عالم تھے۔ پھر اپنے والد کے ساتھ گیلان چلے آئے اور پانچ برس تک تعلیم حاصل کرتے رہے۔

آپ کے والد سید ابو صالح بن موسیٰ جنگیؒ نے ۱۱ ذی قعدہ ۴۹۹ھ کو جمعرات کے دن وفات پائی۔ اس وقت حضرت غوث پاکؒ کی عمر انیس برس کی تھی۔ باپ کی وفات کے بعد مزید تعلیم کی غرض سے آپؒ نے پہلے کعبہ شریف کی زیارت کی، پھر عراق کی راہ لی۔ اسی سفر میں چالیس دینار والا مشہور واقعہ پیش آیا۔

انیس برس کی عمر سے سینتیس سال کی عمر تک یعنی لگاتار اٹھارہ سال آپؒ برابر روزے رکھتے رہے۔ آپؒ کے حالات میں بار بار حضرت خضر علیہ السلام کی ملاقات کا ذکر ملتا ہے۔ خیال ہے کہ یہ وہی خضر علیہ السلام ہیں جن کا ذکر قرآن شریف میں آیا ہے۔

حضرت غوث الاعظمؒ جب بغداد میں مقیم تھے تو پہلی بار ان سے حضرت خضر علیہ السلام نے ملاقات کی اور کہا کہ میں خدا کے حکم سے آپ کی خدمت میں آیا ہوں۔ جو خدمت چاہیں مجھ سے لے لیں۔ آپؒ نے فرمایا کہ مجھے آپ سے کوئی کام نہیں اور نہ آپ کی ضرورت ہے۔ ۱۷ صفر ۵۱۱ھ کو حضرت ابو سعید ابن علی مخدومیؒ حضرت خضر علیہ السلام کے ساتھ کلاہ اور خرقہ لے کر بغداد کی جامع مسجد میں تشریف لائے اور جمعے کی نماز کے بعد حضرت غوث پاک کو خلافت عطا فرمائی۔ اس محفل میں تین بڑے بڑے اولیاء اللہ شریک تھے۔ مرشدؒ نے اس کے بعد خود کوفے کی اہ لی اور حضرت غوث نے رہنمائی کی خدمت اپنے ذمے لے لی۔ آپ کی ساری زندگی دینی کاموں میں بسر ہوئی اور آپؒ سے ان گنت کرامتیں ظاہر ہوئیں۔ آپؒ ایک مرتبہ وعظ فرما رہے تھے کہ بارش ہوئی اور لوگ آہستہ آہستہ کھسکنے لگے۔ حضرت غوث پاکؒ نے آسمان کی طرف نظر کی اور فرمایا کہ ''یا الٰہی میں لوگوں کو تیرے ذکر کے لیے جمع کرتا ہوں اور تو ان کو منتشر کر رہا ہے۔'' اسی وقت بارش رک گئی اور آپؒ اطمینان سے وعظ فرماتے رہے۔

حضرت غوث الاعظمؒ نے ۵۱۱ ہجری میں بی بی حلیمہ صغریٰ بنت سید یوسف سے شادی کی جو حضرت امام زین العابدین کی اولاد میں سے تھیں اور اسی روز سے آپؒ نے

خدا کے احکام کی تبلیغ اور تعلیم کا کام انجام دینے کا آغاز فرمایا۔ جو آخر دم تک جاری رہا۔ آپؒ نے ۱۷ ربیع الثانی ۵۷۱ھ (۱۱۷۶ء) کو جمعہ کے دن نماز سے پہلے انتقال فرمایا اور بغداد میں دفن ہوئے۔ غنیۃ الطالبین اور فتوح الغیب آپ کی مشہور کتابیں ہیں۔

شیخِ عالمؒ.

شیخ الشیوخ عالم حضرت خواجہ بابا فرید الدین گنج شکرؒ

شیخ الشیوخ عالم حضرت خواجہ بابا فرید الدین گنج شکرؒ ۵۷۱ھ میں قصبہ کوٹھی نزد ملتان شریف پیدا ہوئے، حضرتؒ کے والد بزرگوار کا نام شیخ جلال الدین سلیمان تھا۔ سلطان محمد غزنوی کے قریبی عزیزوں میں سے تھے۔ حضرتؒ کا سلسلہ عالیہ نسبی سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منسلک ہے۔ کہتے ہیں چنگیز خاں نے جب سلطنت غزنی کو تاخت وتاراج کیا تو حضرتؒ کے اجداد وعظام ہجرت کر کے لاہور تشریف لائے، قصور میں بھی رہے، آخر قصبہ کوٹھی (ملتان) میں مستقل قیام فرمایا، ان کے مزارات بھی اسی قصبہ میں، سرکاری طور پر عہدہ قضاۃ ان کے سپرد تھا۔ حضرت شیخ سلیمانؒ کے منجھلے فرزند تھے۔ حضرتؒ کی والدہ ماجدہ بھی بہت نیک دل خاتون تھیں، کہتے ہیں ان کی پیدائش سے چند ماہ پہلے ایک مرتبہ انہیں بیر کھانے کی خواہش ہوئی تو ہمسائیگی میں بیری کا ایک پیڑ لدا پھندا کھڑا تھا جب یہ بی ہمسائی کی اجازت کے بغیر بیر توڑنے کے لئے اٹھیں تو پیٹ میں شدید درد اٹھا جس سے اس ارادہ سے باز آئیں۔ چنانچہ وہ فخریہ کہتی تھیں کہ میں نے کبھی مشکوک مال نہیں کھایا۔ مگر ایک روز جب حضرتؒ نے بیری کا واقعہ یاد دلایا تو بہت متحیر ہوئیں، حضرتؒ مادر زاد ولی تھے جس شب پیدا ہوئے لوگوں کو رمضان المبارک کا انتظار تھا۔ سب کی نظریں آسمان پر لگی ہوئی تھیں مگر مطلع ابر آلود تھا۔ آخر ایک بزرگ نے لوگوں سے فرمایا کہ آج رات کو قاضی صاحب کے گھر ایک صاحبزادہ پیدا ہوگا جو اپنے زمانے کا قطب ہوگا۔ اگر اس نے صبح دودھ نہ پیا تو سمجھ لینا آج روزہ ہے ورنہ اگلے دن کا روزہ ہو گا۔ چنانچہ حضرتؒ نے بعد پیدائش دن بھر دودھ نہ پیا، اور بوقت افطار رجوع فرمایا۔

بیعت: صاحب سیر العارفین لکھتے ہیں کہ جب حضرتؒ ابھی کمسن تھے کہ مکتب میں بیٹھ گئے، تھوڑے ہی عرصہ میں کلام پاک حفظ کیا، بعد ازاں دیگر دینی علوم کی تحصیل میں مصروف ہو گئے، ایک روز ملتان شریف کی ایک مسجد میں کتاب نافع پڑھتے تھے کہ حضرت قطب الاقطاب خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ وہاں تشریف لائے اور ان سے پوچھا، ''صاحبزادے کیا پڑھتے ہو؟'' انہوں نے جواب دیا ''نافع'' حضرت قطب الاقطابؒ بولے ''انشاءاللہ نفع ہوگا۔''

حضرت خواجہؒ کو یہ بات بھا گئی، حضرتؒ کے ہاتھ پر بیعت کی اور پیرومرشد کے ساتھ دہلی جانے کی خواہش فرمائی، حضرت قطب الاقطابؒ نے فرمایا کہ ابھی آپ علم دین ہی سیکھیں اس لئے کہ جاہل اور بے علم زاہد شیطان کے پھندے میں آجاتا ہے۔ حضرتؒ پیرومرشد کے حکم پر ملتان سے قندھار پہنچے اور وہاں سے بخارا اور بغداد شریف بھی گئے۔ اور علوم حاصل کئے۔ شیخ شہاب الدین صاحب سہروردیؒ اور دوسرے مشائخ عالیہ کی صحبت سے بھی فیض یاب ہوئے، جب زیور تعلیم سے آراستہ و پیراستہ ہو گئے۔۔۔تو حضرتؒ پیرومرشد کی خدمت عالیہ میں حاضر ہوئے، حضرت قطب الاقطابؒ نے ان کی عبادت کے لئے ایک حجرہ مقرر فرمایا۔ اور چند یوم کی تربیت کے بعد جب یہ کامل ہو گئے تو خرقہ خلافت سے سرفراز فرمایا۔ مجلس میں اور بزرگ بھی تھے حضرت قبلہ نے فرمایا کہ شیخ کی ذاتی قوت اور تصحیح ایسی ہونی چاہیئے کہ جو کوئی اس کے پاس مرید ہونے کے لئے آئے تو قوت باطنی سے پہلے اس کے سینے کا زنگ اور کدورت صاف کرے پھر اس کا ہاتھ پکڑے اور خدا رسیدہ کر دے گویا یہ حضرت خواجہؒ کی طرف اشارہ تھا کہ انہیں کن خصوصیات کا حامل ہونا چاہیئے۔

گنج شکر: حضرت خواجہؒ ہفتے میں چھ روز عبادت و ریاضت میں رہتے اور ساتویں روز پیرومرشد کی زیارت کے لئے حجرہ سے باہر نکلتے، ایک مرتبہ انہوں نے چاہا کہ مجاہدہ زیادہ کریں، پیرومرشد نے فرمایا کہ پہلے روزہ طے کرو، جب غیب سے روزی پہنچے تو افطار کیا کرو، چنانچہ یہ صائم رہنے لگے تیسرے روز غیب سے روزی آئی اور روزہ افطار

کیا مگر تھوڑی دیر کے بعد قے ہو گئی۔

کئی روز یہی صورت پیش آئی، آخر پیرومرشد کو حالات سے مطلع کیا انہوں نے فرمایا، ''یہ عنایت حق سبحانہ وتعالیٰ ہے، اب چھ روز کے بعد افطار کریں۔'' چنانچہ چھ یوم کے بعد شدت کی بھوک لگی زمین پر ہاتھ مارنے لگے۔ ایک سنگریزہ ہاتھ میں آیا، منہ میں رکھا تو شکر ہو گیا۔ اسی وقت منہ سے نکال دیا، اور مرشد کا فرمان یاد آ گیا کہ جو غیب سے ملے اس سے روزہ افطار کرنا۔۔۔ تھوڑی دیر بعد سنگریزے اٹھا کر پھر منہ میں رکھ لئے وہ شکر ہو گئے۔ حضرت پیرومرشد کے پاس حاضر ہوئے اور حال گوش گذار کیا، وہ بولے جو غیب سے ہے نیک ہے آپ کا حال مانند شکر کے شیریں رہے گا۔ اس روز سے گنج شکر کا خطاب ہوا۔

حضرتؒ کے گنج شکر مشہور ہونے کی ایک یہ روایت بھی ہے کہ چند سوداگر شکر کے ٹھیلے لئے جا رہے تھے کہ حضرتؒ نے ان سے تھوڑی سی شکر طلب کی، انہوں نے جواب دیا یہ نمک ہے حضرت خواجہؒ نے فرمایا نمک ہی ہو گا۔ جب منڈی میں جا کر انہوں نے بوریاں کھولیں تو اندر سے نمک نکلا، سوداگر بہت پچھتائے اور حضرتؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر تائب ہوئے، حضرتؒ کی توجہ سے نمک پھر شکر ہو گیا،

کان نمک جہاں شکر شیخ برو بحر
آن کز و شکر نمک کندو از نمک شکر

اس ضمن میں یہ روایت بھی مشہور ہے کہ حضرتؒ کو ایام طفولیت ہی سے شرینی سے بہت رغبت تھی ان کی والدہ ماجدہ مصلے کے نیچے شکر پڑیہ میں باندھ کر رکھ دیتیں اور بعد فراغت نماز انہیں اٹھانے کو کہتی، ایک روز انہوں نے دیکھا کہ وہاں پڑیا کے بدلے مصری کی ڈلیاں رکھی ہیں۔ والدہ ماجدہ سے بولے آج آپ شکر رکھنا بھول گئیں تو اللہ پاک ہمیں بہت سی مصری دی ہے۔ الغرض حضرتؒ کی یہ مشہور کرامت تھی کہ مٹی کی ڈلی یا پتھر کا ٹکڑا جب منہ میں رکھتے تو وہ شکر ہو جاتا۔

سنگ در دست تو گہر کر دذ
زہر در دہن تو شکر کر دد

خلافت: روایت ہے کہ جن ایام میں حضرت خواجہؒ ہانسی میں مقیم تھے، حضرت قطب الاقطابؒ نے بوقت رحلت وصیت فرمائی کہ خواجگان چشتؒ کے مخصوص تبرکات حضرت گنج شکرؒ کے سپرد کئے جائیں گویا حضرتؒ کی خلافت کی تکمیل تبرکات خصوصی کے حصول پر ہوئی۔ اور یہ وہی تبرکات ہیں جو حضرت سلطان الہند خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ حضرت قطب الاقطابؒ کو سونپے تھے کہتے ہیں یہ تبرکات خرقہ، عصا، مصلیٰ اور چوبی نعلین پر مشتمل تھے۔ حضرت ان نعمت ہائے عظمیٰ کو لے کر ہانسی چلے آئے، وہاں سے لاہور اور ملتان پہنچے۔۔۔۔ اور قصبہ اجودھن کو اقامت گاہ مقرر فرمایا۔

ریاضت: حضرتؒ کا معمول تھا کہ ریاضت وعبادت کے لئے جنگلوں اور پہاڑوں کی طرف نکل جاتے، کہتے ہیں ایک روز پیاس کی شدت سے مجبور ہو کر ایک کنوئیں پر پہنچے تو وہاں رسی اور ڈول ندارد تھا۔ بہت گھبرائے ابھی سوچ ہی میں کھڑے تھے کہ بہت سے ہرن وہاں آئے اور پانی پینے کے لئے مینڈھ پر گھٹنے ٹیک کر گردنیں کنوئیں میں ڈال دیں پانی سطح پر آ گیا۔ اور ہرن پانی پی کر چلے گئے یہ بہت متعجب ہوئے اور پانی پینے کے لئے آگے بڑھے تو پانی بدستور نیچے اتر گیا، حضرتؒ نے بارگاہ باری تعالیٰ میں بہ گریہ وزاری عرض کیا کہ۔ ''اے پروردگار عالم تو نے کمال حکمت سے جانوروں کو تو پانی پلوا دیا مگر میں پیاسا ہوں۔''

آواز آئی۔ ''اے فرید تیری نظر رسی اور ڈول پر تھی۔ اور ہرنوں کی نظر صرف ہماری طرف تھی۔'' کہتے ہیں نفس کی اس طلب کی پاداش میں حضرت چالیس روز تک کنوئیں میں لٹکے رہے، اور پانی نہ پیا۔

حضرتؒ کو سخت ریاضتوں اور مجاہدوں میں کمال حظ محسوس ہوتا تھا کہتے ہیں ایک مرتبہ حضرت پیرومرشد کی خواہش پر ہانسی کی ایک مسجد میں کئی روز الٹے لٹکے رہے اور کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں حضرتؒ نے مجاہدہ اور چلہ کشی نہ کی ہو۔ اور جائے چلہ کشی حضرت

بابا فریدؒ کے نام سے مسحور نہ ہو۔

حضرت خواجہؒ نے نفس پر قابو پانے کے لئے کبھی خالی پتوں پر گزران کی اور کبھی گل کریر پکا کر کھاتے۔ فرماتے ہیں وہ روز ہمارے لئے مثل عید ہوتا تھا۔ لکڑی کی ایک روٹی بھی حضرت کے پاس تھی جسے انتہائی بھوک کے عالم میں دانتوں سے چباتے۔ جس سے پیٹ کی آگ تو کیا بجھتی ہوگئی ہاں نفس کو گھڑی بھر کے لئے زیر کر لیتے تھے۔ سوکھ کر کانٹا بن گئے تھے، فرماتے اگر رضائے حق درکار ہے تو دنیا کو ترک کر کے لباس درویشی پہننا چاہئے۔ اور عبادت کی خوراک سے تن کی پرورش کرنی چاہئے، جو ہاتھ آتا راہ مولا لٹا دیتے، حضرت بال بچے دار تھے، مگر اپنی ذات یا گھربار پر کوڑی خرچ نہ کرتے، سب کی سب فتوحات غربا و مساکین کو دے ڈالتے۔

ایک روز پھٹے کپڑے پہنے تھے، ایک شخص نیا جوڑا لے کر حاضر ہوا، حضرتؒ نے پہنا اور اتار دیا، شیخ نجیب الدین متوکلؒ پاس بیٹھے تھے انہیں دے دیا اور فرمایا جو مزہ ان پھٹے کپڑوں میں ہے اس نئے جوڑے میں نہیں۔

ایک مرتبہ حضرتؒ کو اطلاع ملی کہ حضرتؒ کے فلاں صاحبزادے کی جان بھوک کے سبب خطرے میں ہے۔ فرمایا اللہ تعالیٰ کی مرضی، بندہ مجبور کیا کر سکتا ہے۔

کرامات: اجودھن میں ایک جوگی شمبوناتھ رہتا تھا لوگ اس کی شعبدہ بازیوں پر فریفتہ تھے، وہ ہفتہ بھر بھوکا رہتا تھا، آٹھویں روز لوگ دودھ لے کر جاتے اور وہ سب دودھ چڑھا جاتا، جب اسے حضرتؒ کی آمد کا علم ہوا تو سینکڑوں چیلوں کو لے کر حضرتؒ کی طرف چلا اور راستہ میں سوچنے لگا کہ اگر کوئی کامل فقیر ہے تو میرے کانوں کے دونوں مندرے خود بخود نکل کر اس کے روبرو جا پڑیں گے۔ حضرتؒ نور باطن سے اس کے خیالات سے آگاہ ہوئے قریب آیا تو ایک نظر مندروں پر ڈالی مندرے کان سے نکل کر حضرتؒ کے سامنے جا پڑے۔ اسی دم جوگی کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ چوبی مندرے سرسبز ہوں تو جانوں، حضرتؒ نے اٹھا کر مٹی میں دبائے، فی الفور اگ آئے، جوگی نے کہا ایک شرط اور رہ گئی ہے وہ یہ کہ میں غائب ہوتا ہوں حضرتؒ مجھے ڈھونڈ لائیں تو حضرتؒ

کو بلا عذر مان لوں گا۔ چادر اوڑھ کر زمین پر لیٹ گیا، اس کی روح پرواز کر گئی، خالی مردہ جسم زمین پر پڑا تھا، حضرت مراقبہ میں گئے اور دیکھا کہ روح جوگی کی عالم ملکوت سے آگے نکل گئی تھی۔ حضرتؒ نے آواز دی کہ خبردار اس سے آگے مت جائیو، روح فوراً لوٹ آئی اور جوگی پھر زندہ ہو گیا۔ اٹھا اور حضرت کے قدموں میں پر گر پڑا۔ اور معہ چیلوں کے ایمان لے آیا۔ اور صدق دل سے مسلمان ہوا۔ بعد تکمیل یہ سب کے سب ولی ہوئے، کہتے ہیں کہ وہ مندروں کے پیڑ عرصہ دراز تک وہاں کھڑے رہے اور ممکن ہے اب تک موجود ہوں حضرتؒ سے بے شمار کرامات ظہور میں آئیں۔ چند ایک درج ذیل ہیں۔

ایک مرتبہ حسن قوال نے حاضر خدمت ہو کر عرض کیا کہ لڑکی کی شادی ہے کچھ عنایت کیجئے۔ فرمایا میرے پاس کیا ہے جو تجھے دوں؟ بولا حکم دیجئے کہ سامنے جو اینٹ رکھی ہے اسے اٹھا لوں، فرمایا ''بہتر''؟۔ چھوتے ہی وہ اینٹ سونے کی ہوگئی۔ اسی طرح اس نے یکے بعد دیگرے تین اینٹیں اٹھائیں اور تینوں سونے کی ہوگئیں۔

ایک مرتبہ آبادی سے گزر رہے تھے کہ بوجہ بارش حضرتؒ کا پیر پھسل گیا۔ برابر سے ایک طوائف معہ آشنا جاتی تھی۔ چھینٹے اڑ کر عورت کے کپڑوں پر پڑے۔ آشنا نے طیش میں آکر حضرتؒ کے طمانچہ جڑ دیا، مگر جب عورت مذکور کے مکان پر پہنچا تو نیچے گر پڑا۔ اور وہیں ڈھیر ہوگیا، عورت روتی پیٹتی حضرتؒ کے روبرو آئی، بولے جو ہوا ہے مجھے اس کا کچھ علم نہیں جب اس نے اصرار کیا تو فرمایا۔ ''میرے گرنے سے تیرا یار طیش میں آ گیا تھا، اور اس کے طمانچہ مارنے پر میرے دوست کو رنج پہنچا اور اس نے گردن مروڑ دی، حساب برابر، پھر شکوہ کیسا''؟۔

ایک روز حضرتؒ کی ریش مبارک سے ایک بال جدا ہوا حضرت سلطان المشائخ (جو حضرتؒ کے مشہور خلیفہ ہوئے ہیں) فرماتے ہیں کہ میں نے وہ بال مبارک اٹھا لیا، جو لا علاج مریض ان کے پاس آتا، وہ اسے موئے مبارک کا تعویذ دے دیتے۔ اور مریض شفایاب ہو جاتا۔

کہتے ہیں ایک مرتبہ درویش حضرت کے روبرو حاضر ہوئے اور کہا کہ ہم نے دنیا

کا چپہ چپہ چھان مارا ہے۔مگر کوئی فقیر نہیں دیکھا، چند مدعی ضرور دیکھے ہیں۔حضرت نے فرمایا بیٹھو ہم تمہیں دکھا دیں گے۔۔۔انہوں نے بات سنی ان سنی کر دی اور بگڑ کر چل دیئے۔جب قصبہ سے باہر نکلے تو لو نے گھیر لیا اور وہیں ٹھنڈے ہو گئے۔

ارشادات:

حضرت سلطان المشائخ نظام الدینؒ فرماتے ہیں کہ میں نے بارہا حضرتؒ قبلہ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے۔کہ جو آنکھ بغیر خدا تعالیٰ کے دیکھے (خدا تعالیٰ کے سوا کسی غیر کو دیکھے) اندھی بہتر ہے۔اور جو زبان اللہ تعالیٰ کا ذکر نہیں کرتی وہ گونگی بہتر ہے۔۔۔اور جو تن اللہ تعالیٰ کی راہ میں مصروف نہیں ہے وہ مردہ بہتر ہے۔فرمایا منہ سے جو بات کہے اللہ تعالیٰ ہی کے لئے کہے ورنہ خاموشی بہتر ہے۔

فرمایا عقل مند وہ ہے جو گناہ کو چھوڑ دے۔اور غنی وہ ہے جو قانع ہو۔۔۔

فرمایا اللہ تعالیٰ اس بندہ کو محروم نہیں رکھتا جو اس کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے۔

فرمایا پلے کچھ ہو تو غم نہیں نہ ہو تب ملال نہیں۔

فرمایا نامرادی مردوں کی معراج ہے۔

فرمایا فقیر کے تن پر کپڑے ایسے ہیں جیسے کفن۔

فرمایا وہ شخص بہتر ہے جو کسی کے بجائے اپنے عیب دیکھے۔

فرمایا صوفی سے ہر شے صاف ہوتی ہے۔صوفی کسی چیز سے مکدر نہیں ہوتا۔

فرمایا اگر بلند درجہ چاہتے ہو تو صاحب حال کی طرف نہ دیکھو ایک مرتبہ ایک دعوت کے موقع پر خود سے فرمایا ''اے فرید'' تو اپنا شکم شیرینی اور طرح طرح کی نعمتوں سے موٹا کرتا ہے خدا کو کیونکر پہنچے گا۔اور دعوت میں شریک نہ ہوئے۔

ایک مرتبہ ایک شخص نے عرض کیا کہ سلطان غیاث الدین بلبن (بادشاہ دہلی) کے لئے ایک سفارشی رقعہ لکھ دیجئے۔

فرمایا میرے کام تو خدا کے سپرد ہیں۔کسی دوسرے سے تمہاری سفارش کیونکر کر سکتا ہوں۔اگر وہ بادشاہ تمہیں کچھ دے گا تو دینے والا تو خدا تعالیٰ ہے اور تم بندے کے

مشکور ہو گے۔اور اگر وہ کچھ نہ دے سکا تو بھی اللہ کی طرف سے ہو گا۔اس وقت تم معذور ہو گے۔پس اپنا کام خدا تعالیٰ پر چھوڑ دو۔

ایک دفعہ رمضان شریف کے بارے میں فرمایا کہ روزہ اللہ اور بندے کے درمیان ایک بھید ہے۔جس کا راز اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرا نہیں جانتا۔

فرمایا رمضان المبارک کی ستائیسویں شب قدر ہے مردود ہے۔جو اس رات غافل نہ ہو۔

فرمایا مردان خدا کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

وصال: حضرتؒ ماہ محرم الحرام ہجری ۶۶۴ میں واصل حق ہوئے اور اجودھن (موجودہ پاک پٹن شریف) میں دفن ہوئے۔حضرتؒ کا مزار پاک اب بھی منبع فیض اور مرجع خلائق ہے۔پاکستان میں سب سے بڑا عرس حضرت ہی کا منایا جاتا ہے۔حضرت کے خلفائے عظام میں سے سلطان المشائخ محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاءؒ اور حضرت علی احمد صابرؒ بہت مشہور ہیں۔

راقم الحروف کے ایک دوست جو حضرت شیخ الشیوخ عالمؒ کے عقیدت مندوں میں ہیں۔فرماتے ہیں کہ ایک روز انہوں نے عالم خواب میں دیکھا کہ وہ حضرتؒ کی درگاہ سے باہر نکل کر آئے ہیں۔سر راہ ایک بڑھیا تازہ پلاؤ کا تھال لئے بیٹھی ہے اور سامنے سے حضرت قبلہؒ تشریف لا رہے ہیں۔اس بڑھیا کے پاس جا کر وہ اور حضرتؒ دونوں رک گئے۔باہم علیک سلیک ہوئی، حضرتؒ نے انہیں بڑھیا کے تھال میں سے ایک بوٹی (جس کے ساتھ ہڈی بھی تھی) اٹھا کر دی، اور آگے بڑھ گئے انہوں نے حضرتؒ کی عنایت کو مزے لے کر کھایا حضرتؒ کا جسم نیم برہنہ تھا۔بسبب ریاضت اور مجاہدہ جسم مبارک کمزور اور رنگ کالا تھا۔حضرتؒ کے ہاتھ میں سہارے کے لئے لکڑی تھی۔تعبیر لینے سے عقدہ کھلا کر وہ بڑھیا دنیا تھی اور عطائے نعمت دنیوی واخروی کامیابی پر دلالت کرتی تھی جسے اس بوٹی کے حجم کے مطابق حضرتؒ نے انہیں عطا فرمائی تھی۔

پاکپتن شریف

پاک پتن شریف کا قدیم نام اجودھن ہے یہ مشہور قصبہ پاکستان کے ضلع ساہیوال میں لاہور سے ملتان جانے والی سڑک پر واقع ہے۔ شہنشاہ اکبر کے حکم سے اس کا نام پتن بابا فرید یا پاک پتن رکھا گیا ہے۔

حضرت بابا صاحبؒ کے بزرگوں کا حال

حضرت بابا حضربؒ کے دادا کا نام قاضی شعیبؒ تھا جو بادشاہ کابل فرخ شاہ کی اولاد میں سے تھے جن کا سلسلہ نسب چند واسطوں سے خلیفہ دوم حضرت امیر المومنین عمر فاروقؓ سے جا ملتا ہے۔ قاضی شعیبؒ اپنے والد کی شہادت کے بعد ۵۵۲ھ بمطابق ۱۱۵۷ء میں اپنے اہل وعیال کے ساتھ کابل سے لاہور آئے اور پھر لاہور سے قصور ہوتے ہوئے کھتوال چلے گئے۔ جو ضلع ملتان میں واقع ہے۔ کھتوال میں قاضی شعیبؒ نے اپنے مجھلے لڑکے قاضی جمال الدین سلیمانؒ کی شادی شیخ وجیہہ الدین خجندی عباسیؒ کی دختر بی بی قاسم خاتونؒ سے کی۔

شیخ جمال الدین سلیمانؒ کے ایک بھائی کا نام شیخ عبداللہ تھا جن کی اولاد میں شیخ احمد سرہندی عرف مجدد الف ثانیؒ ہوئے ہیں۔

پیدائش

شیخ جمال الدین سلیمانؒ کے ہاں بی بی قاسم خاتونؒ کے بطن سے پہلے شیخ اعزاز الدین محمودؒ پھر شیخ فرید الدین مسعودؒ اور آخر میں شیخ نجیب الدین متوکلؒ پیدا ہوئے۔

بابا صاحب قبلہؒ کی پیدائش ۵۷۱ھ میں ہوئی اور آپ کی ابتدائی تعلیم و تربیت کھتوال میں ہوئی اور یہیں آپ نے درسی کتابیں پڑھیں اور قرآن شریف حفظ کیا۔ اس کے بعد آپ اعلیٰ تعلیم کے لئے ملتان چلے گئے جو ان دنوں علم وفضل کا مرکز تھا اور قبۃ الاسلام کہلاتا تھا۔ ملتان میں آپ نے حلوائی کی سرائے کے قریب مسجد مولانا منہاج الدین ترمذی میں قیام فرمایا اور تعلیم شروع کی۔ اس وقت آپؒ کی عمر ۱۲ یا ۱۳ سال تھی اس زمانے میں آپؒ کا یہ معمول تھا کہ دن رات میں ایک قرآن شریف ختم کیا کرتے تھے۔

بابا صاحبؒ کے پیر و مرشد

اس مسجد میں جناب بابا صاحبؒ ایک دن کتاب نافع پڑھ رہے تھے کہ قطب عالم حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ یہاں تشریف لائے۔ حضرت بختیار کاکیؒ مرید و خلیفہ و جانشین ہیں سلطان الہند خواجہ خواجگان حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کے آپؒ نے جناب بابا صاحبؒ کو مطالعہ کرتے ہوئے دیکھا تو پوچھا! مسعود کیا پڑھتے ہو؟ آپؒ نے جواب دیا نافع حضرت نے پھر سوال کیا کیا اس سے تم کو نفع ہوگا؟۔ بابا صاحبؒ نے جواب دیا کہ مجھ کو تو انشاء اللہ آپؒ کی صحبت سے نفع ہوگا۔ یہ کہہ کر آپؒ نے حضرت قطب الاقطابؒ کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ حضرت نے سر اٹھایا اور بابا صاحب نے یہ رباعی پڑھی۔

مقبول تو جز مقبل جاوید نشد   وز لطف تو ہیچ بندہ نومید نشد
عونت بکدام ذرہ پیوست   کان ذاہ بہ از ہزار خورشید نشد

پھر فرمایا تکمیل علم کے بعد میرے پاس دہلی آنا۔انشاءاللہ اپنی مراد کو پہنچو گے۔
جناب بابا صاحبؒ نے جب ملتان میں تعلیم سے فراغت پائی تو مزید تحصیل علم کے لئے سیستان۔ چشت۔کرمان۔ بدخشاں۔ بغداد۔ مکہ معظمہ۔ مدینہ منورہ۔ بیت المقدس وغیرہ وغیرہ مقامات پر گئے۔ جہاں ظاہری اور باطنی علوم حاصل کرتے رہے۔ بغداد شریف میں آپ کی ملاقات جناب شیخ الشیوخ حضرت شہاب الدین سہروردیؒ سے ہوئی تھی۔اور آپ کچھ عرصہ شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردیؒ کی صحبت میں رہے تھے۔ خوت شیخ الشیوخؒ آپ کو اپنی لاجواب کتاب عوارف المعارف عنایت کی اور فرمایا مسعود! شیطان رابر ذات شادست قدرت نباشد یعنی شیطان تم پر قابو نہ پا سکے گا۔اس سفر میں آپ کی ملاقاتیں کمل اولیاء اللہ سے ہوئیں جن میں خواجہ اجل شیرزائیؒ امام حذادیؒ، اوحد الدین کرمانیؒ اور شیخ عبدالواحد بدخشانیؒ قابل ذکر ہیں۔کثرت مجاہدہ کی وجہ سے آپ کا لقب زہد الانبیاء ہو گیا۔ طے کے روزے اور نماز معکوس آپ کے مجاہدات میں خاص چیزیں ہیں۔آپ ساری عمر روزہ رکھتے رہے۔اگر بیمار ہوتے یا فصد کھلواتے تب بھی روز نہ چھوڑتے تھے ہر روز اور بعض روایت کے مطابق ہر نماز کے لئے غسل فرماتے تھے۔

مجاھدہ وریاضت!

وجہ تسمیہ گنج شکرؒ

گنج شکر کی وجہ تسمیہ تذکرہ نویسوں نے علیحدہ علیحدہ لکھی ہیں ہم یہاں صرف دو روائتیں لکھتے ہیں جن میں اکثر کا اتفاق ہے۔
امیر خورد کرمانی صاحب سیر الاولیاء کا بیان ہے کہ حضرت بابا صاحبؒ بعد تحصیل علم جب دہلی حضرت قطب عالمؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور شرف بیعت حاصل کیا تو حضرتؒ نے آپ کو دروازہ مندہ کے قریب بُرج کے نیچے ایک حجرہ قیام کے لئے دیا۔

چنانچہ آپ اس جگہ شیخؒ کے فرمودہ اعمال واشغال وافکار واقتبہ میں مشغول رہتے تھے اور ہر پندرھویں دن اپنے مرشد کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔
ایک دن آپ نے اپنے مرشد حضرت قطب عالمؒ سے عرض کیا کہ میں مجاہدہ اور ریاضت زیادہ چاہتا ہوں حضرت قطب عالمؒ نے فرمایا، مسعود! طے کا روزہ رکھو اور جو کچھ غیب سے ملے اس سے افطار کرو۔ چنانچہ جناب بابا صاحبؒ نے طے کا روزہ رکھ لیا تیسرے روز افطار کے وقت ایک شخص آپؒ کیلئے کھانا لایا آپؒ نے اس سے روزہ افطار کر لیا۔تھوڑی دیر بعد آپ کو الٹی ہو گئی اور سارا کھانا نکل گیا۔نماز سے فارغ ہو کر آپؒ اپنے مرشدؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔حضرت قطب عالمؒ نے فرمایا مسعود! تین روز کے روزہ کو شرابی کے گھر کے کھانے سے افطار کیا۔
یہ تم پر اللہ تعالیٰ کی رحمت تھی کہ وہ کھانا واپس نکل گیا۔اب پھر طے کا روزہ رکھو اور جو کچھ غیب سے پہنچے اس سے افطار کرو۔ چنانچہ بابا صاحبؒ نے یہ سن کر اسی وقت پھر تین دن کے روزہ کی نیت کی ور جب تین دن پورے ہو گئے تو گویا چھ دن کا روزہ ہو گیا۔ افطار کے وقت کوئی چیز نہ آئی۔ یہاں تک کہ رات ہو گئی ضعف نے غلبہ کیا۔نفس شدت بھوک سے جلنا شروع ہوا۔آپؒ نے زمین پر ہاتھ مارا اور ایک مٹھی کنکر اٹھا کر منہ میں رکھ لئے۔وہ کنکر منہ میں جاتے ہی شکر ہو گئے۔آپ کو معاً خیال آیا کہ یہ کہیں وسوسہ شیطانی نہ ہو۔اس خیال کے آتے ہی آپؒ نے ان کو تھوک دیا۔اور ذکر الٰہی میں مشغول ہو گئے آدھی رات گزرنے کے بعد پھر بھوک کی شدت سے بے چین ہو کر آپؒ نے زمین سے ایک مٹھی کنکر اٹھا کر منہ میں ڈال لئے وہ بھی فوراً شکر ہو گئے آپؒ نے ان کو پھر تھوک دیا اور عبارت میں مشغول ہو گئے آخر صبح کے قریب جب نقاہت حد سے تجاوز کر گئی تو آپؒ کو خیال آیا کہ شدت ضعف کے سبب میں کہیں فرائض سے نہ رہ جاؤں۔اس لئے آپؒ نے پھر ایک مٹھی کنکر لے کر منہ میں ڈال لئے جو فوراً شکر ہو گئے۔اور آپؒ نے ان کو کھا لیا۔جب صبح کو آپؒ اپنے مرشد کی خدمت مین حاضر ہوئے تو حضرت قطب عالمؒ نے ارشاد فرمایا کہ مسعود! ''نیکو کردی کہ بداں افطار کردی) کہ ہر چیز از غیب است نیکو است''۔(یعنی مسعود

اچھا کیا جو ان سے روزہ افطار کر لیا کہ جو کچھ غیب سے ہوتا ہے اچھا ہی ہوتا ہے)۔ پھر فرمایا: ''بروبچو شکر شیریں خواہد بود''۔ یعنی جاؤ شکر کی طرح ہمیشہ شیریں رہو گے۔ صاحب سیر الاولیاء نے لکھا ہے کہ اسی وجہ سے آپ کو پیر شکر یا گنج شکرؒ کہتے ہیں۔

شکر کی بجائے نمک

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے لکھا ہے کہ ایک سوداگر اونٹوں پر شکر لاد کر ملتان سے دہلی جا رہا تھا۔ جب وہ اجودھن پہنچا تو راستے میں حضرت شیخ العالم جناب بابا صاحبؒ کھڑے تھے۔ آپؒ نے اس سے پوچھا اونٹوں پر کیا لدا ہوا ہے؟۔ سوداگر نے (منگتا فقیر خیال کر کے) کہا نمک ہے بابا آپؒ نے فرمایا نمک ہوگا۔ سوداگر نے منزل پر پہنچ کر جب بوریوں کو کھول کر دیکھا تو ان میں شکر کی بجائے نمک تھا۔ بہت پریشان ہوا اور پھر واپس (اجودھن حضرتؒ کی خدمت میں آیا اور اپنے گناہ کی معافی مانگی۔ آپؒ نے فرمایا: ''جھوٹ بولنا بُری بات ہے آئندہ کبھی بھی جھوٹ نہ بولنا اگر وہ شکر تھی تو پھر شکر ہی ہو جائے گی۔''

سوداگر نے جھوٹ سے توبہ کی اور واپس آ کر بوریوں کو دیکھا تو ان میں شکر بھری ہوئی تھی۔ بیرم خاں خانخاناں نے اس واقعہ کو شعر میں ادا کیا ہے ؎

کان نمک جہان شکر شیخ بحر و بر
آں کز شکر نمک کند واز نمک شکر

''چلہ معکوس''

طے کے روزہ کے بعد ایک دن جناب بابا صاحبؒ نے اپنے مرشد حضرت

قطب عالمؒ کی خدمت میں عرض کی کہ میری آرزو ہے کہ ایک چلہ کروں۔ حضرتؒ نے ارشاد فرمایا اس کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اس سے شہرت ہوتی ہے۔ اس پر جناب بابا صاحبؒ نے عرض کی حضور وقت اچھا ہے، آپ کی موجودگی میں کوئی بات نہیں ہوگی اور خدا جانتا ہے کہ میری نیت شہرت کی نہیں ہے۔ یہ سن کر حضرت قطب عالمؒ نے کوئی جواب نہ دیا۔

حضرت بابا صاحبؒ فرماتے ہیں کہ مجھے اپنی اس غلطی پر سخت ندامت ہوئی۔ اور آج تک مجھے اس بات کا رنج وصدمہ ہے کہ میں نے حضرت قطب عالمؒ کی مرضی کے خلاف اصرار کی جرات کیوں کی تھی۔

اس واقعہ کے کچھ دن بعد حضرت قطب عالمؒ نے بابا صاحبؒ سے ارشاد فرمایا۔ مسعود! تم چلہ معکوس کرو۔ جناب بابا صاحبؒ کو اپنے پیر بھائی حضرت بدرالدین غزنویؒ کے ذریعے چلہ معکوس کا یہ طریقہ معلوم ہوا کہ چالیس رات یا دن اپنے پاؤں میں رسی باندھ کر سر کے بل کنویں میں لٹکتا رہے اور شغل میں مصروف رہے۔ اس کے لئے مسجد کا ایک کنواں چاہئے جس پر درخت ہو کہ لٹکنے میں آسانی رہے۔

جناب بابا صاحبؒ نے چلہ معکوس کا طریقہ معلوم کر کے مطلوبہ کنویں کی تلاش شروع کر دی اور سفر کرتے ہوئے واپس کھتوال پہنچ گئے اور والدہ ماجدہ کی خدمت میں حاضری دی۔ یہاں آپؒ نے کچھ دن قیام فرمایا۔ اس عرصے میں آپؒ کھتوال سے باہر مسجد میں دن رات عبادت میں مشغول رہتے تھے۔ بکثرت نفل پڑھا کرتے تھے اور اس میں اتنا غلو اور مشغولی تھی کہ کھانے پینے کا بھی خیال نہ آتا تھا۔ اکثر دو رکعت میں قرآن شریف ختم کر دیا کرتے تھے۔ لوگوں سے بہت کم میل جول رکھتے تھے۔ اس لئے کھتوال کے لوگ آپ کو ''قاضی بچہ دیوانہ'' کہتے تھے۔

اور جب انہی دونوں حضرت جلال الدین تبریزیؒ کھتوال آئے تو آپؒ نے لوگوں سے پوچھا کہ مجھ کو یہاں سے ''خدا کے دوست'' کی خوشبو آتی ہے۔ لوگوں نے عرض کی جناب یہاں صرف قاضی بچہ دیوانہ ہے۔ جو حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ

کا مرید ہے یہ سن کر حضرت جلال الدین تبریزیؒ آپؒ سے ملنے آبادی سے باہر مسجد میں آپؒ کے پاس گئے۔

مطلوبہ کنویں کی تلاش میں آپ کھتوال سے روانہ ہو کر قریہ قریہ اوچ پہنچ گئے۔ یہاں آپؒ نے ایک پر فضا مسجد دیکھی جسے مسجد حاج کہتے تھے۔ اس مسجد میں ایک کنواں تھا اور اس پر ایک درخت تھا جس کی شاخیں کنویں پر پھیلی ہوئی تھیں اور مسجد کے موذن خواجہ رشید الدین غیائیؒ تھے جو آپ کے پرانے واقف تھے اور ہانسی کے رہنے والے تھے۔ آپؒ نے کچھ یوم کے بعد اپنا ارادہ ان پر ظاہر کیا اور راز داری کا عہد لے کر رسی منگائی۔

عشاء کی نماز کے بعد رشید الدینؒ نے آپؒ کے پاؤں میں رسی باندھ کر آپ کو کنوئیں میں اُلٹا لٹکا دیا اور صبح کی اذان کے وقت کنوئیں سے باہر نکال لیا۔ پھر چالیس راتیں یہ عمل اسی طرح جاری رہا۔

چلہ پورا کرنے کے بعد جب آپؒ نے وہاں سے روانگی کا قصد کیا تو رشید الدینؒ موذن نے عرض کی کہ حضور میری کئی لڑکیاں ہیں۔ جن کی شادی کرنی ہے اور کوئی سامان اور ذریعہ نہیں ہے۔ آپؒ از راہ نوازش میرے حق میں دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے میری مشکل کو حل فرمائے اور مجھے فراخی رزق حاصل ہو جائے آپؒ نے فرمایا۔ رشید الدینؒ تم وعظ کہا کرو۔ اس نے عرض کیا حضور میں تو ان پڑھ ہوں۔ آپؒ نے فرمایا رشید الدین منبر پر قدم رکھنا تمہارا کام ہے اور فضل کرنا اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔

بس حضور بابا صاحبؒ کی زبان مبارک کا ارشاد پورا ہوا اور اللہ تعالیٰ نے ان کے سینے کو کھول دیا یعنی جس وقت رشید الدین نے منبر پر قدم رکھا تو لوگ کہہ رہے تھے کہ یہ جاہل آدمی کیا وعظ کرے گا؟ جب انہوں نے بیان شروع کیا تو لوگوں کی ڈاڑھیاں آنسوؤں سے تر ہو گئیں اور بڑے بڑے فضلا انگشت بدنداں تھے کہ ایسا عجیب و غریب بیان اور ایسا علم و فضل اس کو کب اور کہاں سے حاصل ہو گیا؟۔

حضرت بابا صاحبؒ کے مجاہدات کا کما حقہ بیان تسلسل زمانہ کے ساتھ تحریر کرنا بہت مشکل ہے اگرچہ اصغر علی چشتی صاحبؒ ظاہر فریدی کے تحریر کردہ بعض حالات محققین

کے نزدیک افسانے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ مگر اس بات پر سب متفق ہیں۔ کہ جناب بابا صاحبؒ کی نفس کشی اور ریاضتہائے شاقہ کی نظیر و مثال تاریخ و سیر میں نہیں ملتی۔ آپؒ نے چالیس سال تک عشاء کے وضو سے صبح کی نماز پڑھی اور مختلف اوقات میں جن کا مجموعہ ۱۲ سال ہوتا ہے نماز معکوس ادا کی ہے۔

اس ریاضت اور مجاہدہ کے زمانے میں کھانے پینے سے بالکل پرہیز تھا۔ کیونکہ بقول سالار عارفاں حضرت خواجہ حسن بصریؒ غافلوں اور عام لوگوں کی زندگی خون اور ہڈیوں کے مغز سے ہوتی ہے لیکن عاشقوں کی زندگی دوست کی یاد اور اس کے ذکر سے ہوتی ہے۔ خون کی بجائے ان کے بدن میں محبت ہوتی ہے۔

آدمی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے عشق
شاخ گل میں جس طرح باد سحر گاہی کا نم ! (اقبال)

حضرت بابا صاحبؒ اس زمانے میں لکڑی کی ایک روٹی کپڑے میں لپیٹ کر ساتھ رکھتے تھے۔ جب کوئی کھانے کو پوچھتا تو آپؒ اس کی طرف اشارہ کر دیتے کہ میرے پاس یہ موجود ہے۔ کیونکہ انتہائی تقویٰ کے سبب آپ ہر ایک کا کھانا نہ کھاتے تھے۔ مسلسل روزوں، شب بیداری اور سخت اذکار و اشغال کی وجہ سے آپ ایک انسانی ڈھانچہ رہ گئے تھے۔ اگر کوئی عارضہ لاحق ہوتا یا فصد کھلواتے تب بھی روزہ نہ چھوڑتے تھے۔ حضرت مخدوم چراغ دہلویؒ نے جناب بابا صاحبؒ کے اس قول کو انہی مجاہدات کی کامیابی قرار دیا ہے۔ فرمایا کہ چالیس سال تک جو کچھ خدائے تعالیٰ نے فرمایا بندہ نے وہی کیا۔ اب چند سال سے جو کچھ بندہ مسعود کے دل میں گذرتا ہے اللہ تعالیٰ وہی کچھ کر دیتا ہے۔

اوست اندر سر من ظاہر شدہ
من نیم واللہ مسعود من نیم

سلسلہ روحانی اور خواجہ اجمیریؒ کا ارشاد

حضرت شیخ العالم بابا فرید الدین مسعود شکر گنجؒ کے پیرومرشد حضرت قطب عالم خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ ہیں۔ آپ کے پیرومرشد سلطان الہند خواجہ خواجگان حضرت معین الدین حسن چشتی اجمیریؒ ہیں۔ آپ کے پیرومرشد حضرت خواجہ عثمان ہارونیؒ آپ کے پیرومرشد حضرت خواجہ حاجی شریف زندنی چشتیؒ آپ کے پیرومرشد حضرت خواجہ قطب الدین مودود چشتیؒ۔ آپ کے پیرومرشد حضرت خواجہ ناصر الدین ابو یوسف چشتیؒ آپ کے پیرومرشد حضرت خواجہ ابو محمد چشتیؒ۔ آپ کے پیرومرشد حضرت خواجہ ابو احمد ابدال چشتیؒ آپ کے پیرومرشد خواجہ ابو اسحاق شامی چشتیؒ آپ کے پیرومرشد حضرت خواجہ ممشاد علو دینوری چشتیؒ آپ کے پیرومرشد حضرت خواجہ امین ابی ہبیرۃ البصریؒ آپ کے پیرومرشد حضرت خواجہ سدید الدین حذیفۃ المرعشیؒ۔ آپ کے پیرومرشد حضرت خواجہ سلطان ابراہیم بن ادہم بلخیؒ آپ کے پیرومرشد حضرت خواجہ محمد فضیل ابن عیاضؒ آپ کے پیرومرشد حضرت خواجہ عبدالواحد بن زیدؒ آپ کے پیرومرشد سالار عارفاں حضرت خواجہ حسن بصریؒ آپ کے پیرو مرشد مولائے کائنات امیر المومنین سیدنا علی ابن ابی طالبؓ آپ کے پیرومرشد فخر موجودات رحمۃ للعالمین حضرت احمد مجتبےٰ خاتم النبیین سیدنا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔

یعنی آپؒ سے سرکار رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک ۱۷ واسطے ہیں اور سلطان الہند خواجہ خواجگان حضرت معین الدین چشتیؒ آپ کے دادا پیر ہیں جنہوں نے آپ کو دیکھ کر اپنے مرید و خلیفہ جانشین حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ سے فرمایا تھا کہ ''قطب الدین شہبازے بدام آوردہ کہ بجز سدرۃ المنتہیٰ آشیانہ نمی گیرد''۔ (یعنی قطب الدین تمہارے پاس ایسا شہباز بلند پرواز آیا ہے۔ کہ جو سدرۃ المنتہیٰ کے سوا کہیں نہ ٹھہرے گا) اور یہ بھی فرمایا تھا ''کہ مسعود شمع ایست کہ خانوادہ درویشاں منور سازد'' (یعنی مسعود ایک ایسی شمع ہے کہ جو خاندان درویشاں کو منور بنا دے گی)۔

حضرت قطب عالم بختیار کاکیؒ نے اپنے وصال کے وقت اپنا قائم مقام اور جانشین جناب بابا صاحبؒ کو متعین فرمایا تھا۔ اور وہ تمام تبرکات جو خاندان چشت میں سلسلہ بسلسلہ چلے آرہے تھے۔ آپ ہی کو دینے کے لئے وصیت فرمائی تھی۔

پاک پتن شریف میں آمد

جناب بابا صاحبؒ تقریباً ستر اہتر سال کی عمر میں پاکپتن شریف آئے تھے اور یہاں آپؒ نے اپنی عمر کے آخری ۱۸ سال گزارے تھے۔ اس جگہ آپؒ کی ذات گرامی کے فیض سے لاکھوں آدمی حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ سینکڑوں ہزاروں کو آپؒ نے اوتاد و اقطاب و ابدال کے مدارج پر فائز اکرام کیا۔ آپؒ کی نظر مبارک کے اثر سے گمراہ ہادی اور چور ولی بن گئے۔

جماعت خانہ فریدیہؒ

مشائخ عظامؒ اپنے مریدوں کی اصلاح و تربیت کے لئے ان کو جماعت خانوں اور آباد مسجدوں میں قیام کے لئے فرماتے تھے حضرت شیخ العالمؒ کا جماعت خانہ جامع مسجد قدیم پاکپتن تھا۔ چونکہ مسجد کے قریب خود حضرتؒ کا مکان تھا اس لئے مریدوں کی دیکھ بھال اصلاح احوال کے لئے ان کو اسی جگہ ٹھہراتے تھے خود حضرتؒ بھی رات دن مسجد میں ہی مشغول رہا کرتے تھے۔ یہ جماعت خانہ علم و فضل کا مرکز تھا۔

حضرت مولانا سید بدرالدین اسحاق بخاریؒ کا ذکر

جماعت خانہ فریدیہ کے مدار الہام حضرت مولانا سید بدر الدین اسحاق ؒ بخاری تھے جو دہلی کے ممتاز فضلا میں سے ایک تھے اور ہندوستان کی قدیم دینی درس گاہوں میں ان کا مدرسہ بہت اچھی شہرت رکھتا تھا۔ ایک دینی مسئلہ کے حل کے لئے بہت سی کتابوں کے ساتھ بخارہ جا رہے تھے اجودھن میں بابا صاحبؒ سے ملاقات ہوگئی۔ اگرچہ مولانا فقراء سے خاص اعتقاد نہ رکھتے تھے لیکن جناب بابا صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ اور حضرت بابا صاحبؒ نے مولانا کی صورت دیکھتے ہی وہی مسئلہ شروع کر دیا۔ جس میں مولانا کو الجھن تھی اور ایسی جامع تقریر کی کہ مولانا کے تمام شبہات اور اعتراضات ختم ہو گئے۔ چنانچہ مولانا نے اٹھ کر بابا صاحبؒ کے قدموں پر سر رکھ دیا اور اسی صحبت میں مرید ہو گئے اور بابا صاحبؒ کی ایسی خدمت کی کہ بابا صاحبؒ نے اپنا محرم خاص بنالیا اور اپنی دامادی (حضرت مولاناؒ کو بابا صاحب کی چھوٹی صاحبزادی بی بی فاطمہ منسوب تھیں) اور خلافت سے مشرف فرمایا۔ یہاں تک کہ درگاہ بے نیازی کے واصلوں میں میں سے ایک ہو گئے اور آپ جناب بابا صاحبؒ کی خدمت سے ایک مقام عظمت تک پہنچے کہ حضرت سلطان المشائخ خواجہ سید نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ فرماتے ہیں کہ جب مجھ کو سختیاں آتی ہیں تو میں جناب باری تعالٰی کے حضور میں پہلے حضرت شیخ العالم بابا صاحبؒ کو یاد کرتا ہوں اور پھر مولانا سید بدرالدین ااسحاق ؒ کو شفیع و وسیلہ لاتا ہوں۔ یہ ہیں جماعت خانہ فریدیہؒ کے ناظم مولانا بدرالدین اسحاق بخاری رحمۃ اللہ علیہ۔

لوگوں کی اصلاح وتربیت کا کام کرنے والے اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں کہ انسان کے کردار کی بناوٹ اس کے احساس اور افکار کی بلندی اور پستی میں اس کے ماحول کا بڑا دخل ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ مشائخ اور فقراء مریدوں کو اپنی صحبت میں رہنے کیلئے فرماتے ہیں مشائخ کی اصلاحی جدوجہد کا مرکز ان کی خانقاہیں یا جماعت خانہ ہوتے تھے۔ جہاں طالب یا مرید زیر تربیت رہتے ہیں۔ یہ گویا تربیت گاہ ہوتی ہے کہ جہاں داخل

ہو کر بڑے سے بڑے گنہگار کے خیالات ایک دم بدل جاتے ہیں۔ پاکیزہ ہم جلیس دین داری، تقویٰ، خلوص۔ شیخ کی نورانی صحبت اس پر ہر وقت یہ خیال قائم رکھنا کہ اللہ تعالیٰ ہم کو دیکھ رہا ہے۔ انسانی قلوب پر اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اور یہ بات ایک حقیقت ہے کہ اگر ماحول تبدیل نہ کیا جائے۔ تو اصلاح باطن کی ساری کوششیں رائیگاں جاتی ہیں کیونکہ اگر ایک طالب علم صادق کا ہم نشین ایک ایسا شخص ہو جائے جو دینی جدوجہد میں دلچسپی نہ رکھتا ہو تو نتیجہ اچھا برآمد نہیں ہوتا۔

حضرت شیخ الشیوخ العالمؒ کی اصلاحی جدوجہد کا آغاز دینی تربیت سے ہوتا تھا۔ ارکان اسلام کی پابندی پر آپ خاص زور دیتے تھے۔ اور معمولی سی معمولی شرعی فروگذاشت پر مواخذہ فرماتے تھے۔ اور طرح طرح سے لوگوں پر یہ بات واضح کرتے رہتے کہ ارکان اسلام کی پابندی کے بغیر روحانی ترقی ممکن نہیں راہ طریقت کی پہلی منزل یہی ہے آپ مرید کرتے وقت لوگوں سے شریعت مقدسہ پر چلنے کا عہد لیا کرتے تھے۔

حضرت بابا صاحبؒ کے جماعت خانہ میں کسی کے ساتھ امتیازی برتاؤ نہیں ہوتا تھا بحث ومباحثہ اور دل آزار گفتگو پر سخت پابندی تھی سب زمین پر سوتے تھے شب بیداری ہر وقت باوضو رہنا نوافل کی کثرت تلاوت قرآن پاک ذکر فکر اور مراقبہ سب کے لئے ضروری تھا۔ جماعت خانہ کے مدارالمہام سید بدر الدین اسحاق ؒ جنگل سے لنگر خانہ کے لئے لکڑیاں لایا کرتے تھے اور مولانا قطب جمال ہانسویؒ کریل کے پھل (ڈیلہ) توڑ کر یا کرتے تھے اور مولانا حسام الدینؒ پانی بھرتے تھے اور سلطان المشائخ خواجہ نظام الدینؒ اولیاء ان پھلوں کو ابال کر درویشوں اور خود حضرت شیخ شیوخ العالمؒ کی خدمت میں پیش کیا کرتے تھے۔ کبھی ان ابلے ہوئے پیلوؤں میں نمک ہوتا تھا اور کبھی وہ بھی نہیں۔ حضرت سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ شیخ شیوخ العالم کے جماعت خانہ میں جس روز درویشوں کو ابلے ہوئے کریل (ڈیلہ) پیٹ بھر کر مل جاتے تھے وہ روز عید ہوتا تھا۔ جماعت خانہ کے درویش زنبیل گردانی کرتے تھے۔ اس طرح جو روٹی حاصل ہوتی تھی وہ مہمانوں سے اگر بچ جاتی تو درویشوں کے افطار میں کام آتی تھی۔

جناب بابا صاحبؒ نے مخلوق سے بچ کر اور آبادیوں کو چھوڑ کر ایک ویران جگہ اپنے قیام کے لئے چھوڑ پسند فرمائی۔ مگر اس پر بھی آمدورفت کا کچھ حساب وشمار نہ تھا۔ نصف رات تک آپ بیٹھے رہتے تھے اور دروازہ کھلا رہتا تھا۔ اور ضرورت مند اور مظلوموں کی بھیڑ لگی رہتی تھی اور جو کچھ لوگ زروسیم ونعمہائے گوناگوں نذر لاتے تھے آپؒ ان کو فوراً تقسیم کردیا کرتے تھے۔

کوئی ایسا نہ ہوتا تھا جس کو شیخ العالمؒ کچھ نہ عطا فرماتے ہوں۔ عجب حوصلہ اور عجب ہمت تھی کہ شائد کسی دوسرے کو نصیب ہو۔ مولانا بدرالدین اسحاقؒ فرماتے ہیں کہ میں حضرت شیخ شیوخ العالمؒ کا خادم اور خرم تھا۔ آپؒ ہر بات مجھ سے بیان فرمادیتے تھے اور ظاہر و باطن کوئی فرق نہ کرتے تھے۔ کوئی بات میں نے ایسی نہ دیکھی جو حضرتؒ نے خلوت میں کی ہو یا کہی ہو اور مجلس میں اس کو چھپایا ہو، حضرتؒ کی تعلیم وتربیت اور محبت کے اثر سے جماعت خانہ کے ہر فرد میں ایک تبدیلی ہو جاتی ہے وہ تبدیلی کیا تھی اگر اس کو بہت مختصر الفاظ میں بیان کی جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ حضرتؒ کی خدمت میں آکر لوگوں کی موت وحیات صرف خدا کے لئے ہو جاتی تھی کہنے کو تو یہ ایک چھوٹا سا فقرہ ہے مگر اس کی وسعت اور گیرائی کا یہ عالم ہے کہ مہد سے لے کر لحد تک اور لحد سے بہشت اور دیدار الٰہی تک کوئی چیز اس سے باہر نہیں ہے اور فقراء کی اس ساری دینی جدوجہد ومنشاء از ابتداء تا انتہا یہی ہوتا ہے۔

حضرت کی تربیت کا ڈھنگ کچھ اس طرح تھا کہ برائی کے سوتے بند ہو جاتے تھے۔ دین دنیا کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا معاملہ نصیحت اور عبرت پذیری کے لئے ہوتا تو اس سے بہترین نتائج اخذ کر کے ذہن نشین کرتے تھے۔ دینیات کے ساتھ ساتھ معاملات کی صفائی پر بھی توجہ دیتے تھے۔

نمک قرض کیوں لیا؟

ایک دن حضرت شیخ الاسلامؒ کے لنگر خانہ میں نمک بھی نہ تھا۔ مولانا قطب جمال ہانسوی جنگ سے کریل (ڈیلے) اور مولانا بدرالدین اسحاقؒ لکڑیاں لائے تو حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدینؒ اولیاء نے ان کو ابالنے کے لئے چڑھا دیا اور بازار جاکر بقال سے نمک قرض لے آئے اور ان میں ڈالا۔ جس وقت دستر خوان بچھایا گیا اور سب فقراء جمع ہو گئے۔ دعا پڑھنے کے بعد جیسے ہی حضرت بابا صاحبؒ نے لقمہ اٹھایا فوراً واپس رکھ دیا اور فرمایا لقمہ گراں ہے کوئی شبہ والی بات معلوم ہوتی ہے۔

یہ سن کر خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کھڑے ہو گئے اور عرض کی حضور لکڑیاں تو حضرت مولانا سید بدرالدین اسحاقؒ لائے ہیں اور ڈیلہ مولانا جمال الدینؒ لائے ہیں اور پانی مولانا حسام الدینؒ نے بھرا ہے ان کو جوش میں نے دیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ لقمہ کس سبب سے گراں ہے؟۔ حضرت شیخ العالمؒ نے ایک لحہ تامل کے بعد فرمایا نمک کہاں سے آیا؟۔ اتنا سننا تھا کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ حیران رہ گئے اور ہاتھ جوڑ کر عرض کی کہ حضور کی ذات گرامی کاشف حالات ہے یہ خطا مجھ سے سرزد ہوئی ہے یہ کریل کڑوے کیلے ہوتے ہیں اور مخدوم آٹھ پہر کے بعد بہت معمولی غذا تناول فرماتے ہیں اور ان میں اکثر یہ ٹینٹ ڈیلے ہوا کرتے ہیں۔ اگر ان میں نمک بھی نہ ہو تو پھر یہ کیسے کھائے جائیں گے؟۔ محض اس خیال سے میں نے اس میں نمک قرض لے کر ڈال دیا ہے حضرتؒ نے یہ سن کر فرمایا! اچھا اب اس کھانے کو دوسرے فقراء میں تقسیم کردو پھر فرمایا۔ ''نظام الدین درویشاں اگر بفاقہ بمیرند برائے لذت نفس قرض نہ گیرند۔'' (یعنی اگر چہ درویش فاقہ سے مر جائیں تب بھی لذت نفس کے لئے قرضہ نہیں لیتے)۔

حضرت سلطان المشائخؒ نے اسی وقت عہد کیا کہ اب تمام عمر قرض نہیں لوں گا۔ جیسے ہی حضرتؒ نے یہ عہد کیا تو بابا صاحبؒ نے ان کی طرف دیکھا اور وہ گلیم جس پر حضور اس وقت بیٹھے ہوئے تھے۔ آپؒ کو عطا فرمائی اور ارشاد فرمایا تم کو انشاء اللہ قرض کی

ضرورت بھی نہیں ہوگی۔

چور کو ولایت بخش دی

اس زمانے میں اوچ شریف میں ایک بڑے عالم و فاضل مولانا عارفؒ رہا کرتے تھے اور وہ جناب بابا صاحبؒ سے عقیدت و محبت رکھتے تھے ایک دن انہوں نے حاکم اوچ سے کہا کہ میں اجودھن حضرت شیخ العالمؒ کی زیارت کے لئے جا رہا ہوں۔ حاکم بھی حضرتؒ سے عقیدت رکھتا تھا اس نے ایک سو روپیہ مولاناؒ کو دیئے اور کہا کہ یہ رقم میری طرف سے حضرت کو نذرانہ پیش کر دینا جب مولانا عارفؒ اجودھن یعنی پاک پتن پہنچے تو خیال آیا کہ حاکم نے کوئی خط تو تحریر کیا ہی نہیں جس سے رقم کا تعین ہوا گر میں نصف روپیہ بچا لوں تو کیا حرج ہے اس خیال کے آتے ہی مولانا نے پچاس روپیہ خود رکھ لئے اور پچاس روپیہ جناب بابا صاحبؒ کی خدمت میں پیش کر دیئے اور عرض کیا کہ حضور یہ روپیہ حاکم کی طرف سے نذرانہ ہے۔۔۔۔۔۔۔

حضرت شیخ شیوخ العالم جناب بابا صاحبؒ نے مسکرا کر مولانا عارف کی طرف دیکھا اور فرمایا مولانا عارف خوب نصفا نصفی برادرانہ تقسیم کی ہے مولانا نے کہا کیا بابا صاحبؒ نے فرمایا؟۔ یہی کہ روپیہ کی تقسیم نصفا نصفی خوب کی ہے یہ سن کر مولانا عارف بہت شرمندہ ہوئے اور پھر ان دوسرے پچاس روپیہ کے ساتھ اپنا تمام سرمایہ حضور بابا صاحبؒ کی خدمت میں پیش کر دیا اور اسی وقت بیعت کی حضرتؒ نے بھی بڑا لطف و کرم فرمایا۔ سیستان کا صاحب خدمت یعنے قطب بنا کر روانہ کر دیا۔

آنا نکہ خاک را بنظر کیمیا کنند
آیا بود کہ گوشہ چشم بما کنند

گم شدہ بیوی کے مل جانے کا حال

پاک پتن شریف سے تقریباً ۲۴ میل دور دیپال پور کا قصبہ ہے ترکوں کے دور حکومت میں یہ بڑی اہم سرحدی چھاؤنی تھی۔ مغلوں کی روک تھام کے لئے اس چوکی پر مضبوط اور تجربہ کار جرنیل رہا کرتے تھے۔ سلطان محمد خان المعروف بہ خان شہید اسی سرحد پر مغلوں کے ہاتھوں شہید ہوا تھا۔ بابا صاحبؒ کے زمانہ میں یہاں کے کسی گاؤں میں مال دار تیلی رہا کرتا تھا۔ اور اس کو اپنی حسین و جمیل بیوی سے بے حد محبت تھی۔ ایک مرتبہ کچھ ظالموں نے گاؤں کو لوٹ لیا۔ اور اس لوٹ مار میں تیلی بھی لٹا اور اس کی بیوی بھی اس سے بچھڑ گئی بہت جستجو اور کوشش کی لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا معاً تیلی نے خیال کیا کہ بابا فریدؒ کے حضور میں چلوں سنتے ہیں کہ وہاں آدمی جس مقصد لے کر جاتا ہے اللہ تعالیٰ وہ پورا کر دیتا ہے۔

یہ سوچ کر وہ تیلی حضرت شیخ العالم جناب بابا صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور رو رو کر اپنی بپتا سنائی۔ حضرتؒ نے اس کی آہ و زاری دیکھی اور سارا حال سنا تو فرمایا یہ بھوکا بھی ہے اس کو کھانا کھلاؤ۔ تیلی نے عرض کیا حضور جب تک میری بیوی نہیں ملے گی میں کھانا نہیں کھاؤنگا۔ آپؒ نے فرمایا اللہ تعالیٰ قادر ہے اس کو بھی ملا دے گا تو کھانا تو کھا! کھانا لایا گیا۔ تیلی نے لقمہ اٹھایا اور منہ میں رکھا وہ حلق میں پھنس گیا۔ آپؒ نے اس کی یہ حالت دیکھی تو فرمایا۔ گھبراؤ نہیں پانی پیو۔ کھانا کھاؤ اور تین دن میرے پاس رہو۔

تیسرے دن ایک سرکاری منشی زنجیروں میں جکڑا ہوا آپؒ کی خدمت میں آیا۔ اور اس نے حضرتؒ سے عرض کی حضور ان سپاہیوں کی منت سماجت کر کے یہاں تک پہنچا ہوں۔ میں بے گناہ ہوں میرے مخالفین نے بادشاہ کو میرے خلاف جھوٹے الزامات سے بھڑکایا ہے۔ آپ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس بلا سے نجات دے۔ یہ کہہ کر وہ منشی رونے لگا۔

آپؒ نے منشی سے فرمایا جاؤ! تم باعزت بری ہو گے۔ بلکہ تم انعام و اکرام سے نوازے جاؤ گے اور اس انعام میں تم کو ایک لونڈی ملے گی اور وہ لونڈی تم (تیلی کی طرف

اشارہ کر کے) اس کو دے دینا وہ منشی حضرتؒ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ سنتے ہی آپؒ کے قدموں میں گر پڑا اور پھر کھڑے ہو کر تیلی سے چلنے کے لئے کہا۔ تیلی نے جانے سے انکار کر دیا۔ اور حضرت بابا صاحبؒ سے عرض کی کہ اگر چہ میں لٹ چکا ہوں مگر ابھی میرے پاس اتنی دولت موجود ہے میں چند لونڈیاں خرید سکتا ہوں۔ مجھے تو اپنی بیوی چاہیے۔ میں لونڈی ہرگز نہیں لوں گا۔ آپؒ نے فرمایا کہ تم اس کے ساتھ جاؤ تو سہی اللہ تعالیٰ بڑا کارساز ہے۔

وہ تیلی حضرتؒ کے اس ارشاد پر بادل ناخواستہ منشی کے ہمراہ روانہ ہوا۔ جب یہ منشی امیر کی خدمت میں پہنچا تو امیر نے اس کو چھوڑنے کا حکم دیا اور اس کے ساتھ بڑی مہربانی اور نوازش سے پیش آیا۔ پھر حکم دیا کہ اس کو انعام واکرام اور خلعت اور گھوڑا دو اور وہ لونڈی بھی اس کو دے دو۔ جو ابھی ہمارے پاس آئی ہے۔

جب اس کو یہ چیزیں مل گئیں اور یہ واپس ہوا تو اس نے تیلی سے کہا یہ لونڈی تمہاری ہے۔ تیلی نے جب لونڈی کی طرف سے دیکھا تو وہ اس کی بیوی تھی۔ بہت خوش ہوا کہ حضرتؒ کے تصرف سے مجھے میری گم شدہ بیوی مل گئی ہے۔

قریب المرگ بیمار فوراً تندرست ہو گیا

غور کے رہنے والے دو حقیقی بھائی اجودھن رہا کرتے تھے ان میں سے ایک جس کا نام محمد شاہ تھا۔ ایک دن ایسی کیفیت پیدا ہوئی کہ وہ سرکاری ملازمت ترک کر کے فقیر ہو گیا۔ اور جناب بابا صاحبؒ کی خدمت میں رہنے لگا دوسرا بھائی اپنے بچوں کے ساتھ اپنے بھائی کے بال بچوں کی خبر گیری بھی کرتا تھا اتفاق سے یہ دوسرا بھائی سخت بیمار ہو گیا اور یہاں تک کہ اس کی حالت خراب ہوئی کہ لوگوں نے سمجھ لیا کہ یہ کچھ دیر کا مہمان ہے اور تجہیز و تکفین کی تیاری کرنے لگے۔

محمد شاہ یہ حال دیکھ کر نہایت بے قراری کے ساتھ روتا ہوا حضرت شیخ شیوخ العالم جناب بابا صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا آپؒ نے محمد شاہ کو اس طرح دیکھا تو پوچھا محمد شاہ یہ کیا حال بنا رکھا ہے؟۔ اس نے رو رو کر عرض کی حضور واقف ہیں میرا ایک بھائی ہے جو میرے بیوی بچوں کی بھی خبر گیری کرتا ہے وہ بیمار ہو گیا ہے اور اب اس کی یہ حالت ہے کہ شاید میرے آتے آتے ہی اس کی روح پرواز کر گئی ہو۔ اگر خدانخواستہ ایسا ہوا تو میرا سب کام درہم برہم ہو جائے گا۔ آپؒ نے محمد شاہ کی یہ بات سنی اور اس کی بے قراری دیکھی تو آپؒ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور آپؒ نے فرمایا محمد شاہ! ہم تو تیرے بھائی کو تندرست دیکھ رہے ہیں اور وہ چارپائی پر بیٹھا کچھ کھا رہا ہے اور پھر فرمایا محمد شاہ! جو اضطراب اور بے چینی تجھ کو اس وقت اپنے بھائی کی جدائی کے خیال سے ہے حق تعالیٰ کی محبت میں میری ہر وقت یہی حالت ہے مگر نے آج تک یہ بات کسی پر ظاہر ہونے نہیں دی ہے۔ محمد شاہ یہ سن کر فوراً قدم بوس ہوا۔ اور پھر اپنے گھر آیا دیکھا تو واقعہ اس کا بھائی تندرست ہے اور چارپائی پر بیٹھا کچھ کھا رہا ہے۔

قضا		تمہید	پاپوش	رضائش
اثر	خط	کف	دست	وعائش

میر شکار کا واقعہ

حضرت مخدوم نصیر الدین چراغؒ دہلی فرماتے ہیں کہ پاکپتن شریف کے قریب ایک قصبہ ہے وہاں ایک ترک حاکم تھا جو بہت تند مزاج تھا اور اپنی سخت گیری کے سبب دور ونزدیک مشہور تھا۔ اس کے پاس ایک باز تھا جس کو وہ بہت محبوب رکھتا تھا ترک مذکور نے اپنے باز دار کو حکم دیا ہوا تھا کہ میری عدم موجودگی میں کبھی اس باز کو شکار پر نہ چھوڑنا اگر تو نے کبھی ایسا کیا اور باز چلا گیا تو اپنی اور اپنے اہل و عیال کی خیر نہ سمجھنا۔

اتفاقاً ایک دن وہ باز دار اپنے دوستوں کے ساتھ گھوڑوں پر سوار کہیں جا رہا تھا کہ چند کلنگ اڑتے ہوئے نظر آئے دوستوں نے باز دار سے کہا کہ یار مفت میں شکار نکلا جا رہا ہے باز کو ان پر چھوڑ دے۔ باز دار نے ترک کا حکم سنایا۔ دوستوں نے کہا کہ ہم سب گھوڑوں پر سوار ہیں باز کہاں چلا جائیگا؟۔ فکر نہ کر ہم سب اس کو پکڑ لیں گے۔ باز دار دوستوں کے اصرار پر راضی ہو گیا۔ اور اس نے باز کلنگ پر چھوڑ دیا۔ باز چھوٹتے ہی کلنگ پر جانے کی بجائے دوسری سمت تیزی سے چلا گیا۔ باز دار اور اس کے دوست بھی گھوڑوں پر اس کے پیچھے چلے مگر تھوڑی دیر میں باز نظروں سے غائب ہو گیا اور سب دوست بھی مایوس ہو کر متفرق ہو گئے۔

باز دار کچھ دوران دوستوں کے چلے جانے کے بعد بھی باز کی سمت چلتا رہا آخر اس نے سوچا کہ اس طرح جنگل میں مارا مارا پھرنے سے کیا حاصل ہوگا۔ لاؤ گھوڑا بیچ کر قلندر ہو جاؤں اور پوشیدہ کسی ملک میں چلا جاؤں۔ پھر خیال آیا اگر اس طرح میں نے جان بچا بھی لی تو میرے پس غیبت میرے اہل وعیال کا کیا حشر ہوگا۔ وہ ظالم ترک خدا معلوم ان سے کس طرح پیش آئے اور کسی عذاب سے ان کو مارے اس خیال کے آتے ہی اس کا رونگٹا رونگٹا کھڑا ہو گیا اور انتہائی مایوسی کے عالم میں اس کو برگزیدہ حق حضرت شیخ العالم بابا صاحبؒ کا خیال آیا کہ مایوسوں اور مضطرب حالوں کی یہی امید گاہ تھی اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم حضرت شیخ العالم بابا صاحبؒ کے فیضان کی صورت میں ظاہر ہو رہا تھا۔ ہر دکھ کا علاج ہر مرض کی دوا ہر مشکل کا حل ہر رنج سے خلاصی یہاں ہوتی تھی اور اب بھی یہاں ہوتی ہے۔

اس خیال کے آتے ہی جیسے کسی نے اس کو امید کی روشنی دکھائی پس پھر کیا تھا فوراً پاکپتن شریف کا رخ کیا اور چل پڑا یہاں پہنچ کر باز دار نے حضرت بابا صاحبؒ کے قدم پکڑ لئے اور رونا شروع کر دیا اور گویا یوں عرض کی۔

زندگی غم کی کڑی دھوپ میں دم لینے کو
آپ کے سایہ دیوار تک آ پہنچی ہے

حضور میرے بال بچوں پر رحم فرما کر مجھے بچا لیجئے۔

حضرتؒ نے پوچھا واقعہ کیا ہے اس نے سب حال عرض کیا آپ نے واقعہ سن لینے کے بعد سب سے پہلے اس کے لئے کھانا منگوا اور اس سے کہا کہ پہلے کھانا کھا۔ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ تیرا گم شدہ باز تجھ اسی جگہ مل جائے باز دار نے عرض کی حضور کھانا کھائے ہوئے دو روز ہو گئے ہیں۔ کھانا کس کو اچھا لگتا ہے آپؒ نے فرمایا تو کھانا کھا لے پھر دیکھ قدرت سے کیا ظہور میں آتا ہے۔ اس نے لقمہ اٹھایا منہ میں رکھا۔ مگر پھر عرض کیا حضور جب ترک نے سنا ہوگا کہ باز دار باز اڑا کر خود بھی بھاگ گیا۔ تو نہ معلوم میرے بچوں پر کیا مظالم ڈھا رہا ہوگا یہ کہا اور رونے لگا۔

حضرت شیخ العالمؒ نے فرمایا۔ کھڑے ہو کر دیکھ تیرا باز وہ شہر پناہ کے کنگورہ پر بیٹھا ہوا ہے جا کر پکڑ لا۔ باز دار نے جب باز دیکھا تو قریب تھا کہ شادی مرگ ہو جائے فوراً دوڑتا ہوا اس طرف گیا اور بلاؤنی کمر سے کھول کر باز کو دکھائی باز فی الفور اس کے ہاتھ پر آن بیٹھا۔ اس نے پکڑ لیا۔ اور حضرتؒ کی خدمت میں لایا اور ہاتھ جوڑ کر عرض کی حضور یہ گھوڑا میری طرف سے نذر قبول فرمائیں۔ میں آپ کا بندہ بے دام ہوں آپؒ نے فرمایا اس گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے گھر پہنچ اور اس باز کو ترک کے پاس پہنچا۔ تا کہ تیرے بال بچے بھی محفوظ رہیں۔ پھر اس گھوڑے کو فروخت کر کے آدھی قیمت مجھے فقراء کے لئے دیجئے اور آدھی اپنے بال بچوں میں صرف کیجئیو۔ یہ سن کر باز دار نے زمین ادب سے چومی اور روانہ ہوا۔ ادھر حاکم کو خبر ہو چکی تھی کہ باز دار نے باز گم کر دیا ہے اور خود بھی فرار ہو گیا ہے وہ اس کے بچوں سے پوچھ گچھ ہی کر رہا تھا کہ باز دار آ گیا۔

حاکم نے اس سے کیفیت پوچھی اور باز دار نے سب حال بیان کر دیا۔ ترک نے حضرت شیخ العالمؒ کا یہ حال سن کر کہا وہ صاحب تصرف بزرگ معلوم ہوتے ہیں۔ پھر کچھ روپیہ باز دار کو دے کر کہا کہ یہ روپیہ میری طرف سے بھی نذر پیش کرنا۔

باز دار نے اپنا گھوڑا فروخت کیا اور آدھی قیمت اپنے بچوں کو دی اور آدھی قیمت اور ترک کی نذر کا روپیہ لے کر حضرت جناب بابا صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا حضرت سے بیعت کی اور پھر حضرتؒ ہی کا ہو رہا۔ کچھ دن بعد ترک نے بھی حاضر ہو کر

بیعت کی اور نیکوکار ہو گیا۔

غرضیکہ جو لوگ اپنی دینی یا دنیاوی مراد سے حضرتؒ کی شفقت اور مرحمت سے شاد کام واپس جاتے۔ آپؒ کے ذریعہ ہزاروں بھٹکے ہوئے لوگ اپنے خالق و مالک ذوالجلال کی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہو جاتے تھے۔ گویا یہ کرامات ذریعہ تھیں۔ لوگوں کو خدا تعالیٰ کے آستانے پر بلانے کا

مفلسی کا علاج

حضرت شیخ شیوخ العالمؒ بابا صاحب کا قاعدہ تھا کہ کوئی دینی مشکل ہو یا دنیاوی ہر بات میں لوگوں کو اللہ تعالیٰ اور رسول کی طرف توجہ دلاتے تھے۔ جب کوئی شخص حضرت کی خدمت میں اپنی پریشانی ظاہر کرتا تو آپؒ اس کو نماز پڑھنے اور تلاوت قرآن پاک کی تلقین فرماتے تھے روزانہ یہی ہوتا رہتا تھا۔

ایک دن ایک شخص نے حاضر ہو کر اپنی مفلسی اور تنگدستی کا ذکر کیا اور دعا کا خواہاں ہوا۔ آپؒ نے پہلے اس کے لئے دعا کی پھر اس سے کہا تم رات کو سوتے وقت سورۃ جمعہ پڑھا کرو۔

فقراء کے مخالف لوگ

افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ چند نام نہاد مولویوں اور قاضیوں نے فقراء کی مخالفت کر کے عوام میں یہ خیال پیدا کر دیا ہے کہ مولوی ملا لوگ ہمیشہ فقیروں کے مخالف ہوتے ہیں اور اس محترم و مکرم گروہ کو تکلیفیں اور اذیتیں دینا ان کا دلچسپ مشغلہ ہوتا ہے کیونکہ علماء کو درویشوں اور فقیروں کا اثر و رسوخ اور ہر دلعزیزی اچھی نہیں لگتی اور یہ ان کو

ستاتے رہتے ہیں۔

لیکن یہ بات اچھی طرح ذہن نشین رکھئے کہ تاریخ و سیر میں ایسی افسوسناک مثالیں چھوڑ جانے والے صرف چند مولوی گذرے ہیں جو کم علمی، حسد اور حب جاہ کے مریض تھے۔ سب عالم ایسے نہیں ہوتے۔ بلکہ علمائے حق خود درویش اور درویشوں کے غلام رہے ہیں۔

اجودھن کے قاضی کی دشمنی

غلط قسم کے علماء میں سے ایک شخص عبداللہ نامی تھا جو اجودھن کا قاضی گذرا ہے۔ اسلامی عہد حکومت میں قاضی کو وہی اختیارات حاصل تھے جو آج کل جج کو ہوتے ہیں۔ اس قاضی کو جناب بابا صاحبؒ کا اثر رسوخ اور آپؒ سے عوام کو بے پناہ محبت ناگوار تھی وہ اپنی نجی مجلسوں سے لے کر ممبر تک آپ کو برا کہتا تھا خصوصاً جس مجلس میں جناب بابا صاحبؒ کے صاحبزادگان یا مریدان اور معتقدان میں سے کوئی موجود ہوتا تھا تو جناب بابا صاحبؒ کو برا کہہ کر بہت خوش ہوتا تھا۔ اور آپ پر الزام تراشتا تھا غرضیکہ وہ اس دشمنی میں اس قدر اندھا ہو گیا تھا کہ اس کو اپنے خسران آخرت کا بھی خیال جاتا رہا تھا۔

کشندہ کشندہ باشد

ایک دن جناب بابا صاحبؒ کے صاحبزادے جناب شیخ شہاب الدین کسی مجلس میں موجود تھے کہ قاضی نے آپ کو وہاں دیکھا اور جناب بابا صاحبؒ کی شان میں گستاخیاں کیں۔ شیخ شہاب الدین نے واپس آ کر تمام حال جناب بابا صاحب کی خدمت میں عرض کیا اور کہا کہ قاضی کو ہم سے کچھ ایسی خصومت پیدا ہو گئی ہے کہ جہاں ہم ہیں ست

کسی کی صورت دیکھتا ہے چراغ پا ہو جاتا ہے اور جو کچھ وہ کہتا ہے سنا نہیں جاتا حالانکہ آج تک آپ کے ارشاد گرامی پر عمل کرتے ہوئے ہم نے کبھی اس کی ناگفتنی کا جواب نہیں دیا ہے کوئی محفل ہو کسی قسم کے احباب جمع ہوں مگر وہ آپ کی توہین سے باز نہیں رہتا۔

جناب بابا صاحبؒ نے یہ سب باتیں سنیں اور فرمایا ''کشندہ کشندہ باشد'' (یعنی برداشت کرنے والا مار ڈالتا ہے)۔

قاتلانہ حملہ

حضرت بابا صاحبؒ کے تحمل اور عفو و درگذر کے باوجود قاضی جی نے اپنے دل کی اصلاح نہ کی اور وہ یہاں تک خراب ہوا کہ اس نے جناب بابا صاحبؒ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنا لیا اور ایک ترک غنڈے کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ کچھ اجرت لے کر جناب بابا صاحبؒ کا خاتمہ کر دے۔

حضرتؒ کی عادت تھی کہ ہر نماز کے بعد طویل سجدے کیا کرتے تھے اور اگر سردی کا موسم ہوتا تو پوستین اوپر ڈال لیتے تھے ایک دن صبح کی نماز کے بعد قاضی کا فرستادہ غنڈہ خنجر لے کر اوپر چادر اوڑھ کر مسجد میں آیا۔ بابا صاحبؒ اس وقت سجدہ میں تھے سردی کا موسم تھا اور آپ پر اس وقت پوستین پڑی ہوتی تھی اور اتفاقاً مسجد میں کوئی نہ تھا حضرتؒ کے پیچھے صرف حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ بیٹھے تھے اس ترک غنڈے نے آکر زور سے ایک قلندرانہ صدا لگائی اور پھر حضرت بابا صاحبؒ کی طرف بڑھا حضرت بابا صاحبؒ نے سجدہ ہی سے پکار کر کہا یہاں کوئی موجود ہے؟۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے کہا کہ غلام حاضر ہے۔

آپ نے فرمایا میری طرف ایک ترک آ رہا ہے جس کا قد درمیانہ اور رنگ زرد ہے۔ آپؒ نے اس کی طرف دیکھا اور عرض کی جی ہاں جناب بابا صاحبؒ نے فرمایا کہ اس

کی کمر میں ایک زنجیر پڑی ہوئی ہے ترک نے جب یہ باتیں سنیں تو رک گیا۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء نے کہا۔ جی ہاں پھر آپؒ نے فرمایا کہ اس کے کان میں ایک آویزہ ہے جس میں سفید رنگ کا نگ بھی ہے حضرت خواجہ نظام الدینؒ اولیاء نے اس کی طرف دیکھا اور کہا جی ہاں ایسا ہی ہے۔

جیسے ہی قلندر نے یہ بات سنی وہ ڈر گیا۔ پھر جناب بابا صاحبؒ نے فرمایا۔ نظام الدینؒ اس کی بغل میں ایک خنجر بھی ہے جسے اس نے چادر میں چھپایا ہوا ہے اس سے کہہ دو کہ بھاگ جائے ورنہ خراب ہوگا۔ جیسے ہی ترک غنڈے نے یہ باتیں سنیں گھبرا گیا اور فوراً ہی بھاگ کھڑا ہوا حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے اس کا پیچھا کرنا چاہا مگر بابا صاحبؒ نے ان کو منع کر دیا۔

دشمن قدموں میں

اس منصوبے کی ناکامی سے قاضی کو بڑی تکلیف ہوئی اور اس نے ایک اور قلندر کو اس بات پر آمادہ کیا اور لالچ وغیرہ دے کر جناب بابا صاحبؒ کی طرف بھیجا تاکہ وہ آپ کو گالیاں نکالے۔

یہ قلندر بابا صاحبؒ کے پاس آیا تو اس وقت آپ اپنے سجادہ پر بیٹھے ہوئے تھے اور پیٹی میں مولانا سید بدرالدین اسحاقؒ بخاری حاضر تھے اور حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ ان کے پیچھے کھڑے تھے اس قلندر نے نہایت کرخت آواز میں حضرت شیخ العالمؒ کو مخاطب کر کے کہا میں نے سنا ہے کہ تو نے اپنے تئیں بت بنا رکھا ہے اور لوگوں سے اپنے کو سجدے کراتا ہے حضرت بابا صاحبؒ نے جواب دیا۔ ''میں نے جو کچھ بنایا ہے اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے۔'' قلندر نے نہایت گستاخانہ لہجہ میں چیخ کر کہا نہیں تو نے اپنے تئیں خود ایسا بنایا ہے۔ حضرتؒ نے ارشاد فرمایا ''کس کو طاقت ہے کہ اپنے آپ کچھ بن بیٹھے سوائے اللہ

تعالیٰ کے کہ وہ اپنے فضل و کرم سے کسی کو نواز دے۔

یہ بات آپ نے کچھ ایسے انداز میں فرمائی کہ قلندر لا جواب اور شرمندہ ہو گیا اور فوراً آپؒ کے قدموں میں گر پڑا۔ اور کہا آپ نے بالکل سچ فرمایا ہے۔ آفرین ہے آپؒ کی برداشت پر جب تک یہ جہاں آباد رہے خدا کرے آپ کا تحمل اسی شان و شوکت سے قائم رہے یہ کہا اور چلا گیا۔

اجودھن کا مذکورہ قاضی ہمیشہ حضرت بابا صاحبؒ کے درپے آزار رہتا تھا اور آپ کا بُرا چاہتا تھا اور آپ کو بُرا کہتا رہتا تھا سب جانتے ہیں کہ بُرا چاہنا بُرا کہنے سے بھی زیادہ بدتر ہے مگر حضرتؒ نے اس کی ان برائیوں کا کبھی کوئی جواب نہیں دیا ہمیشہ عفو و درگزر و رحم و کرم سے کام لیا۔ وہ ہر روز حضرتؒ کو زک پہنچانے کے لئے نئی نئی تجویزیں سوچتا رہتا تھا اور جب ایک تدبیر ناکام ہو جاتی تو کھسیانہ ہو کر دوسری پر عمل کرتا تھا جب اس کی ہر تدبیر ناکام ہو گئی تو وہ ملتان گیا اور وہاں کے فضلاء اور علماء سے فتویٰ طلب کیا۔

حضرت بابا صاحبؒ کیخلاف فتویٰ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین مفتیان شرع متین بیچ اس مسئلہ کے کہ ایک شخص عالم ہے اور اپنے آپ کو درویش کہلواتا ہے ہمیشہ مسجد میں رہتا ہے اور وہاں سرود سنتا ہے اور اس پر رقص کرتا ہے۔

ملتان کے علماء نے قاضی سے پوچھا ایسا کون شخص ہے جس کے متعلق تو یہ کہتا ہے قاضی نے حضرت شیخ العالم بابا صاحبؒ کا اسم گرامی لیا جب علمائے نے حضرتؒ کا نام نامی سنا تو سب نے قاضی سے منہ پھیر لیا اور کہا قاضی! افسوس ہے تیرے اوپر تو ہم سے ایسے برگزیدہ حق اور پاک شخص کے متعلق فتویٰ لینا چاہتا ہے جس کے سامنے مجتہد وقت کو بھی زبان کھولنے کی جرات نہیں ہو سکتی ان کا قول و فعل تو علماء کے لئے حجت ہے۔ تجھے حسد نے

صراط مستقیم سے ہٹا دیا ہے اپنی دنیا و آخرت خراب نہ کر۔ اور ایسی باتوں سے باز آ جا ورنہ انجام اچھا نہ ہو گا۔ یہ سن کر قاضی واپس چلا آیا۔

قاضی کا حشر

غرض کہ قاضی مذکور حضرت بابا صاحبؒ کی مخالفت میں رات دن مصروف رہتا تھا۔ ایک دن جمعہ کی نماز میں قاضی کے نائب نے غلطی کی۔ حضرتؒ نے فرمایا نماز دوبارہ پڑھائی جائے حضرتؒ کی زبان مبارک سے یہ نکلنا تھا کہ سب لوگوں نے نماز لوٹانے کا مطالبہ کیا۔ اس پر نائب قاضی نے نماز تو دوبارہ پڑھا دی مگر خود قاضی بہت برافروختہ ہوا اور کہنے لگا دنیا بھر کے کام چور مفت خور مسنڈے یہاں جمع ہیں اور اب شریعت کے کاموں میں بھی مداخلت کرنے لگے ہیں مگر میں اس مداخلت کو برداشت نہیں کروں گا اور بہت جلد ہی اس کا انتظام کر دوں گا۔ قاضی یہ اور اس کی طرح باتیں کر رہا تھا کہ غضب الٰہی کو حرکت ہوئی اور یکدم قاضی پر فالج اور لقوہ گرا اور اس کا منہ ٹیڑھا ہو گیا اور وہ منبر سے نیچے گر پڑا۔ لوگ وہاں سے اٹھا کر اس کو گھر لے گئے قاضی نے گھر والوں سے کہا کہ مجھے حضرت بابا صاحبؒ کے پاس لے چلوان کے برا کہنے کی وجہ سے میں اس حال میں مبتلا ہوا ہوں۔ چنانچہ قاضی کے رشتہ دار قاضی کو چارپائی پر ڈال کر اور ایک ٹوکرا شکر کا ایک بکری نذر کیلئے لے کر جناب بابا صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے حضرت بابا صاحبؒ نے پوچھا قاضی جی! کیا حال ہے؟ قاضی سے جواب نا دیا جا سکا۔ پھر آپ نے فرمایا ۱۸ سال سے تم مجھ کو جو تمہارا دل چاہتا تھا کہتے رہے ہو مگر میں نے کبھی تمہارے فرمودات پر توجہ نہیں دی ہمیشہ اپنے مریدوں اور بچوں کو یہی نصیحت کرتا رہا ہوں کہ صبر و برداشت عفو و درگزر سے کام لو۔ اب تمہارا فیصلہ خدا تعالیٰ کے اختیار میں ہے یہ کہہ کر آپ نے قرآن شریف کھولا تو اس میں یہ آیت نکلی آپ نے قاضی کو یہ آیت یعنی اے نوح وہ تمہارے اہل میں سے نہیں ہے بے

شک اس کے عمل غیر صالح ہیں سنائی اور فرمایا یہ خدائی فیصلہ ہے اپنی بکری شکر واپس لے جاؤ۔ میں تمہاری نذر قبول نہیں کر سکتا۔ یہ سن کر قاضی کے رشتہ داروں نے اس کی چار پائی اٹھائی اور گھر واپس چلے راستے میں قاضی کا انتقال ہو گیا۔

باباصاحبؒ کا سفارشی

غیاث الدین بلبن کے نام

فقراء کی نظر ہر معاملے میں فاعلِ حقیقی پر رہتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو کارساز نہیں مانتے۔ وہ اپنے مریدین و معتقدین کو ہر صورت سے اس عقیدے پر کلی اعتقاد و یقین کرنا سکھاتے ہیں کہ بھروسہ کے قابل وہی ذات ہے اور اصل کارساز موثر حقیقی اور مالک حقیقی وہی ہے اپنے ہر کام میں اسی سے مدد مانگنی چاہیئے۔

وہ چاہتا ہے تو اسباب فراہم ہو جاتے ہیں اور کام بن جاتے ہیں وہ نہیں چاہتا تو بنے ہوئے اسباب بھی ختم ہو جاتے ہیں دینے والا وہی ہے وہ دے تو کوئی روک نہیں سکتا اس کے حکم کو رد کرنے والا کوئی نہیں ہے یہی تعلیم ہے جس کو فقراء ہر روز بلکہ ہر وقت حکمت و موعظت کے ذریعے اپنے مریدین و معتقدین میں یقین کامل تک پہنچا دیتے ہیں شخص حکومت کے زمانہ میں جب کہ لوگ بادشاہ کو ظل الٰہی سمجھ کر سجدہ تک کیا کرتے تھے۔ ایک درویش کی تحریر کو دیکھئے کیا حق گوئی اور فصاحت ہے سبحان اللہ۔

ایک دن ایک شخص حضرت شیخ العالم باباصاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی حضور بادشاہ کے نام ایک سفارشی خط لکھ دیجئے تاکہ میرا کام ہو جائے آپ نے اس سے فرمایا کام کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے میں تمہارے لئے دعا کرتا ہوں۔ اس نے کہا حضور اگر بادشاہ کو خط لکھ دیں تو میرا کام فوراً ہو جائے گا حضرت نے ارشاد فرمایا میں تمہیں خط لکھوائے دیتا ہوں لیکن یہ بات یاد رکھو کہ کارساز اللہ تعالیٰ ہے پھر آپ نے اس کو

یہ خط لکھوا دیا۔

یعنی میں نے اس شخص کی ضرورت اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کی پھر تیرے پاس بھیجا اگر تو اس کو کچھ دے گا تو عطا اللہ تعالیٰ کی ہوگی اور یہ شخص تیرا مشکور ہوگا۔ اور اگر کچھ نہ دے گا تو روک خدا کی طرف سے ہوگی اور تو معذور سمجھا جائے گا۔

مجھے جاگیر نہیں چاہیئے

سلطان ناصر الدین غازی ابن سلطان شمس الدین التمش نہایت نیک سرشت اور پرہیزگار بادشاہ گزرا ہے تاریخ میں اس کو درویش بادشاہ کہا جاتا ہے۔ وہ کسی ملکی ضرورت کے سبب ملتان جا رہا تھا جب نہر والہ کے قریب پہنچا تو غیاث الدین سے کہا جو اس وقت نائب السلطنت تھا اور الغ خاں کہلاتا تھا۔ کہ میں حضرت باباصاحبؒ کی زیارت کے لئے اجودھن جانا چاہتا ہوں۔ الغ خاں نے کہا راستے میں پانی کی قلت ہے اس عظیم لشکر کے ساتھ جانا تکلیف کا باعث ہوگا۔ آپ ملتان کی طرف چلئے میں آپ کی طرف سے نذرانہ لے جاتا ہوں۔ بادشاہ نے اس تجویز کو پسند کیا اور کچھ نقد روپیہ اور چار گاؤں کا فرمان نذر میں بھجوا دیا۔

الغ خاں نذر لے کر اجودھن پہنچا اور سوچنے لگا کہ بادشاہ کے اولاد نہیں ہے اگر شیخ العالم باباصاحبؒ دعا فرما دیں اور مجھے بادشاہت مل جائے تو کیا ہی اچھا ہو۔ یہ سوچ کر وہ حضرتؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور بادشاہ کی نذر پیش کی۔ جناب باباصاحبؒ نے الغ خاں سے کہاں مجھے جاگیر نہیں چاہیئے۔ نقد روپیہ مجھے دے دو۔ درویشوں اور فقیروں کے ساتھ مل کر اسے خرچ کر لوں گا۔ جاگیر کے خواہش مند اور دوسرے بہت موجود ہیں یہ فرمان واپس لے جاؤ۔ اور اس کے چاہنے والوں کو دے دو۔ پھر فرمایا الغ

[illegible]

فریدوں فرخ فرشتہ نہ بود — زعود و زعنبر سر شتہ نہ بود
زواد و دہش یافت آن نکوائی! — تو داد و دہش کن فریدوں توئی

یعنی فریدوں بادشاہ فرشتہ نہ تھا۔ اس نے داد و دہش کی، ضرورت مندوں کو خوب دیا تھا۔ اس سے اس کو نیکی حاصل ہوئی تو بھی داد و دہش کر فریدوں بن جائے گا۔

یہ سن کر الغ خاں بہت خوش ہوا اور اس نے جھک کر حضرتؒ کے قدم چوم لئے اور ہاتھ جوڑ کر عرض کی کہ میں آپؒ کا خادم اور دعا کا محتاج ہوں اور ساری عمر خادم ہی رہوں گا۔ آپؒ نے فرمایا۔ ''فریدوں توئی''

اس واقعہ کے تھوڑے ہی دنوں بعد ناصر الدین کا انتقال ہوگیا، اور الغ خاں بادشاہ ہوگیا۔

عشق بازی

حضرت شیخ الاسلام بہاؤ الدین ذکریا ملتانیؒ اور شیخ شیوخ العالم جناب بابا صاحبؒ کے درمیان بہت محبت تھی۔ اور جناب بابا صاحبؒ جب کبھی حضرت بہاؤ الحقؒ کو خط لکھتے یا گفتگو میں آپؒ کا ذکر کرتے تو شیخ الاسلام بہاؤ الدین ذکریاؒ فرماتے لوگوں نے پوچھا آپ حضرتؒ کا نام نامی لیتے ہیں تو شیخ الاسلام ضرور کہتے ہیں آپؒ نے جواب دیا میں نے لوح محفوظ پر ان کے نام کے ساتھ شیخ الاسلام لکھا ہوا دیکھا ہے۔

اتفاقاً کسی بات پر دونوں میں بدمزگی ہوگئی تو حضرت شیخ الاسلام بہاؤ الدین ذکریاؒ ملتانیؒ نے جناب بابا صاحبؒ کو خط بھیجا۔ اس میں تحریر فرمایا کہ میرے اور تمہارے درمیان عشق بازی ہے۔ کہ تم کو مجھ سے ناراض نہیں ہونا چاہیئے۔ جناب بابا صاحبؒ نے جواب میں لکھا کہ میرے اور آپ کے درمیان عشق تو ہے مگر بازی نہیں ہے۔

از بہر تو میرم وز برائے تو زیم

حضرت خواجہ نظام الدینؒ اولیاء فرماتے ہیں کہ ایک دن جناب شیخ شیوخ العالم بابا صاحبؒ اپنے حجرہ مبارک میں تھے اور دروازے پر مولانا بدرالدین اسحاقؒ بیٹھے تھے ان کو کوئی ضرورت پیش آئی۔ انہوں نے مجھ کو دروازہ پر بٹھایا اور تاکید کی کہ اندر کوئی جانے نہ پائے میں ابھی واپس آتا ہوں اگر شیخ العالمؒ کو کوئی ضرورت پیش آئے تو فوراً حاضر ہو جانا۔ وہ تو یہ کہہ کر چلے گئے تھوڑی دیر کے بعد میں نے کیواڑ کی دراز میں سے دیکھا حضرتؒ کا عجیب حال تھا۔ ڈارھی آنسوؤں سے تر تھی۔ چہرہ کا رنگ متغیر تھا کبھی سجدہ کرتے تھے کبھی رقص کرتے تھے اور کبھی یہ رباعی پڑھتے تھے۔

خواہم کہ ہمیشہ در ہوائے تو زیم
خاک شوم و بزیر پائے تو زیم
مقصود من بندہ نہ کونین توئی
از بہر تو میرم وز برائے تو زیم

حضرت نے فرمایا میں نے بار بار دیکھا آخر مجھ سے نہ رہا گیا میں نے کواڑ کھولے اور داخل ہوگیا حضرتؒ اس وقت سجدہ میں تھے میں نے بھی جاتے ہی حضرتؒ کے قدموں میں سر رکھ دیا کچھ دیر بعد حضرتؒ اٹھے اور میری طرف بڑی شفقت سے دیکھا اور از راہ کرم پوچھا کیا چاہتا ہے میں نے ایک باطنی چیز طلب کی فرمایا۔ ''بخشیدم''

اور اس جواب کے ساتھ ہی میں نے اپنے باطن میں اس کو ملاحظہ کیا لیکن بعد میں مجھے خیال آیا کہ کاش میں اس وقت یہ چاہتا ''کہ میرا انتقال محفل سماع میں ہو۔''

حضرت بابا صاحبؒ کے چھوٹے بھائی

آپ کا اسم گرامی حضرت شیخ نجیب الدین متوکلؒ ہے۔ آپ دہلی میں حضرت بابا

صاحبؒ کے خلیفہ اور چھوٹے بھائی کی حیثیت سے رہتے تھے حضرت خواجہ نظام الدینؒ اولیاء نے فرمایا کہ حضرت نجیب الدین متوکلؒ تقریباً ستر سال دہلی میں رہے۔ لیکن اس طرح کہ نہ کہیں مکان بنایا نہ کہیں زمین خریدی اور آپ کے استغراق حق اور بے تعلقی دنیا کا یہ عالم تھا کہ آپ اتنی خبر بھی نہ رکھتے تھے کہ آج کونسا دن ہے اور کونسا مہینہ ہے اور بازار میں کس کس قیمت کے سکے رائج ہیں۔

دہلی کے چھوٹے بڑے عالم اور عامی سب آپ کی خدمت میں دعا کرانے اور برکت حاصل کرنے کے لئے حاضر ہوا کرتے تھے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ بھی جب تعلیم سے فارغ ہوئے تو آپ ہی کی خدمت میں دعا کرانے کے لئے آئے تھے اور آپؒ سے عرض کیا تھا کہ آپ میرے لئے دعا کر دیں۔ کہ میں کہیں کا قاضی ہو جاؤں مگر حضرت متوکلؒ نے آپؒ کی یہ بات سنی ان سنی کر دی پھر جب آپؒ نے دوبارہ عرض کیا تو مسکرا کر جواب دیا کہ! ''بابا تو قاضی مشو، چیزے دیگر شو''۔ (یعنی تم قاضی نہ بنو کچھ اور بنو)۔

چونکہ حضرتؒ بالکل متوکل تھے اس لئے اکثر فقر و فاقہ سے دوچار رہتے تھے ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ آپؒ عید کی نماز کے لئے عید گاہ گئے وہاں چند غیر ملکی درویش موجود تھے جب انہوں نے لوگوں کی عام رجوع حضرتؒ کی طرف دیکھی تو خیال کیا کہ یہ کوئی بہت بڑا شیخ ہے آج اس کے گھر مہمان ہونا چاہیئے۔

یہ سوچ کر وہ نماز عید کے بعد آپؒ کے ہمراہ آپؒ کے گھر آ گئے آپؒ نے ان کو مردانہ میں بٹھایا اور اندر اپنی اہلیہ سے کہا کچھ ہو تو لاؤ چند مہمان آ گئے ہیں۔ آپؒ کی اہلیہ محترمہ نے عرض کیا۔ آپ صاحب خانہ ہیں۔ آپؒ کو معلوم ہے کہ عید کا دن ہے اور ہم سب فاقہ سے ہیں کہاں سے لاؤں؟ میں اور میرے بچے سب خالی ہیں۔ یہ سن کر حضرتؒ نے ان سے کہا اچھا اپنی کوئی چادر دیدو تاکہ بازار میں فروخت کر کے مہمانوں کی خدمت کر دی جائے انہوں نے سر کی چادر اتار کر آپ کے حوالے کر دی اور کہا اس کے سوا میرے پاس اور کوئی چادر نہیں ہے اور اس میں بھی چند پیوند لگے ہیں اسے کون خریدیگا۔

اگر کوئی خرید لے تو بشوق فروخت کر دیجئے۔ جب حضرتؒ نے چادر کی حالت دیکھی تو اس قابل نہ تھی کہ اس کو کوئی خریدے یہ دیکھ کر آپ خاموش ہو گئے اور مکان کی چھت پر چلے گئے اور دل سے یہ کہے جاتے تھے کہ آج عید کا دن ہے اور مہمان گھر پر بیٹھے ہوئے ہیں اور ہمارے ہاں فاقہ ہے اوپر جا کر آپ ذکر الٰہی میں مشغول ہو گئے تھوڑی دیر میں آپؒ کے پاس ایک آدمی آیا اور اس نے یہ شعر پڑھا۔

بادلؔ گفتم ولا خضر رابنی
دل گفت اگر مرانمائی بنیم

اور اس کے پاس کھانے کا ایک خوان بھی تھا اس نے وہ کھانا حضرت شیخؒ کے سامنے رکھ دیا اور کہا کہ تمہارے توکل کا نقارہ عرش پر فرشتگان اعلیٰ میں بج رہا ہے اور یہاں تم محزون بیٹھے ہو۔ آپؒ نے جواب دیا حق تعالیٰ واقف ہے کہ میری توجہ اس طرف کچھ اپنی ذات کے لئے نہیں ہے چند مہمان دروازہ پر بیٹھے ہیں یہ سن کر اس شخص نے کہا جاؤ یہ کھانا مہمانوں کو کھلاؤ اور کچھ میرے لئے بھی لیتے آنا۔

حضرتؒ وہ کھانا لے کر نیچے اترے اور مہمانوں کو کھلایا۔ اور کچھ کھانا ہمراہ لے کر اوپر آئے مگر وہاں کوئی بھی نہ تھے۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے فرمایا کہ وہ مرد حضرت خضر علیہ السلام تھے۔

سلطان المشائخ محبوب الٰہی حضرت خواجہ
سید نظام الدین اولیاءؒ

اسم مبارک محمد بن احمد ہے۔ نظام الدین اولیاء سلطان المشائخ اور محبوب الٰہی کے نام سے مشہور ہیں۔ دہلی والے سلطان جی کہتے ہیں ۶۳۶ھ میں بدایوں میں پیدا ہوئے چار سال کی عمر میں والد ماجد کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا والدہ نے تربیت و پرورش کی۔ ۱۶ سال کی عمر میں تمام علوم سے فراغت پائی اور بحاث محفل شکن خطاب پایا آپؒ کے اساتذہ مولانا شمس الملک محدثؒ اور مولانا کمال الدین زاہدؒ مشہور زمانہ بزرگ گزرے ہیں۔

۲۰ سال کی عمر میں حضرت شیخ شیوخ العالم فریدالدین مسعود گنج شکرؒ کی خدمت میں بیعت ہونے کے لئے حاضر ہوئے حضرتؒ نے آپ کو دیکھ کر یہ شعر پڑھا ۔

اے آتش فراقت دلہا کباب کردہ
سیلاب اشتیاقت جانہا خراب کردہ

بیعت کے بعد مولانا بدرالدین اسحاقؒ سے فرمایا۔ دہلی والے مہمان کی میزبانی دہلی والے کو ہی کرنی چاہئیے۔ کچھ دن بعد آپ نے حضور بابا صاحبؒ کی خدمت میں گزارش کی۔ اگر حکم ہو تو تعلیم ترک۔ اور وظائف میں مشغول ہو جاؤں۔ آپؒ نے فرمایا میں کسی کو تعلیم سے نہیں روکتا۔ یہ بھی جاری رکھو وہ بھی جو غالب آجائیگا۔ دوسرے کو خود ہی ہٹا دیگا۔ حضرت جناب بابا صاحبؒ نے آپ کو ابوشکور سالمیؒ کی کتاب ''تمہید المتبدی'' اور شیخ الشیوخ سہروردیؒ کی ''عوارف المعارف'' کے چند باب اور کچھ پارہ قرآن شریف کے تجوید کے ساتھ پڑھائے تھے۔

تکمیل کے بعد خلافت عطا فرمائی اور نصیحت کی ہمیشہ روزہ رکھنا کہ آدھا سلوک صرف روزہ ہے اور بقیہ آدھے میں دوسری چیزیں ہیں جو خلافت نامہ حضرت بابا صاحبؒ نے آپ کو مرحمت فرمایا تھا۔ وہ سیر الاولیاء میں بعینہ موجود ہے۔ اس میں حضرتؒ نے آپ کو ان القابات سے یاد فرمایا ہے۔ فرزند رشید، پاک دین و پاک رائے، دانا برگزیدہ۔ آراستی کردہ محمدی و دین محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ محمد پسر احمد زیب آورئی اماماں و عالماں جائے فخر بزرگاں ومتقیاں۔

اس کے بعد تحریر فرمایا ہے کہ ان کی عزیز ہاتھ ہمارے ہاتھ کا قائم مقام ہے اور یہ ہمارے خلفائے خلفاء میں سے ہیں۔ دینی اور دنیاوی امور میں ان کے حکم برداری عین ہماری تعظیم کرنا ہے۔ پس رحم فرماوے اللہ تعالیٰ اس پر جو ان کا اکرام و احترام کرے اور ان کو بزرگ جانے کہ میں ان کو عزیز رکھتا ہوں اور ذلیل و خوار کرے اللہ تعالیٰ اس کو جو ان کے حقوق احترام کو نظر انداز کرے جن کی میں خود حفاظت کرتا ہوں۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے قلب و نظر میں بھی حضرت بابا صاحبؒ بسے ہوئے تھے آپؒ نے حضرتؒ کے خلیفہ و جانشین کی حیثیت سے سلسلے کی ترویج و اشاعت اور مخلوق خدا کی رشد و ہدایت کا کام اس شان سے انجام دیا کہ شاید دوبارہ وہ سماں قیامت تک نہ دیکھا جا سکے مشہور مورخ ضیاء الدین برنی کی زبان سے سنئے وہ حضرت کے طریق رشد و ہدایت اور فیضان عالم کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

حضرتؒ سے مرید ہونے کی شرم لوگوں کو کھلم کھلا اور چوری چھپے بہت سے منکرات سے بچاتی تھی اور آپؒ کے فیضان سے مخلوق عام طور پر تقلید اور اعتقاد اطاعت و عبادت کی طرف رجوع ہو گئی تھی یعنی عوام و خواص کے دلوں میں نیکی اور نکوکاری نے جگہ پکڑ لی تھی مرد، عورت، بوڑھے، جوان بازاری، عامی، غلام نوکر سب نماز کے پابند ہو گئے تھے اور زیادہ لوگ چاشت و اشراق کے پابند تھے برنی نے کئی صفحات میں باتیں لکھی ہیں۔

آخر میں لکھتا ہے کہ حاصل کلام یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ کو اس زمانہ میں حضرت شیخ جنید بغدادیؒ اور حضرت شیخ بایزید بسطامیؒ کی مثل

پیدا کیا تھا۔"

علامہ اقبالؒ نے انہی وجوہات کی بناء پر آپ کا مقام مسیح وخضر سے اونچا بتایا ہے

تری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی
مسیح وخضر سے اونچا مقام ہے تیرا

مولانا غوثی شطاریؒ نے گلزار ابرار میں لکھا ہے کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے بڑے بڑے شہروں میں مخلوق کی ہدایت اور دینی تبلیغ کے لئے ایسے سات سو خلفاء روانہ کئے تھے کہ جن میں سے ہر ایک کے سینے سے گویا عرفان کا آفتاب طلوع ہوتا تھا۔

آپ کا وصال ۱۸ ربیع الآخر ۷۲۵ھ چہار شنبہ بعد از طلوع آفتاب ہوا۔
شہنشاہ دین سے آپ کی تاریخ نکلتی ہے۔

حضرت مخدوم علاؤ الدین علی احمد صابر کلیریؒ

آپؒ حضرت بابا صاحبؒ کے خلیفہ ہیں اور سلسلہ چشتیہ کی ان عظیم ہستیوں میں سے ایک ہیں جن کہ شہرت قیامت تک آفتاب ومہتاب کے دامن سے باندھے رہے گی۔ چشتیہ سلسلہ کا فروغ اس وقت حضرت بابا صاحبؒ کی تربیت یافتہ دو ہستیوں سے زیادہ ہے سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاءؒ محبوب الٰہی اور مخدوم علاؤ الدین علی احمد صابری کلیریؒ۔

حضرت بابا صاحبؒ نے مخدوم صاحبؒ کو کلیر شریف کی ولایت عطا فرمائی تھی۔ آپؒ کی ولایت حقہ کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو گی کہ آپ کے سلسلے میں کمل اولیاء اللہ کی ایک سلک مروارید نظر آتی ہے۔ جس کو کسی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

آپؒ کے تفصیلی حالات تین سو برس بعد کی کتابوں میں ملتے ہیں اور ان سب روایتوں کا ماخذ یا تو روحانی کتابیں ہیں (نطاب) یا بزرگوں کا کشف ہے۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے آپؒ کا ذکر چند سطروں میں کیا ہے۔ صابری سلسلے کی نشرو اشاعت حضرت شیخ عبدالقدس گنگوہیؒ کے وقت میں شروع ہوئی چشتیہ سلسلے کے دور ثانی میں صابری مشائخؒ مشہور نمایاں نظر آتے ہیں۔ لیکن خود حضرت مخدوم صاحب قبلہؒ نے اس سلسلے کی کیا خدمات سرانجام دی ہیں اور اسلام کی سر بلندی کے لئے کیا کیا اس سے معاصر تذکرے اور تاریخیں بالکل خالی ہیں۔ اس بناء پر آپؒ کے کام کا اندازہ لگانا تقریباً ناممکن ہے۔

سیر الاقطاب وغیرہ کتب میں لکھا ہے کہ آپؒ صحیح النسب سید تھے اور آپؒ نے حضرت بابا صاحبؒ کی بہت خدمت کی تھی۔ بابا صاحبؒ نے اپنے ہاں کے لنگر کی تقسیم کا کام

مخدوم صاحب کے سپرد کیا ہوا تھا۔ جس کو جناب نے بہت اچھی طرح ۱۲ سال انجام دیا اس مدت میں لنگر خانہ سے کچھ بھی تناول نہ فرمایا۔ صائم النہار و قائم اللیل رہے ۱۲ سال کے بعد ایک دن حضرت بابا صاحب نے مخدوم صاحبؒ کو بلا کر پوچھا کہ علی احمد تم سب کو کھانا تقسیم کرتے ہو خود بھی کچھ کھاتے ہو یا نہیں؟ انہوں نے عرض کیا کہ بندہ کی کیا مجال ہے جو جناب کی اجازت کے بغیر ایک دانہ بھی کھایا ہو یہ سن کر حضرت بابا صاحبؒ نے فرمایا ہمارا علی احمد صابر ہے اس دن سے آپ کا لقب صابر ہوا۔

مرشد و مخدوم شیخ صابرؒ صابرؒ
در صبر و رضا اول و آخر صابرؒ
گفتم کہ بود در اولیاء جوہر فرد!
خود روح فریدؒ گفت صابرؒ صابر

حضرت مولانا جمال الدین ہانسویؒ

آپؒ حضرت بابا صاحبؒ کے خلیفہ اول ہیں۔ اور حضرت امام اعظم ابوحنیفہ کوفیؒ کی اولاد میں سے ہیں۔ بڑے جید عالم اور سحر البیان خطیب تھے حضرت بابا صاحبؒ کو آپؒ سے بہت محبت تھی اور آپؒ کو اپنا جمال فرمایا کرتے تھے۔ ۱۲ سال ہانسی میں آپؒ ہی کی وجہ سے رہے تھے جب حضرتؒ اجودھن آ گئے تو مولانا جمالؒ بھی آپ کے ہمراہ یہاں آ گئے اور جماعت خانہ فریدیہ کے درویشوں کے لئے جنگل سے کریل کے پھل (ڈیلہ) توڑ کر لایا کرتے تھے حضرت بابا صاحبؒ کے خلفاء میں یہ قابل فخر اعزاز صرف آپؒ کو ہی حاصل تھا کہ حضرت بابا صاحبؒ کے خلفاء کے خلافت نامے تصدیق کیا کرتے تھے اور بغیر آپؒ کی مہر کے کسی کی خلافت قابل تسلیم نہ ہوتی تھی اور حضرت بابا صاحبؒ نے یہ انتظام اس لئے کیا تھا کہ ایک دفعہ ایک شخص نے حضرت بابا صاحبؒ سے خلافت حاصل کرنے

کیلئے جھگڑا کیا اور کہا تھا کہ:

"عرصہ ہو گیا میں آپ کی خدمت کرتا ہوں اور مرید بھی میں ان سب لوگوں سے پہلے ہوا تھا آپ مجھے خلافت کیوں نہیں دیتے اگر آپ نے مجھے خلافت نہ دی تو میں خود ایسا کاغذ بنا لوں گا اور لوگوں کو مرید کرنے لگوں گا۔"

یہ سن کر حضرت بابا صاحبؒ نے مولانا سید بدر الدین اسحاقؒ سے فرمایا کہ ان سب کے خلافت ناموں پر تم اپنی کتابت کے دستخط کرو تا کہ کسی حریص کو اس کام میں مداخلت نصیب نہ ہو۔ اور مولانا جمال الدینؒ کی تصدیق مہر اور دستخط بھی ان پر لازمی ہیں۔ میرے جس خلافت نامے پر جمال الدینؒ کے دستخط اور مہر نہ ہوگی وہ جعلی تصور ہوگا۔

جب حضرت بابا صاحبؒ نے حضرت خواجہ نظام الدینؒ کو خلافت نامہ عنایت فرمایا تو ان کو بھی ہدایت کی تھی کہ ہانسی جا کر مولانا جمال الدینؒ کی مہر لگوا لینا۔ چنانچہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ ہانسی گئے تھے اور آپؒ کے سامنے وہ خلافت نامہ پیش کیا تھا جسے دیکھ کر حضرت جمال الدینؒ بہت مسرور ہوئے تھے اور یہ شعر لکھ کر آپؒ نے اس پر دستخط کر دیئے۔

خدائے جہاں را ہزاراں سپاس — کہ گوہر سپردہ بہ گوہر شناس

ایک دن حضرت بابا صاحبؒ نے مولانا جمال الدینؒ کی بوڑھی خادمہ سے پوچھا (جس کو آپ نے حضرت بابا صاحبؒ کی خدمت میں ایک پیغام دے کر بھیجا تھا) کہ مادر مومناں ہمارا جمال کیسا ہے اور کیا کرتا ہے اس نے عرض کیا "حضور جس دن سے آپؒ کے مرید ہوئے ہیں اسباب دینا اور شغل خطابت کو ترک کر دیا ہے۔ اس لئے ان کو بھوک اور بلاؤں نے گھیر لیا ہے اور وہ سخت مجاہدوں میں مشغول رہتے ہیں۔"

یہ سن کر حضرت بابا صاحبؒ مسکرائے اور فرمایا الحمد للہ! اچھی زندگی بسر کر رہا ہے آپؒ کا وصال حضرت بابا صاحبؒ کی حیات مبارک میں ۱۱ شعبان ۶۵۹ھ کو ہوا تھا۔ آپؒ کے دو صاحبزادے تھے۔ بڑے نے سورۃ یوسف کا وظیفہ پڑھا اور کیفیات عشقیہ کی

شدت نے ان کو مجذوب بنا دیا تھا۔ آپؒ کی یادگار دو کتابیں اس وقت موجود ہیں۔ ایک ملہمات جس میں آپ نے اپنے الہامات جمع کئے ہیں اور دوسرا دیوان۔ آپؒ کے مکمل حالات کیلئے دیکھیے کتاب انوار الفرید۔ پاکپتن شریف میں آپؒ کے سجادہ نشین جناب دیوان انوار الاسلام صاحب قیام پذیر ہیں اور آپ کے ہمراہ ان کے رشتہ دار اور عزیز و اقارب رہتے ہیں جن میں حضرت منہاج الاسلامؒ مرحوم کے بڑے صاحبزادے شیخ بدر الاسلامؒ قابل ذکر ہیں۔

حضرت بابا صاحبؒ کی بیماری اور آپ کا انتقال

حضرت بابا صاحبؒ کا انتقال پچانوے اور بقولے ترانوے سال کی عمر میں ہوا تھا۔ آپ کو خلہ کی بیماری تھی جس میں تمام بدن میں سوئیاں چبھتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔

ماہ ذوالحجہ کے آخری دنوں میں بیماری نے شدت اختیار کر لی تھی اور آپؒ کو بے ہوشی کے دورے ہونے لگے تھے لیکن اس کے باوجود آپؒ کی کوئی نماز بلکہ کوئی نفلی عبادت بھی قضا نہیں ہوئی اور وظائف بھی اپنے وقت پر ادا ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ محرم ۶۶۴ھ کا چاند نظر آ گیا۔ محرم کی چار تاریخ کو دہلی سے آپؒ کے مخلص قدیم سید محمد کرمانی پرسش احوال کے لئے اجودھن آئے۔ حضرت بابا صاحبؒ اس وقت حجرہ میں تھے اور دروازہ بند تھا۔ باہر صاحبزادگان اور چند مریدان آپؒ کی جانشینی کے متعلق سرگوشیاں کر رہے تھے۔ جیسے ہی ان حضرات نے سید محمد کرمانیؒ کو دیکھا تو کہا۔ اس وقت اندر نہ جانا۔ حضرتؒ کی طبیعت ناساز ہے سید کرمانیؒ باہر بیٹھے سوچتے رہے کہ میں دہلی سے چل کر آیا ہوں اگر مجھے حضورؒ کی قدم بوسی کر لینے دیں تو کیا حرج ہے۔ آخر ان سے ضبط نہ ہو سکا اور وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے اور بابا صاحبؒ کے قدموں میں سر رکھ دیا آپؒ

نے آنکھیں کھولیں اور پوچھا سید کیا حال ہے کب آئے؟۔ انہوں نے عرض کیا حضور آپؒ کی دعا سے اچھا ہوں۔ ابھی حاضر ہوا ہوں پھر حضرت کرمانیؒ نے بابا صاحبؒ کا مزاج پوچھا، تو حضرتؒ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کا شکر و احسان ہے اس کے بعد سید محمد کرمانیؒ نے علماء اور مشائخؒ کے سلام عرض کئے۔ آخر میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کا سلام عرض کیا۔ جیسے ہی حضرتؒ نے ان کا نام سنا تو خوش ہو کر پوچھا نظام الدینؒ اچھا ہے۔ خوش ہے؟ انہوں نے کہا ہر وقت حضور کی یاد میں رہتے ہیں۔ یہ سن کر حضرتؒ اور خوش ہوئے اور بدر الدین اسحاقؒ سے فرمایا کہ جو تبرکات مجھے سلسلہ بہ سلسلہ اپنے حضرتؒ سے پہنچے ہیں وہ نظام الدین محمد بدایونیؒ کا حق ہے ان کو پہنچا دینا۔

بعد نماز مغرب آپؒ کی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی۔ عشاء کی نماز آپؒ نے جماعت سے ادا کی پھر آپؒ بے ہوش ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد آپؒ کو ہوش آیا اور آپؒ نے سوال کیا کہ میں نے نماز پڑھ لی ہے؟۔ عرض کیا گیا جی ہاں۔ آپؒ نے فرمایا ایک مرتبہ اور پڑھ لوں۔ اور پھر نماز عشاء ادا کی پھر بے ہوش ہو گئے۔ اس مرتبہ زیادہ دیر کے بعد ہوش آیا ہوش آتے ہی پہلا جملہ یہ تھا کہ میں نے عشاء کی نماز پڑھ لی ہے؟۔ عرض کیا گیا جی ہاں آپؒ دو مرتبہ نماز عشاء ادا کر چکے ہیں۔ پھر پوچھا مولانا نظام الدینؒ دہلی سے نہیں آئے؟ کہا گیا جی نہیں۔ آپؒ نے فرمایا ہاں میں بھی اپنے شیخ کے انتقال کے وقت ان کے پاس موجود نہ تھا۔ بلکہ ہانسی میں تھا۔ پھر فرمایا ایک مرتبہ اور نماز ادا کر لوں خدا جانے پھر کیا ہونے والا ہے۔ یہ فرما کر آپ نے عشاء کی نماز بمعہ وتر ادا کی اور پھر تازہ وضو کیا اور سجدہ کیا اور سجدہ ہی میں ایک مرتبہ زور سے یا حی یا قیوم فرمایا اور جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

بقیہ رات میں غسل و کفن سے فراغت پائی۔ صبح شہر سے باہر نماز جنازہ ادا کی گئی۔ اور پھر اس مقام پر جہاں اب آپؒ کا مزار پاک ہے دفن کیا گیا۔

سنت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عملی نمونہ دیکھئے کہ انتقال کے بعد گھر والے کفن دفن کے خرچ سے بھی معذور تھے۔ اور لحد کے لئے کچی اینٹیں بھی نہ تھیں جو گھر کا

دروازہ توڑ کر حاصل کی گئی تھیں۔

پنبۂ حلاج را رسم کفن داری بہ بود
خانہ بردوش فنا ساماں داری ہم نداشت

''ازدواج واَولاد''

حضرت بابا صاحبؒ کی تین یا چار بیویاں تھیں۔ جن کے بطن سے پانچ لڑکے اور تین لڑکیاں پیدا ہوئیں۔

۱۔ خواجہ نصیر الدین نصر اللہؒ ۔۲۔ خواجہ شہاب الدین گنج علمؒ ۔۳۔ خواجہ بدر الدین سلیمانؒ ۔۴۔ خواجہ نظام الدین شہیدؒ ۔۵۔ خواجہ یعقوب ابدالؒ ۔

۱۔ بی بی شریفہؒ ۔۲۔ بی بی مستورہؒ ۔۳۔ بی بی فاطمہؒ

حضرت بابا صاحبؒ کے وصال کے بعد آستانہ عالیہ کے دیوان جناب خواجہ شیخ بدر الدین سلیمانؒ مقرر ہوئے۔ ان کے بعد ان کے صاحبزادہ حضرت شیخ علاؤ الدینؒ موج دریا سجادہ نشین ہوئے اور تقریباً ۵۴ سال آپ سجادہ نشین رہے۔ بڑے عابد زاہد اور عارف بزرگ تھے تمام عمر روزہ رکھتے رہے۔ سال میں صرف پانچ دن آپ روزہ نہ رکھتے تھے۔ شمس سراج نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ حضرت علاؤ الدینؒ نے غیاث الدین تغلق، محمد تغلقؒ اور فیروز شاہ تغلق کو تاجداری کی بشارت دی تھی اور جتنے گز کی دستار آپؒ نے ان تینوں سلاطین کو عطا فرمائی تھی اتنے اُتنے سال ان لوگوں نے حکومت کی۔

سلطان غیاث الدینؒ کو جو خراسانی نژاد تھا اور اس وقت دیپالپور کا صوبہ دار تھا ساڑھے چار گز کی دستار دی تھی وہ ساڑھے چار سال ہی حکمران رہا اور سلطان محمد تغلق کو ستائیس گز دستار دی تھی وہ ستائیس سال بادشاہ رہا اور فیروز شاہ تغلق کو کچھ کم چالیس گز کی دستار دی تھی وہ تقریباً چالیس سال حکمران رہا۔ سلطان محمد تغلق تو آپؒ کا ہی مرید تھا۔

آپؒ کی سجادگی کے زمانہ میں مشہور عالم سیاح ابن بطوطہ اجودھن آیا تھا اور آپؒ سے ملا تھا آپؒ ہر وقت مسجد میں بیٹھے رہتے تھے۔ تفصیل کے لئے ہماری بڑی کتاب انوار الفرید ملاحظہ فرمایئے۔

آج جبکہ ذوالحجہ کی ۱۲ تاریخ ۱۳۸۳ھ ہے اور ۲۵ اپریل ۱۹۶۴ء آستانہ عالیہ کے سجادہ نشین جناب دیوان غلام قطب الدین صاحبؒ ہیں جو حضرت علاؤ الدین موج دریاؒ کی اولا میں سے ہیں اور غالباً ۲۶ ویں سجادہ نشین ہیں۔ ان کی عمر اس وقت ۲۹ سال کی ہے۔ دس سال کی عمر میں وہ اپنے والد کے انتقال پر سجادہ نشین ہوئے تھے۔

پاکپتن شریف (اجودھن) اور اس کے قریب وجوار میں بکثرت چشتی آباد ہیں۔ حضرت بابا صاحبؒ کی اولاد کو پنجاب میں چشتی کہا جاتا ہے۔ ان میں بعض بڑے زمیندار ہیں۔ اور اچھا اثر و رسوخ رکھتے ہیں بعض پیری مریدی کرتے ہیں اور بعض کھیتی باڑی کا کام کرتے ہیں۔

حضرت بابا صاحبؒ کی محفل سماع

ہندوستان میں چشتیہ سلسلے کے سرخیل و سرگروہ حضرت سلطان الہند خواجہ خواجگان سیدنا معین الدین چشتی اجمیریؒ ہوئے ہیں۔ جن کی ذات گرامی سے متاثر ہو کر متحدہ ہندوستان کے کئی لاکھ آدمیوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ ان کا قول و فعل سلسلہ چشتیہ میں حجت کا درجہ رکھتا ہے آپؒ سماع سنتے تھے آپؒ کے جانشین و خلیفہ حضرت قطب عالم بختیار کاکیؒ بھی سماع سنتے تھے اور آپؒ کا تو انتقال بھی دوران سماع ہی ہوا تھا۔ آپؒ کے جانشین و خلیفہ حضرت شیخ شیوخ العالم بابا فرید الدین گنج شکرؒ تھے۔ آپؒ بھی سماع سنتے تھے۔

ایک دن حضرت بابا صاحبؒ کو سماع سننے کا ذوق ہوا۔ اتفاق سے اس وقت

وہاں کوئی قوال موجود نہ تھا۔ آپؒ نے حضرت مولانا بدرالدین اسحاقؒ سے فرمایا کہ وہ خط جو جناب قاضی حمیدالدین ناگوریؒ نے بھیجا ہے۔ لاؤ اور سناؤ حضرت مولانا تعمیل حکم میں وہ تھیلہ اٹھا لائے جس میں مکتوبات رکھے جاتے تھے اور اس میں ہاتھ ڈال کر آپ نے ایک خط نکالا۔ دیکھا تو یہ وہی مطلوبہ خط تھا۔ مولانا کھڑے ہوئے اور خط پڑھنا شروع کیا۔ حمد و نعت کے بعد تحریر تھا۔

فقیر، حقیر، نحیف، ضعیف، بندہ درویشاں از سر و دیدہ خاکپائے ایشاں محمد عطا المعروف بہ حمیدالدین ناگوریؒ۔ بس اتنا سنتے ہی حضرت باباصاحبؒ پر کیفیت طاری ہو گئی اور جب مولانا نے خط کی یہ رباعی پڑھنی شروع کی تو حضرتؒ پر وجد طاری ہو گیا۔

آں عقل کجا کہ در کمال تو رسد — آں روح کجا کہ در جلال تو رسد
گیرم کہ تو پردہ برگرفتی ز جمال — آں دیدہ کجا کہ در جمال تو رسد

اسی طرح ایک دن آپؒ کو ذوق سماع ہوا اور آپؒ کی زبان پر مولانا نظامی کی یہ بیت آ گئی جس کو آپؒ تمام دن پڑھتے رہے پھر رات کو بھی یہی حال رہا اور دوسرے دن بھی۔

نظامی آنچہ اسرار است کز خاطر عیاں کردی
کے سرش نمید اند زباں درکش زباں درکش

کہتے ہیں علماء اہل عقل ہیں اور فقراء اہل عشق۔ فقراء کے نزدیک سماع چند شرائط کے ساتھ سننا جائز ہے اور مسلمانوں کا سواد اعظم اس کو سنتا چلا آ رہا ہے۔ قرآن شریف میں کوئی واضح اور صاف آیت اس کی حرمت میں نہیں ہے۔ اور متعدد صحیح احادیث کے علاوہ بخاری شریف کی حدیث جاریتین سے خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں دف کے ساتھ لڑکیوں کا گانا ثابت ہے تفصیل کے لئے انوار الفرید دیکھیے۔

اوراد و وظائف

حضرت باباصاحبؒ کا ارشاد ہے کہ حق تعالیٰ حیا کرتا ہے اپنے بندے سے کہ وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر اس کو پکارے اور اس سے مانگے اور وہ اس کے ہاتھوں کو خالی و ناامید واپس کر دے۔ فرمایا جو شخص تازہ وضو سے دو نفل پڑھے اور ہاتھ پھیلا کر آسمان کی طرف منہ کر کے اور ۱۰۰ مرتبہ یارب، یارب کہے۔ جو دعا مانگے قبول ہو۔ اگر گیارہ ہزار مرتبہ پڑھے یقیناً مراد پوری ہو مگر یہ عمل تنہائی میں کرے۔

تنگیٔ معاش دور کرنے کا وظیفہ:

حضرت باباصاحبؒ نے فرمایا جو شخص تنگیٔ معاش میں مبتلا ہو اس کو چاہئے ہر شب سورۃ جمعہ پڑھا کرے۔

حفظ قرآن کا طریقہ:

حضرت باباصاحبؒ نے فرمایا قرآن شریف حفظ کرنے کے خواہش مندوں کو چاہیے کہ پہلے سورۃ یوسف یاد کریں۔ اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ پورا قرآن شریف عطا فرما دیتا ہے۔

عمل مجربہ برائے قضائے حاجت:

حضرت باباصاحبؒ نے فرمایا اگر کسی شخص کو ایسی مشکل درپیش ہو کہ کسی طرح حل نہ ہوتی تو اس کو چاہئے کہ چاند کی پندرھویں شب کو (چودہ تاریخ کا دن گذار کر رات کو) باوضو قبلہ رخ بیٹھے اور انیس ہزار مرتبہ واللہ المستعان پڑھے اور ہزار پر سجدہ کرے اور تین بار آمین کہے اور اپنی حاجت اللہ سے طلب کرے۔ انشاء اللہ مراد کو پہنچے گا۔

حضرت بابا صاحبؒ کے چند اقوال

فرمایا: دین کی حفاظت علم کے ساتھ کرو۔

فرمایا: جو مالدار ہونا چاہتا ہے وہ درویش نہیں حریص ہے۔

فرمایا: ذلیل ترین آدمی وہ ہے جو ہر وقت کھانے اور کپڑوں میں لگا رہے۔

فرمایا: دشمن کی دشمنی اس سے مشورہ کرنے سے ٹوٹ جاتی ہے۔

فرمایا: نامرادی کا دن مردوں کی شب معراج ہے۔

فرمایا: ہر ایک کا کھانا نہ کھا۔ لیکن ہر ایک کو کھلا دے۔

فرمایا: جو تجھ سے ڈرتا ہے اس سے تو بھی اندیشہ کر۔

فرمایا: عاقل نما نادان سے پرہیز کر۔

فرمایا: اگر تم بزرگوں کے مرتبہ کے خواہش مند ہو تو امراء اور بادشاہ زادوں سے میل جول نہ رکھنا۔

فرمایا: دین کا کوئی بدل نہیں ہے۔

فرمایا: سبکساری اور درشتی کو اپنی کمزوری سمجھ۔

فرمایا: ایک جذبہ جذبات حق سے دو جہان کی عبادت سے بہتر ہے۔

بہشتی دروازہ

حضرت بابا صاحبؒ کے روضہ شریف کے دو دروازے ہیں۔ ایک جنوب میں دوسرا مشرق میں شرقی دروازہ نوری دروازہ کہلاتا ہے اور جنوبی بہشتی دروازہ کہلاتا ہے۔ روضہ شریف کی تعمیر حضرت خواجہ نظام الدینؒ نے کرائی تھی جس کی ہر اینٹ پر ایک قرآن شریف ختم کیا گیا تھا۔

بہشتی دروازہ کی روایت سب سے پہلے صاحب جواہر فریدی نے لکھی۔ اس

سے قبل کی کسی کتاب میں ہماری نظر سے اس دروازہ کا حال نہیں گذرا البتہ (شیوخ) سے یہ روایت چلی آ رہی ہے۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث شریف ہے کہ میری قبر اور میرے منبر کے درمیان کی جگہ جنت کی کیاریوں میں سے ایک کیاری ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ حضرت بابا صاحبؒ کے پائین جنتی دروازہ کا ہونا کمال اتباع نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دلیل ہے۔

رحمت حق بہانہ می جوید   رحمت حق بہانی جوید

صاحب جواہر فریدی نے لکھا ہے کہ حضرت بابا صاحبؒ کے دفن کے وقت حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بمعہ اصحاب کبار اور اولیاء نامدار روضہ حضرت بابا صاحبؒ میں دیکھا اور سلطان انبیاء نے سلطان المشائخ سے فرمایا۔ من دخل ھذا الباب امن ۔ (یعنی جو اس دروازہ میں داخل ہوا۔ اس نے امن پایا) آپؒ نے سرکار رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی سنا تو آپؒ پر ایک کیفیت طاری ہو گئی۔ اور آپؒ نے اسی حالت کیفیت میں دستک دے کر فرمایا۔

''اللہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، چار یار، حاجی قطبؒ، فرید، فرید، فرید'' یہی وجہ ہے کہ دروازہ کھلتے وقت تین تالیاں بجائی جاتی ہیں اور حاضرین۔ اللہ، محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ چار یار حاجی قطبؒ۔ فرید۔ فرید۔ فریدؒ کا نعرہ لگاتے ہوئے بہشتی دروازہ میں داخل ہوتے ہیں اور نوری دروازہ سے باہر آ جاتے ہیں۔

عمل صالح بہترین سرمایہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہر ایک کو توفیق عطا فرما دے اور اس کو اپنی رحمت سے شرف قبولیت بھی بخشے۔ حاشا و کلا یہاں اس کی نفی مقصود نہیں ہے۔ صرف اس کی رحمت کے غلبہ کا ذکر منظور ہے۔ جو لوگ فضل الٰہی سے قطع نظر جنت کو اپنے اعمال کا نتیجہ اور بدلہ خیال کرتے ہیں وہ اصحاب کہف کے کتے کے متعلق کیا کہیں گے۔ جو محض ایک ساتھی ہونے کے سبب بغیر کسی عمل کے جنت میں جائے گا۔ اور بلعم باعور اور اسی طرح کے چند لوگ کثرت عبادت کے باوجود ایک نافرمانی پر جہنم میں جائیں گے۔ اعمال صالح کی توفیق محض فضل رب پر موقوف ہے اور اس کا فضل کسی سبب

اور کسی علت کا محتاج نہیں ہے۔ پس مان لیجئے کہ یہ دروازہ بھی اولیاء اللہ پر اس کے فضل کا اظہار ہے صوفی اجمیری مرحوم نے کیا خوب کہا ہے ؎

چاہیں تو خطاؤں کو وہ حسن عمل لکھ دیں
اپنی ہے کتاب ان کی اپنا ہے حساب انکا

مراسم عرس حضرت بابا صاحبؒ

حضرت بابا صاحبؒ کے عرس کی مراسم ۲۵ ذوالحجہ سے شروع ہو جاتی ہیں۔ ہر روز صبح کو تقریباً ۸ بجے دیوان صاحبؒ تشریف لاتے ہیں۔ اور اپنے ہمراہ مشائخ" سجادگانؒ اور فقراء اور پیرزادگان و معززین کو اندر روضہ میں لے جاتے ہیں۔ یہاں چند حافظ قرآن خوانی کرتے ہیں۔ اس کے بعد آستانہ عالیہ کا شجرہ خواں یہ شجرہ پڑھتا ہے۔

بروح پاک بندگئی حضرت سید المرسلین خاتم النبیین خواجہ کائنات خلاصہ موجودات، سردفتر مخلوقات رحمۃ اللعالمین احمد مجتبےٰ سیدنا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بطفیل حضرت ایشان جمیع آل و اولاد و اصحاب و ازواج و اتباع رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین و علمائے مجتہدین و مشائخ متصدقین و متاخرین و جمیع طبقات خصوصاً بندگی حضرت سلطان الہند قطب الاولیاء تاج العرفا۔ قدوۃ المحققین امام المتقین سراج العارفین، برہان الذاہدین حضرت خواجہ خواجگان خواجہ سید معین الدین حسن سنجری قدس اللہ سرہ، و بندگی حضرت شہید المحبت غریق رحمت قطب عالم خواجہ سید قطب الدین بختیار کاکیؒ اوشی قدس اللہ سرہ و بندگی حضرت حریق المحبت شیخ شیوخ العالم فرید الحق والشرع والدین قدس اللہ سرہ، ونور اللہ مرقدہ، و جمیع گنذشتگان خواجگان چشت اہل بہشت رضوان اللہ علیہم اجمعین و جمیع فرزندان و خلفاء و مریدین و معتقدین بطفیل حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم درود و سورۃ فاتحہ معہ اخلاص ختم۔

یہاں سب حاضرین درود شریف و سورۃ اخلاص، سورۃ فاتحہ پڑھ کر ایصال ثواب کرتے ہیں۔ اس کے بعد شجرہ خواں یہ کہتے ہیں۔

دعا برائے مزید حیات و ترقی درجات و نیل المراوات و استقامت دارین و حصولیات دین و ایمان جمیع خلفاء و مریدین و علمائے اسلام و فقرائے ذوالاحترام و صوفیائے اکرام چہ از دور و نزدیک کل حاضرین مجلس بطفیل وحی حضرات خواجگان چشت اہل بہشت رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین حاضرین مجلس ایں نیت خیر دعا خیر مدد کنید۔ اس وقت بھی سب حاضرین فاتحہ کے بعد دعائے خیر کرتے ہیں۔ پھر شجرہ خوان یہ کہتے ہیں۔

دعا برائے مزید حیات و ترقی درجات و نیل المراوات و استقامت دارین و حصولیات دین و ایمان نائب مناب قطب الاقطاب خواجہ بحر و برشاہ فرید الدین مسعود گنجشکر۔ سراج الاولیاء نور الحق و الشرح والدین حضرت دیوان شیخ غلام قطب الدین صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ حاضرین مجلس ایں نیت خیر دعائے خیر مدد کنید۔

اس کے بعد دیوان صاحب سب حاضرین کو پسی ہوئی کھانڈ تقسیم کرتے ہیں۔

پھر یہاں سے نکل کر سب لوگ حضرت شیخ علاؤ الدین موج دریاؒ کے روضہ میں جاتے ہیں۔ وہاں بھی تبرک تقسیم ہوتا ہے۔ پھر یہاں سے دیوان صاحب سماع خانہ میں اپنی مخصوص نشست پر تشریف فرما ہوتے ہیں۔ اور علماء و فقراء مشائخ اور سجادگان، پیرزادگان اور دوسرے معززین صف بستہ کھڑے رہتے ہیں۔ یہاں فاتحہ شربت پر ہوتی ہے۔ جو مٹی کی جھجریوں میں بھرا ہوا ہوتا ہے۔ یہاں بھی قرآن خوانی کے بعد وہی شجرہ پڑھا جاتا ہے جو اوپر تحریر کیا جا چکا ہے۔ شربت کی جھجریوں کی تقسیم کے بعد آٹے میدہ کی چھوٹی چھوٹی ٹکیاں تقسیم ہوتی ہیں۔ اس تقسیم سے فارغ ہو کر جناب سجادہ نشین صاحب تو اندرون روضہ شریف چلے جاتے ہیں اور دوسرے سب حاضرین محفل سماع میں بیٹھ جاتے ہیں۔ دیوان صاحب روضہ شریف میں جا کر دروازہ بند کر لیتے ہیں اور مزارات کی صفائی کے بعد غلاف تبدیل کرتے ہیں۔ اس وقت کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ سوائے اس شخص کے کہ جس کو دیوان صاحب اپنے پیش دست کی حیثیت سے اندر بلا دیں۔

اس خدمت سے فارغ ہو کر دیوان صاحب باہر آ جاتے ہیں اور دروازہ کھول دیتے ہیں۔ اور خود روضہ شریف کے دروازہ میں باہر کی طرف کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور مشائخ سجادگان بھی مجلس کی صورت میں صف بستہ کھڑے رہتے ہیں اور محفل سماع منعقد ہوتی ہے اس وقت کی یہ مجلس بڑی پرکیف اور موثر ہوتی ہے۔ گذشتہ سال عرس کی اس محفل میں شاید محبوب قوال نے جب یہ غزل شروع کی تھی تو ساری مجلس کیف وسرور سے بھر گئی تھی

کون بیٹھا ہے اب اندیشہ فردا لے کر
مطمئن ہوں تیری نسبت کا سہارا لے کر

۲۵ ذی الحجہ سے ۶ محرم تک صبح کی یہ مجلس ہر روز اسی طرح ہوتی رہتی ہے۔ اور یکم محرم سے شام کو بھی ایک مجلس شروع ہو جاتی ہے۔ جو بہشتی دروازہ کھلنے والی رات تک جاری رہتی ہے۔ اس مجلس میں ہر روز تین صوفی بنائے جاتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ حضرت بابا صاحب کے انتقال کے بعد جب عرس کے موقع پر دہلی سے حضرت خواجہ نظام الدین محبوب الہیٰ آتے تو اسی جگہ محفل سماع منعقد ہوئی تھی اور بعض تذکرہ نویسوں کی روایات کے مطابق اس مجلس میں حضرتؒ پر بڑا کیف ہوا تھا اور غلبہ حال میں آپؒ وجد کے لئے کھڑے ہو گئے تھے۔ اس مجلس میں مشہور سہروردی بزرگ جناب شیخ رکن الدین ابوالفتح ملتانیؒ بھی موجود تھے۔ پہلی مرتبہ انہوں نے آپ کی آستین پکڑ کر آپؒ کو بٹھا لیا تھا۔ پھر جب دوبارہ آپؒ وجد کے لئے کھڑے ہوئے تو انہوں نے آپؒ کا دامن پکڑ کر بٹھا لیا۔ تیسری مرتبہ جب آپؒ وجد کے لئے کھڑے ہوئے تو اٹھ کر چلے گئے اور نماز میں مشغول ہو گئے۔

حضرت شیخ محمدؒ نے ان سے یہ معاملہ پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الہیٰؒ شیخ وقت ہیں۔ ان کے روحانی مراتب سے کون واقف ہو سکتا ہے۔ پہلی مرتبہ جب وہ وجد کے لئے کھڑے ہوئے ہیں تو باطن میں ان کا قدم ساتویں آسمان پر تھا۔ میں نے ان کی آستین پکڑی اور ان کو بٹھا لیا۔ دوسری مرتبہ وہ وجد کے لئے کھڑے ہوئے تو وہ ہفت افلاک سے گذر گئے تھے۔ میرا ہاتھ ان کے دامن تک پہنچا اور

میں نے ان کو بٹھا لیا تیسری مرتبہ وہ میری نظروں سے غائب تھے خدائے تعالیٰ علیم ہے کہ وہ کس مقام میں تھے اس لئے میں اٹھ کر چلا آیا اور نماز میں مشغول ہو گیا۔

الغرض اسی حالت میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ نے باری باری تین آدمیوں کے شانے پر اپنا دست مبارک رکھا اور وجد کرتے ہوئے ان کو اپنے ہمراہ ظاہر حضرت شیخ شیوخ العالم بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کے روضہ مبارک تک لائے اور یہاں تک پہنچتے پہنچتے باطن میں ان کو ابرار کے مرتبہ تک پہنچا دیا۔ اس وقت حضرت امیر خسروؒ بھی موجود تھے جنہوں نے آپؒ پر سے روپے اور اشرفیاں تصدق کئے تھے۔

بعد میں اس واقعہ نے قال و رسم کی شکل اختیار کر لی۔ جو سینکڑوں برس سے جاری ہے۔ اس مجلس میں مقررہ چوبدار ایک آدمی کا جو سر سے پاؤں تک سفید لباس پہنے ہوئے ہوتا ہے ہاتھ پکڑ کر دیوان صاحب کے سامنے لاتا ہے۔ اس کے ہمراہ قوالوں کی چوکیاں دف کے ساتھ یہ غزل گاتی ہوتی ہیں۔ پھر یہاں سے اس کو آہستہ آہستہ نوری دروازہ تک لیجایا جاتا ہے۔ اور پھر وہاں سے واپس لاتے ہیں۔ واپسی پر دیوان صاحب کوڑیاں نچھاور کرتے ہیں۔ اسی طرح تین صوفی روزانہ بنائے جاتے ہیں۔ اس صوفی بنانے کی رسم میں قوال ہر صوفی کے ساتھ ایک ایک غزل گاتے ہیں۔ یہ مجلس بھی بڑی موثر اور پرکیف ہوتی ہے۔

غزل نمبر۱

منزل عشقت مکان دیگر است　　مرواین راہ رانشان دیگر است
عاشقان خواجگان چشت را　　ازقدم تا سر نشان دیگر است
عشق راودرمدرسہ تعلیم نیست　　این چنیں علمت بیان دیگر است
کشتگان خنجر تسلیم را　　ہر زماں ازغیب جان دیگر است
احمد اتا گم نہ کر دی ہوش دار　　ایں جرس از کاروان دیگر است

غزل نمبر۲

من نیم واللہ یار امن نیم　　جان جانم سر سرم تن نیم

نور نورم نور نورم نور نور — من چراغ وپنبہ وروغن نیم
نور پاکم آمدہ درمشت خاک — کورچشماں راولے روشن نیم
اوست اندر سرمن ظاہر شدہ — من نیم مسعود اللہ من نیم

غزل نمبر۳

بخدا غیر خدا در دو جہاں چیزے نیست — بے نشانست کر دنام ونشان چیزے نیست
چند محجوب نشینی بگمان وگراں — خیمہ درکوئے یقین زن کہ گماں چیزے نیست
ہستی تست حجاب تو وگرنہ پیداست — کہ بخبر دوست دریں پردہ نہاں چیزے نیست
بندہ عشق شدی ترک نسب کن جامی
کاندریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

پانچ محرم تک یہ رسم اسی طرح ہوتی ہے شب سات محرم کو اسی طرح کی ایک اور مجلس بہشتی دروازہ کے سامنے دالان میں ہوتی ہے اس محفل کے بعد جناب دیوان صاحب بہشتی دروازہ کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں اور دعا مانگتے ہیں۔ پھر اللہ محمد چار یار حاجی قطب فرید فرید فرید کہہ کر تین تالیاں بجاتے ہیں جن کی اتباع میں تمام حاضرین عرس تالیاں بجا کر یہ نعرہ لگاتے ہیں جس سے تمام فضا فرید فرید کے نعروں سے گونج اٹھتی ہے۔

پھر دیوان صاحب دروازہ کھولتے ہیں اور فرید فرید کہتے ہوئے اندر داخل ہو جاتے ہیں۔ آپ کے بعد آپ کے عزیز واقارب مشائخ اور قادری نقش بندی مشائخ اور معززین اور درگاہوں کے پیرزادگان اس دروازہ میں داخل ہوتے ہیں اور شرقی دروازہ سے باہر آجاتے ہیں۔

پھر حضرت دیوان صاحب سجادہ نشین آستانہ جنوبی حجروں کے سامنے ۸ فٹ اونچے تخت پر کھڑے ہو کر زعفران کے پانی میں بھیگے ہوئے کپڑے جو مزار پاک حضرت بابا صاحبؒ سے مس شدہ ہوتے ہیں حاضرین میں تبرکاً تقسیم کرتے ہیں۔ جب اندرون آستانہ عالیہ کے تمام حاضرین فقراء خصوصاً حضرت میاں علی محمد خانصاحب چشتی نظامیؒ سجادہ نشین بسی شریف اور حضرت خواجہ نظام الدین صاحبؒ چشتی نظامی سجادہ نشین تونسہ

شریف اور حضرت پیر غلام محی الدینؒ صاحب چشتی نظامی سجادہ نشین گولڑہ شریف اور دوسرے چشتی نظامی صابری بہشتی دروازے سے گذر جاتے ہیں تو پھر حجرہ نشین لوگوں کو ایک قطار کے ساتھ بہشتی دروازہ میں داخل کیا جاتا ہے اس کے بعد عوام کو چھوٹے چھوٹے جتھوں کی صورت میں درگاہ شریف کے صدر دروازے سے ایک قطار کے ساتھ بہشتی دروازہ میں سے گذارا جاتا ہے اور فوراً ہاتھ در ہاتھ احاطہ آستانہ کے شمالی دروازہ سے باہر کر دیا جاتا ہے۔

دروازہ پر سرکاری شمار کنندے گنتی کرتے رہتے ہیں۔ ہر سال تقریباً ایک لاکھ آدمی اس دروازہ میں داخل ہوتے ہیں۔

۶ محرم کی صبح کو دیوان صاحب تقریباً ۸ بجے آتے ہیں اور دروزاہ بند کر دیتے ہیں۔ پھر شام کو بعد نماز مغرب یہ دروازہ کھول دیا جاتا ہے اور لوگ ۷ محرم کی صبح ۱۰ بجے تک قطار در قطار اس دروازہ سے گذرتے رہتے ہیں۔ دوسرے دن دروازہ بند کرنے سے کچھ دیر پہلے مردوں کو روک کر عورتوں کو بہشتی دروازہ تک جانے کی اجازت دیجاتی ہے۔ وہ اندر نہیں جاتیں۔ بلکہ دروازہ کو بوسہ دے کر واپس ہو جاتی ہیں۔ اس کے بعد مقررہ وقت پر جناب دیوان صاحب دروازہ بند کر دیتے ہیں۔ یہ ہیں وہ مراسم جو سینکڑوں برس سے اسی طرح ادا ہو رہی ہیں ہماری دعا ہے کہ صفائی کے ساتھ جاری رہیں۔

الٰہی تا بود خورشید و ماہی — چراغ چشتیاں را روشنائی

آستانہ کے مزارات اور عمارت وتبرکات

آستانہ حضرت بابا صاحبؒ میں خود حضرتؒ کے مزار کے علاوہ آپؒ کے دو صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں ہیں اور اہلیہ محترمہ اور پوتوں کے مزارات ہیں۔ نظامی مسجد صابری حجرہ۔ جمالی برج قابل زیارت مقامات ہیں۔ تبرکات میں حضرت بابا صاحبؒ کا ایک جبہ مبارک ایک جوڑہ چرمی موزہ اور دو علم ہیں اور تسبیح اور کاسئہ چوبیں

بھی جو ۶۱ء تک موجود تھے۔

حضرت بابا صاحبؒ کے روضہ شریف میں دو مزار ہیں۔ ایک خود آپؒ کا مزار ہے۔ آپؒ کا مزار بڑا ہے اور مغرب کی سمت ہے، دوسرا چھوٹا مزار جو مشرقی جانب دروازہ کے قریب ہے۔ یہ آپؒ کے صاحبزادے۔ جناب شیخ بدرالدین سلیمانؒ کا ہے۔ جو آپؒ کے انتقال کے بعد آستانہ عالیہ کے پہلے سجادہ نشین مقررہ ہوئے تھے۔ پھر آپؒ کے بعد آپؒ کے صاحبزادہ جناب شیخ علاؤ الدین موج دریاؒ سجادہ نشین آستانہ مقررہ ہوئے اور تقریباً ۵۴ سال آستانہ عالیہ کے سجادہ نشین رہے۔

روضہ حضرت علاؤ الدین موج دریاؒ

دوسرا بڑا گنبد حضرت علاؤ الدین موج دریاؒ کا ہے۔ جو حضرت بابا صاحبؒ کے پوتے تھے۔ بڑے عابد۔ زاہد اور عارف کامل بزرگ تھے۔ سلطان محمد تغلق۔ فیروز شاہ تغلقؒ کو آپؒ نے بادشاہ ہونے کی بشارت دی تھی اور محمد تغلق آپ ہی کا مرید تھا۔ جس نے آپ کے انتقال کے بعد آپؒ کے مزار پر یہ گنبد تعمیر کرایا تھا۔ اندرون گنبد لکڑی اور پختہ اینٹوں میں آیات قرآنی اور روضہ کی تعمیر کا حال کندہ ہے۔ اسی گنبد میں جانب مشرق ایک مسقف حجرہ میں حضرت بابا صاحبؒ کی اہلیہ محترمہ اور دو صاحبزادیاں یعنی ۱۔ بی بی مستورہ ۲۔ بی بی شریفہؒ کے مزارات ہیں۔

اس گنبد میں بقایا مزارات آستانہ عالیہ کے سجادہ نشینوں کے ہیں۔ جن میں جانب غرب دوسرا غلاف والا مزار موجودہ سجادہ نشین صاحب کے والد ماجد جناب دیوان سید محمد صاحبؒ کا ہے جو درویشانہ خصائل رکھتے تھے اور بڑے عابد و زاہد انسان تھے۔

نظامی مسجد

حضرت بابا صاحبؒ کے روضہ شریف کے بالکل متصل گوشہ مشرق و شمال میں نظامی مسجد ہے۔ یہ جگہ حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ کا عبادت خانہ ہے۔

کہتے ہیں کہ اس مقام پر ہر روز ایک ابدال یا صاحب نعمت درویش آتا ہے۔ اور عبادت کرتا ہے۔ نیز اس جگہ نفل پڑھ کر جو دعا مانگی جاتی ہے اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرماتا ہے۔

جس جگہ یار کا نقش کف پا ہوتا ہے
پس وہیں کعبہ ارباب وفا ہوتا ہے

سماع خانہ:

روضہ متبرکہ کے شرقی دروازہ کے بالمقابل سماع خانہ ہے۔ جہاں ایام عرس دیوان صاحب سجادہ نشین مراسم عرس انجام دیتے ہیں۔

روضہ شیخ شہاب الدین گنج علمؒ:

حضرت بابا صاحبؒ کے روضہ شریف سے جانب غرب مسجد سے متصل حضرت گنج علمؒ کا روضہ شریف ہے۔ جو حضرت بابا صاحبؒ کے صاحبزادے تھے اور نہایت عالم و فاضل تھے۔ حضرتؒ کی مجلس میں جس وقت علمی گفتگو ہوتی تو آپؒ ہی سے افتتاح ہوتا تھا۔ آپؒ کے مزار شریف کے پائین ہودہ ہے جس کا پانی شفائے امراض اور کند ذہن بچوں کے لئے اکسیر ہے۔

دوسرا مزار دیوان اللہ جوایا صاحبؒ کا ہے۔ جو آستانہ عالیہ کے سجادہ نشین تھے اور جنہوں نے ۱۳۰۴ھ میں انتقال فرمایا۔

صابری حجرہ:

حضرت مخدوم علاؤ الدین علی احمد صابر کلیریؒ کا عبادت خانہ ہے اور خاص مقام ہے۔

بہ زمینے کہ نشان کف پائے تو بود
سالہا سجدہ صاحب نظراں خواہد بود

جوعقیدتمند کلیر شریف کی حاضری سے محروم ہیں وہ یہاں آنکھیں بچھاتے ہیں کیونکہ

تیرا نقش پا جو نہ مل سکا تیرے رہگزر کی زمیں سہی
ہمیں سجدہ کرنے سے کام ہے جو وہاں نہیں تو یہیں سہی

جمالی برج:

آستانہ عالیہ میں گوشہ مشرق وجنوب میں واقع ہے حضرت بابا صاحبؒ کے خلیفہ اول اور ہانسی کے مشہور ومعروف خطیب حضرت جناب مخدوم جمال الدین صاحبؒ قطب جمال کے نام سے موسوم ہے اہل نظر دیکھتے ہیں کہ اس مقام پر کیسا انوار کا نزول ہوتا ہے۔

نظامی برج:

آستانہ عالیہ کے گوشہ جنوب مغرب میں واقع ہے سلسلہ چشتیہ نظامیہ کے مشہور و معروف بزرگ حضرت خواجہ غلام نظام الدین صاحبؒ سجادہ نشین تونسہ شریف کے بزرگوں سے منسوب ہے۔ اور ہمیشہ بزرگوں کی نشستگاہ رہا ہے۔ اب بھی حضرت خواجہ صاحبؒ جب آستانہ عالیہ پر حاضرؒ ہوتے ہیں تو اسی جگہ قیام فرماتے ہیں۔

گھنٹہ گھر:

۱۸۸۵ء میں حضرت بابا صاحبؒ کے عقیدتمند ایک گھڑی ساز نے جو تونسہ شریف سے مرید تھا یہ گھنٹہ بنایا تھا اس میں ڈائل اور سوئیاں نہیں ہیں اور یہ ہر پاؤ گھنٹہ کے بعد ایک اور آدھ گھنٹہ کے بعد دو اور پون گھنٹہ کے بعد تین چھوٹی گھنٹیا بجاتا ہے اور جب گھنٹہ پورا ہو جاتا ہے تو چار چھوٹی گھنٹیاں بجا کر جتنے بجے ہوتے ہیں۔ بجاتا ہے جس کی آواز دور دور تک سنائی دیتی ہے اس میں آٹھ دن کے بعد چابی دی جاتی ہے۔ اور نہایت قابل دید چیز ہے۔

حضرت بابا صاحبؒ کے حالات میں ایک مکمل اور جامع کتاب جس کو قدیم

فارسی، عربی معتبر کتابوں سے مرتب کیا گیا ہے جو الحاقی روایات اور غیر مستند واقعات سے پاک ہے جس میں یہ بھی کوشش کی گئی ہے کہ حضرت بابا صاحبؒ سے متعلق کوئی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی رہنے نہ پائے۔ ہر روایت اور ہر واقعہ کا ثبوت بمعہ حوالہ کتب وصفحہ موجود ہے اور دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ کتاب کا نام ''انوارلفرید'' ہے۔

نادرات

آستانہ عالیہ حضرت بابا صاحبؒ میں حضرتؒ کے وقت کے کچھ نادرات موجود ہیں۔ جن میں لکڑی کی ایک روٹی ہے جس کے متعلق روایات ہے کہ آپؒ اپنے مجاہدات کے زمانے میں اس روٹی کو کپڑے میں لپیٹ کر ساتھ رکھتے تھے۔

صاحب جواہر فریدی کی روایت ہے کہ حضرت بابا صاحبؒ نے ۱۲ سال اس لکڑی کی روٹی کو اپنے شکم مبارک پر باندھے رکھا انتہائی بھوک میں جب نفس جلنے لگتا تو آپؒ اس کو منہ تک لیجاتے اور نفس سے فرماتے اللہ تعالیٰ کی طاعت وعبادت میں لگا رہ اگر سرکشی دکھائی تو یاد رکھ بھوکا ماردوں گا۔ اس لکڑی کی روٹی پر دونشان پڑے ہوئے ہیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ آپ کے دندان مبارک کے نشانات ہیں۔ واللہ اعلم

جناب وارث شاہ صاحبؒ نے حضرت بابا صاحبؒ کی نفس کشی اور صبر و استقامت کے متعلق خوب فرمایا ہے۔

سونا صبر دا ماریا نفس موذی　　بربھن کیتا چکنا چور ہے جی

اور جناب عبدالقادر گراں نے فرمایا ہے

موج دریائے وفا کان نمک گنج شکر
آسمان فقر را خود آفتاب آمد فرید　　قرص چوبیں بر شکم بربست قرص آفتاب

جبہ شریف:

ان نادرات میں حضرت بابا صاحبؒ کا ایک جبہ شریف ہے جو پرانا ہونے کے سبب شکستہ ہو گیا تھا اس کے اوپر نیچے کپڑے کی تہ لگا دی گئی ہیں۔ اصل جبہ ان کپڑوں کے درمیان پوشیدہ ہو گیا ہے عام لوگ اس کی زیارت نہیں کرتے۔ اب محکمہ اوقاف کی طرف سے شیشہ کے بکس میں نادرات کو رکھے جانے کی تجویز ہے جس سے ہر شخص ان نادرات کی زیارت کر سکے گا۔

بابا صاحبؒ کی جوتیاں:

سرخ نرمی کی بنائی ہوئی جوتی کا ایک جوڑہ یہ بھی بہت بوسیدہ اور مرمت شدہ ہے۔ اگر چہ ان کو حضرت کی جوتیاں بیان کیا جاتا ہے مگر جوتی کا تلا سخت ہوتا ہے۔ اس میں ایسا نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ آپ کی مسحیاں ہونگی یعنی چرمی موزے مگر چمڑا جو ان میں لگا ہوا ہے اس کے متعلق لوگوں کا خیال ہے کہ وہ زیادہ پرانا نہیں ہے۔

علم:

انہی تبرکات و نادرات میں دو علم بھی ہیں۔ جن کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ کا بتایا جاتا ہے۔ علم کا کپڑا بھی بہت بوسیدہ ہو گیا ہے۔ اس کے اوپر اور نیچے بھی کپڑے کی تہ لگا دی گئی ہے۔

ان تبرکات و نادرات کے علاوہ آستانہ شریف پر پتھر کے کچھ میوے ہیں۔ جن میں خوبانی۔ چھوہارے۔ ثعلب مصری۔ اخروٹ۔ چھالیہ وغیرہ قابل دید ہیں۔

کہتے ہیں کہ ایک سوداگر عمدہ قسم کے مندرجہ بالا میوہ جات اونٹوں پر لاد کر تجارت کیلئے لے جا رہا تھا۔ حضرت بابا صاحبؒ اس وقت سر راہ بیٹھے تھے۔ جب اونٹوں کا یہ قافلہ گزرا تو آپؒ نے سوداگر سے پوچھا کہ اونٹوں پر کیا شے لادی ہوئی ہے۔ سوداگر نے منگتا فقیر سمجھ کر جھوٹ بولا اور کہا پتھر ہے۔ آپؒ نے فرمایا پتھر ہوں گے۔

جب منزل پر جا کر بوروں کو کھولا تو اس میں میوہ تو تمام جوں کا توں موجود تھا مگر اس کی ہیت تبدیل ہو چکی تھی۔ یعنی سب میوہ پتھر کا تھا۔ یہ دیکھ کر سوداگر کے پاؤں

تلے کی زمین نکل گئی اور اس کو غش آ گیا جب اس نے غور کیا تو اس کو یاد آیا کہ اجودھن میں جو فقیر بر سر راہ بیٹھا ہوا تھا اور اس نے پوچھا تھا کہ اونٹوں پر کیا لدا ہوا ہے اور میں نے اس سے جھوٹ بولا تھا کہ پتھر ہیں اور اس نے اس کے جواب میں نہایت لاپرواہی سے کہا تھا کہ پتھر ہوں گے۔ یہ اسی زبان کا اثر ہے اور یہ میرے جھوٹ کی سزا ہے۔

وہ سوداگر اپنی اس پریشانی کے ازالہ کیلئے بہت سے درویشوں اور مولویوں کے پاس گیا۔ مگر ناکامی رہی۔ آخر ایک درویش نے اس کو بتایا کہ تم اجودھن واپس جاؤ اور حضرت بابا صاحبؒ سے معافی مانگو یہ سب کچھ انہی کی زبان کا اثر ہے۔ ان کے سوا تمہارا یہ کام کہیں بھی ٹھیک نہ ہوگا۔

ناچارہ وہ سوداگر اجودھن روانہ ہوا۔ جب اسی مقام پر آیا تو اونٹوں کو وہاں بٹھایا اور اس پتھر کے میوہ کی ایک لپ بھر کر حضرتؒ کی خدمت میں آیا اور آپؒ کو اپنی سرگزشت سنائی اور وہ پتھر آپؒ کی خدمت میں ڈال دیئے اور معافی مانگی اور جھوٹ بولنے سے توبہ کی۔ تو آپؒ نے فرمایا اگر وہ میوہ تھا تو میوہ ہو جائے گا۔

اس کے بعد سوداگر واپس اونٹوں کے پاس آیا تو دیکھا واقعی سب اونٹوں میں اصلی میوہ بھرا ہوا تھا۔ یہ پتھر کا میوہ اسی وقت کی یادگار ہے۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ سرہندی

اللہ کے پیارے ولی ۱۴ شوال ۹۷۱ھ (۱۵۶۳ء) کو سرہند شریف میں پیدا ہوئے۔ یہ شہر سلطان فیروز شاہ تغلق نے اپنے پیرومرشد حضرت جلال الدین بخاریؒ کے حکم پر آباد کیا تھا۔ آپ کا نام شیخ احمد رکھا گیا، اور آپ کے والد شیخ عبدالاحد آپ کو اس وقت کے مشہور بزرگ حضرت شاہ کمال کیتھلی کی خدمت میں لے گئے۔ انھوں نے بچے کو دیکھتے ہی فرمایا ''عبدالاحد، تیرے گھر میں عالم باعمل اور عارف کامل پیدا ہوا ہے۔ اس کے فیض سے گمراہیوں کی تاریکیوں کا خاتمہ ہوگیا۔

یہ کہہ کر شاہ کمالؒ نے بچے کے منہ میں انگلی دے دی۔ بچہ انگلی چوسنے لگا۔ کچھ دیر بعد شاہ کمالؒ نے انگلی کھینچ لی اور فرمایا ''بابا، بس کرو اتنا ہی کافی ہے کچھ ہماری اولاد کے لیے بھی چھوڑ دو۔''

جس رات کو حضرت مجدد الف ثانیؒ پیدا ہوئے اس رات کو مغل شہنشاہ اکبر اعظم نے ایک وحشت ناک خواب دیکھا۔ کیا دیکھتا ہے کہ شمال سے ایک تیز آندھی آئی اور اس نے دیکھتے ہی دیکھتے اکبر اعظم کو تخت سمیت اپنی گرفت میں لے لیا۔ بادشاہ نے بڑے ہاتھ پیر مارے لیکن کوئی بس نہ چلا۔ تیز آندھی نے اس کو تخت سمیت زمین پر پٹخ دیا۔

اکبر نے بیدار ہوتے ہی عالموں کو بلایا اور خواب بیان کر کے تعبیر طلب کی۔ ایک عالم نے ڈرتے ڈرتے کہا کہ کوئی ایسا بچہ پیدا ہوا ہے جو آپ کے بنائے ہوئے آئین کو ہلا کر رکھ دے گا۔ پورے ہندوستان کے ان بچوں کا پتا چلانا جو اس رات پیدا ہوئے تھے

بہت مشکل تھا۔ اگر ان بچوں کا پتا چل بھی جاتا تو اس خاص بچے کی شناخت ناممکن تھی۔ اکبر چپ ہو رہا۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے جس ماحول میں پرورش پائی۔ وہ خالص دینی تھا۔ مگر اس ماحول سے ہٹ کر دور دور تک اکبر کی پھیلائی ہوئی خرابیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ اکبر کو اس کے درباریوں نے دیوتا بنا دیا تھا۔ لوگ اس کو سجدہ کرتے تھے۔ اس نے ایک نئے مذہب دین الٰہی کی بنیاد ڈالی تھی۔ عربی مہینے موقوف ہو چکے تھے ان کے بجائے دین الٰہی کا نیا سنہ جاری ہوا تھا۔ گائے کی قربانی پر پابندی لگا دی گئی تھی۔

بادشاہ نے عربی کے خاص حروف ث، ح، ع، ص، ض اور ط، ظ کو حروف تہجی سے نکال دیا تھا۔ چنانچہ عبداللہ کو ابداللہ، احمد کو اہمد، علم کو الم، ثواب کو سواب لکھا اور بولا جانے لگا تھا۔ لوگ السلام علیکم کی جگہ اللہ اکبر اور اس کے جواب میں جل جلالہ بولتے تھے۔ اللہ اکبر میں اکبر اور جل جلالہ میں جلال الدین بادشاہ کا نام سے نسبت پیدا کی گئی۔ یہ وہ زمانہ اور حالات تھے جن میں شیخ احمد سرہندی پرورش پا رہے تھے۔

تعلیم سے فراغت پا کر آپ آگرہ تشریف لے گئے۔ وہاں آپ کی ملاقات بڑے بڑے امراء سے ہوئی۔ ان میں اکبر کے رتن ابوالفضل اور فیضی بھی شامل تھے۔ دونوں بھائی آپ کی علمیت اور قابلیت سے بہت متاثر ہوئے۔ آپ کی جدائی سے آپ کے والد پریشان ہو گئے۔ وہ آپ کو واپس لانے کے لیے آگرہ گئے اور کچھ دن آگرہ میں قیام کے بعد حضرت مجدد الف ثانیؒ کو لے کر سرہند روانہ ہو گئے۔ راستے میں تھانیسری میں قیام کیا اور وہاں کے حاکم اور رئیس شیخ سلطان کے مہمان ہوئے۔ شیخ سلطان عالم دین تھے اور اکبر کی غیر اسلامی باتوں سے نفرت کرتے تھے۔ ایک رات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خواب میں آ کر شیخ صاحب سے کہا کہ اپنی بیٹی حضرت مجدد الف ثانیؒ سے بیاہ دو۔ اس طرح حضرت کی پچیس برس کی عمر میں شیخ سلطان کی لڑکی سے شادی ہوئی اور آپ اپنی دلہن کو لے کر سرہند شریف روانہ ہو گئے۔

انھی دنوں ہندوؤں نے بادشاہ سے شکایت کی کہ شیخ سلطان گائے کی قربانی

کرتے ہیں۔ بادشاہ نے انھیں اس جرم میں بھکر جلاوطن کر دیا۔ لیکن کچھ عرصے بعد خان خاناں کی سفارش پر دوبارہ تھانیسر واپس بلا لیے گئے۔ اسی دوران میں ایک نہایت ہی ناخوش گوار واقعہ پیش آیا۔

اکبرِاعظم لاہور سے واپس آ رہا تھا۔ راستے میں تھانیسر پڑتا تھا۔ اس نے چند دنوں کے لیے یہاں بھی قیام کیا۔ شیخ سلطان نے بادل ناخواستہ حاضری دی۔ بادشاہ اُن سے ناراض تھا۔ اس نے شیخ صاحب سے کہا سلطان ہم نے تم سے ایک بار کہا تھا کہ تم ہمارے لیے قرآن لکھو مگر تم نے اب تک اس حکم کی تعمیل نہیں کی۔''

شیخ سلطان نے جواب دیا'' تم جبریل کو آسمان سے بلاؤ۔ وہ تمھارے لیے قرآن لائیں گے تو میں تمھارے حکم کی تعمیل کروں گا۔''

بادشاہ نے غصے سے کہا'' تو نے بارہ سال سے سرکاری خزانے میں ایک پیسہ بھی جمع نہ کیا۔ بارہ سال کا خراج کہاں گیا۔؟''

شیخ سلطان نے بڑی دلیری سے جواب دیا'' تو مذہب سے پھر کر مرتد ہو گیا ہے۔ ایسے مرتد کا مال عالموں، فقیروں اور حاجت مندوں میں تقسیم کر دینا جائز ہے۔ اس لیے میں نے بارہ سال کے لگان اور مالیے کی رقم مسکینوں اور فقیروں میں تقسیم کر دی۔''

اکبر کا پارہ چڑھ گیا۔ وہ کوئی حکم دینے ہی والا تھا کہ شیخ سلطان نے ایک پتھر اُٹھا کر اس کے چہرے پر کھینچ مارا۔ اس کی پیشانی لہولہان ہو گئی۔ اس نے اسی وقت شیخ سلطان کو سولی پر چڑھا دینے کا حکم دیا۔ اس حکم پر فوراً عمل ہوا اور شیخ صاحب کو پھانسی دے دی گئی۔

اس کے بعد حضرت مجدد الف ثانیؒ کے دل پر ایک اور زخم لگا۔ خسر کی موت کے پچیس دن کے بعد ان کے والد شیخ عبدالاحد کا انتقال ہو گیا۔ آپ نے یہ صدمہ بھی جھیلا اور پھر دہلی چلے گئے۔ دہلی میں آپ کی مشہور بزرگ خواجہ باقی باللہ سے ملاقات ہوئی۔ حضرت باقی باللہ نے نہ صرف آپ کو مرید بنا لیا، بلکہ اپنا خلیفہ بھی مقرر کیا۔ آپ فرماتے تھے کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ ایک چراغ ہیں جو ایک عالم کو منور کریں گے۔ آپ نے اپنے

پیرومرشد سے بہت فیض حاصل کیا اور پھر ان کے حکم پر لاہور روانہ ہو گئے۔

سفر کے دوران آپ اپنے دوستوں اور عقیدت مندوں کے ساتھ ایک سرائے میں ٹھہرے۔ آپ نے آنکھیں بند کر کے کچھ خاموشی اختیار کی اور پھر فرمایا'' لوگو، مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس سرائے پر کوئی مصیبت نازل ہونے والی ہے۔'' حاضرین نے دریافت کیا'' حضرت، اس سے بچنے کی تدبیر بھی ارشاد فرمائیں'' آپ نے فرمایا'' دعائے ماثورہ پڑھتے رہو جو یہ دعا پڑھتا رہے گا، اس مصیبت سے محفوظ رہے گا۔''

تھوڑی دیر بعد ہی سرائے میں آگ لگ گئی اور سرائے کا بہت سا حصہ جل گیا۔ لیکن جن لوگوں نے آپ کی ہدایت پر عمل کیا ان کا سامان محفوظ رہا۔

لاہور کے جس مکان میں آپ مقیم ہوئے وہ پختہ اور مضبوط تھا۔ ایک دن آپ نے مکان کی ایک دیوار کے پاس کھڑے ہو کر فرمایا'' میں گھر کے تمام افراد کو اطلاع دیتا ہوں کہ کوئی اس دالان کے نزدیک نہ آئے اور نہ اس کے نزدیک سوئے۔''

کسی نے سوال کیا'' حضرت یہ کیوں؟ دیوار تو خاصی مضبوط ہے۔'' آپ نے جواب دیا'' میں جلد ہی اس دیوار کو گرتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔''

آدھی رات کے بعد دیوار گر گئی اور جن لوگوں نے آپ کی نصیحت پر عمل نہ کیا انھوں نے نقصان اٹھایا۔

جب آپ کے پیرومرشد حضرت باقی باللہ کا انتقال ہوا تو آپ ان کے مزار پر حاضری دینے کے لیے دہلی گئے اور پھر سرہند تشریف لے گئے اور دو سال بعد اکبرِاعظم بھی چل بسا اور جہانگیر تخت نشین ہوا۔ اس وقت تک لاکھوں لوگ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مرید ہو چکے تھے۔ ان میں خان خاناں خانِ اعظم، سید صدر جہاں، مرتضیٰ خان جیسے شاہی امیروزیر اور مہابت خاں جیسے فوجی جرنیل بھی شامل تھے۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ کو ہدایت و تبلیغ کا سلسلہ شروع کیے ہوئے چودھواں سال تھا کہ طاعون کی وبا پھیلی۔ اس وبا میں آپ کے تین صاحب زادے اور ایک صاحب زادی بھی وفات پا گئے۔ لیکن صبر و استقلال کا دامن آپ کے ہاتھ سے نہ چھوٹا۔

اس واقعے کے دو سال بعد آپ نے اپنے ایک خاص مرید شیخ بدیع الدین سہارنپوری کو خلافت سے نوازا اور حکم دیا کہ دارالسلطنت جا کر شاہی لشکر میں تبلیغ کا کام شروع کرو آگرہ اور دہلی میں انھیں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی اور ہزاروں لشکری آپ کے مرید ہو گئے۔

ایک دن آپ نے فرمایا ''لوگو، تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ مجھ پر ایک مصیبت نازل ہونے والی ہے اور یہ مصیبت میرے حق میں ترقیوں کا باعث بنے گی۔'' دراصل آگرہ میں ملکہ نور جہاں کا بھائی آصف خان اور دوسرے امیر جہانگیر کو بھڑ کا رہے تھے کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کی مقبولیت سے مغلیہ سلطنت کو خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ آخر بادشاہ نے فرمان جاری کر دیا کہ شیخ سرہندیؒ اپنے صاحبزادوں اور مریدوں کے ساتھ بادشاہ کے روبرو حاضر ہوں۔ بادشاہ ان سے ملنے کا خواہش مند ہے۔ اسی کے ساتھ حاکم سرہند کو حکم دیا کہ جس طرح بھی ہو سکے حضرت شیخ سرہندی مجدد الف ثانیؒ کو دارالسلطنت روانہ کیا جائے۔ لوگوں میں افواہ پھیلی ہوئی تھی کہ بادشاہ آپ کو دربار میں بلا کر قتل کر دینا چاہتا ہے۔ آپ نے اپنے صاحب زادوں خواجہ محمد سعید اور خواجہ محمد معصوم کو کسی پہاڑی مقام پر بھیج دیا اور عزیزوں سے فرمایا: ''گھبراؤ مت۔ بادشاہ میرا کچھ نہ بگاڑ سکے گا۔ یہ تکلیف ایک سال کی ہے۔ اس کے بعد آرام ہی آرام ہے۔

آپ نے پانچ مریدوں کو ساتھ لیا اور آگرہ روانہ ہو گئے۔ آپ کی تشریف آوری کی خبر سن کر جہانگیر نے امیروں کو آپ کے استقبال کے لیے بھیجا اور آپ کا خیمہ اپنے محل کے قریب نصب کرایا۔ اس کے بعد آپ دربار میں طلب کیے گئے۔ اس وقت تک رواج تھا کہ بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہونے والے لوگ اسے سجدہ کرتے تھے۔ اسے سجدہ تعظیمی کہا جاتا تھا۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے جہانگیر کو سجدہ نہ کیا اور سر اٹھائے کھڑے رہے۔ ایک امیر نے بادشاہ سے عرض کیا:

''حضور، اس شخص کا غرور ملاحظہ فرمائیے۔ یہ آپ کو سجدہ تعظیمی نہیں بجا لا رہا۔''

بادشاہ نے کہا ''شیخ صاحب، آپ کو آداب شاہی کا خیال تو کرنا ہی پڑے گا۔

بہتری اسی میں ہے کہ آپ مجھے سجدہ تعظیمی کریں۔

آپ نے جواب دیا ''ہرگز نہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ اللہ کے سوا کسی دوسرے کو سجدہ کرنا حرام ہے۔''

جہانگیر نے کہا اچھا ہم آپ کو اتنی رعایت دینے کو تیار ہیں کہ آپ اپنا سر ذرا سا جھکا دیں۔ ہم اسے سجدہ تعظیمی شمار کر لیں گے۔

مگر آپ نے سختی سے انکار کر دیا۔ جہانگیر کو غصہ آ گیا۔ اس نے کہا ہماری زبان سے جو نکل چکا ہے اس کی تعمیل ہو کر رہے گی۔

اس نے اپنے امیروں کو حکم دیا کہ آپ کا سر جھکا دیا جائے۔ امراء نے آپ کے سر اور گدی کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ مگر آپ نے پوری قوت سے سر اکڑا لیا اور گردن اٹھا کر کھڑے ہو گئے۔ امیروں نے پوری قوت سے آپ کا سر جھکانے کی کوشش کی۔ لیکن ذرا سا بھی نہ جھکا سکے۔ اس کشمکش میں حضرت کی ناک سے خون جاری ہو گیا۔ یہ دیکھ کر بادشاہ کو کچھ رحم آیا لیکن حکومت کا غرور سر میں سمایا ہوا تھا اس نے حکم دیا کہ آپ کو باہر لے جاؤ اور محل کے چھوٹے دروازے سے اندر لاؤ۔ جب آپ سر جھکا کر اندر داخل ہوں گے تو اس کو سجدہ تعظیمی سمجھ لیا جائے گا۔ لیکن حضرت نے اس دروازے میں پہلے ایک پیر داخل کیا، اس کے بعد سر کو پیچھے جھکا کر اندر آ گئے۔ بادشاہ نے آپ کو اور آپ کو مریدوں کو گوالیار کے قلعے میں قید کرنے کا حکم دیا اور آپ کی تمام جائیداد اور ساز و سامان ضبط کر لیا۔

حاکم قلعہ آپ کے ساتھ سختی سے پیش آتا تھا۔ یہ دیکھ کر آپ کے ایک مرید سے نہ رہا گیا۔ اس نے غصے سے حاکم قلعہ سے کہا ''او ظالم، کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ بادشاہ نے ہمیں یہاں قید کیا ہے؟ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ یاد رکھ ہم یہاں خدا کے حکم سے آئے ہیں۔ ہم چاہیں تو اسی وقت یہاں سے جا سکتے ہیں اور تو ہمیں کسی طرح بھی نہیں روک سکتا۔''

یہ کہہ کر وہ مرید اچھلا اور قلعے کی سب سے اونچی دیوار پر جا بیٹھا۔ حاکم قلعہ اور سپاہی حیران و پریشان اس کو دیکھنے لگے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے مرید کو روک دیا اور

فرمایا کیا میں یہ کرامت نہیں دکھا سکتا جو تم دکھا رہے ہو؟ یہ اللہ کی مرضی ہے کہ ہم زمانے کے ظلم وستم برداشت کریں۔''

آخر اللہ نے جہانگیر کو اس کے ظلم کی سزا دی۔ خان اعظم، خان جہاں لودھی اور دوسرے کے خلاف بغاوت کر دی۔ جہانگیر مقابلے کے لیے آیا مگر مہابت خان نے اسے بڑی ہوشیاری سے گرفتار کر لیا۔ گوالیار کے لوگوں نے یہ کوشش کی کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ ہندوستان کی حکومت سنبھال لیں۔ لیکن آپ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور مہابت خان کو سختی سے ہدایت کی کہ فتنہ وفساد ختم کرو اور بادشاہ کی اطاعت کرو۔ مہابت خان نے بادشاہ کو رہا کر دیا اور گستاخی کی معافی مانگ لی۔

اس کے کچھ عرصے بعد جہانگیر سخت بیمار ہو گیا۔ اس نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ کوئی بزرگ فرما رہے ہیں کہ اے جہانگیر تو نے شیخ سرہندی پر بڑا ظلم کیا۔ وہ امام وقت اور اسلام کے مجدد ہیں اور تیری بیماری کا اصل سبب ہی وہ ہیں۔ انھیں رہا کر کے شفا حاصل کر۔

جہانگیر نے فوراً حضرت کی رہائی کا حکم جاری کر دیا اور خواست کی کہ رہائی کے بعد مجھ سے ملاقات ضرور کریں۔ آپ تین دن سرہند میں قیام کر کے آگرہ پہنچے۔ وہاں شہزادہ خرم (شاہجہاں) نے آپ کا شاندار استقبال کیا۔ آپ نے بادشاہ سے ملاقات کے لیے سات شرطیں رکھیں۔

۱۔ سجدہ تعظیمی موقوف کیا جائے۔
۲۔ گائے کی قربانی کا حکم جاری کیا جائے۔
۳۔ جن مسجدوں کو شہید کیا گیا ہے انھیں دوبارہ تعمیر کیا جائے۔
۴۔ دربار عام کے قریب مسجد تعمیر کی جائے۔
۵۔ دینی مدرسے قائم کیے جائیں۔
۶۔ شہروں میں مفتی اور قاضی مقرر کیے جائیں۔
۷۔ شریعت کے خلاف تمام قانون منسوخ کر دیے جائیں۔

جہانگیر نے آپ کی تمام شرطیں منظور کر لیں اور آپ سے اپنی زیادتیوں کی معافی مانگی۔

جب شہزادہ خرم کو یہ معلوم ہوا کہ جہانگیر اس کے بجائے نور جہاں کے داماد شہریار کی ولی عہدی کا اعلان کرنے والا ہے تو وہ باپ کے خلاف میدان جنگ میں اتر آیا۔ جہانگیر کی بدقسمتی سے عین جنگ کے دوران شاہی فوج کے چند دستے شہزادہ خرم سے جا ملے۔ جہانگیر پریشان ہو گیا۔ اس نے حضرت مجدد الف ثانیؒ سے دعا کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا 'مطمئن رہو، تم کامیاب رہو گے۔''

دوسری طرف شہر کے چند بزرگوں نے حضرت مجدد الف ثانیؒ کو پیغام بھجوایا کہ ہم کو معلوم ہوا ہے کہ اس جنگ میں شہزادہ خرم کامیاب ہوگا آپ کی کیا رائے ہے؟ آپ نے جواب دیا ہم پر کچھ اور ہی ظاہر ہوا ہے۔ شہزادے کو شکست ہوگی۔ لیکن بالآخر شہزادہ کامیاب ہوگا۔ جنگ ہوئی بادشاہ کامیاب ہوا اور شہزادے کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔

ایک دن آپ تنہا بیٹھے تھے کہ شہزادہ خرم چھپتا چھپاتا، آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور شکایت کی کہ حضرتؒ، یہ عجیب بات ہے کہ میں نے ہمیشہ آپ کی طرف داری کی، مگر آپ نے میرے حق میں دعا نہ فرمائی۔ بادشاہ کے حق میں دعا فرما دی۔

آپ نے جواب دیا مت گھبرا۔ مجھے اللہ کی طرف سے معلوم ہوا ہے کہ تو عنقریب تخت پر بیٹھے گا اور تیرا لقب شاہجہاں ہوگا۔ شہزادہ بہت خوش ہوا اور اس نے تبرک کے طور پر آپ کے دستار لے لی جو عرصے تک مغل بادشاہوں کے خزانے میں محفوظ رہی۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ امیروں، وزیروں اور عام لوگوں کو خط لکھ کر نصیحتیں کرتے رہتے تھے۔ آپ نے اپنے ایک خط میں بادشاہ کی حیثیت کے بارے میں تحریر فرمایا

دنیا کے ساتھ بادشاہ کا تعلق ایسا ہے جیسا دل کا جسم سے۔ اگر دل اچھا ہے تو بدن بھی اچھا رہے گا۔ اگر دل بگڑ جائے تو بدن بھی بگڑ جائے گا۔ بالکل اسی طرح ملک کی

بہتری بادشاہ کی بہتری پر منحصر ہے۔ اگر بادشاہ بگڑ جائے گا تو ملک کا بگڑ جانا بھی لازمی ہے۔"

ایک ہندو ہردے رام نے رام اور رحمان (اللہ) کو ایک ہی قرار دیا تو آپ نے اسے تحریر فرمایا" ہندو جس رام اور کرشن کو پوجتے ہیں وہ تو ماں باپ سے پیدا ہوئے تھے۔ رام دسرتھ کا بیٹا، لچھمن کا بھائی اور سیتا کا خاوند تھا۔ لہذا یہ کہنا کہ رام اور رحمان ایک ہی ہستی کے دو نام ہیں۔ کسی طرح بھی ٹھیک نہیں۔"

آپ نے ۶۳ سال کی عمر میں منگل کے دن ۲۸ صفر ۱۰۳۴ھ (دسمبر ۱۶۲۴ء) کو وفات پائی اور سرہند میں دفن ہوئے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آپ کی شخصیت اور کارناموں کی اہمیت بڑھتی گئی۔ آج شیخ احمد سرہندیؒ کو دنیا امام ربانی، محبوب سبحانی اور مجدد الف ثانیؒ کے نام سے یاد کرتی ہے۔ مجدد کے معنی ہیں پرانے کو نیا کرنے والا۔ اور الف ثانی کا مطلب ہے دوسرے ہزار سال شہنشاہ اکبر کے زمانے میں مسلمانوں میں ایک فرقہ الفیہ پیدا ہوا تھا، جس کا عقیدہ تھا کہ اسلام کی تعلیمات صرف ایک ہزار سال کے لیے تھیں۔ اور چونکہ اسلام کو آئے ایک ہزار سال گزر چکے ہیں اس لیے اب ان کی ضرورت نہیں۔ دراصل اس فرقے کا مقصد یہ تھا کہ لوگ اسلام سے برگشتہ ہو کر اکبر کا دین الٰہی قبول کر لیں۔ چونکہ حضرت شیخ احمد سرہندیؒ نے مسلمانوں میں نئی روح پھونکی انھیں گمراہی سے نکال کر سیدھے سچے راستے پر چلایا اور اسلام کو اتنا مضبوط کر دیا کہ وہ مزید ایک ہزار سال تک زندہ تابندہ رہ سکتا ہے، اس لیے آپ کو مجدد الف ثانی کہا گیا۔

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ

حضرت مخدوم کا خاندانی میر سید جلال الدین تھا۔ آپ ۷۰۷ھ (۱۳۰۷ء) میں اوچ شریف (سابق ریاست بہاول پور) میں پیدا ہوئے آپ کے والد کا نام سید احمد کبیر تھا۔ آپ کا بچپن دوسرے بچوں سے اس قدر مختلف گزرا کہ بڑے بڑے دانشور دنگ رہ جاتے تھے۔ لوگ بچپن ہی سے آپ کا ادب اور احترام کرتے تھے۔

جب آپ کی عمر سات سال کی ہوئی تو ایک روز آپ کے والد آپ کو شیخ جمال الدین خنداں روؒ کی خدمت میں لے گئے۔ اس وقت آپ کی خدمت میں کسی نے کھجوریں بھجوائی تھیں۔ آپ نے حکم دیا کہ کھجوریں حاضرین میں تقسیم کر دی جائیں۔ ایک بزرگ کا تبرک تھا۔ سب حاضرین شوق سے کھانے لگے۔ حضرت مخدومؒ بھی عقیدت کے ساتھ کھاتے رہے۔ جب کھجوریں ختم ہو گئیں تو آپ نے گٹھلیاں کھانی شروع کر دیں۔ حضرت جلال الدینؒ کچھ دیر تک خاموشی سے دیکھتے رہے۔ پھر آپ نے پوچھا" بچے گٹھلیاں پھینک دینے کی چیز ہوتی ہیں۔ انھیں کس لیے کھا رہے ہو؟"

حضرت مخدومؒ چند لمحے سر جھکائے بیٹھے رہے۔ پھر فرمایا" یہ کھجوریں مجھے آپ کے ہاتھ سے نصیب ہوئی ہیں، اس لیے ان کی گٹھلیاں بھی فیض سے خالی نہیں۔" حضرت مخدومؒ کا یہ جواب سن کر پوری محفل پر سناٹا چھا گیا۔ حضرت خنداں روؒ حضرت مخدومؒ کا جواب سن کر مسکرائے اور محبت سے فرمایا" صاحبزادے خدا کا شکر ہے کہ میری آنکھوں نے دھوکا نہیں کھایا۔ خدا تمہیں اپنی پناہ میں رکھے اور تم پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔"

اس واقعے کے بعد حضرت مخدومؒ دینی تعلیم کی طرف متوجہ ہو گئے آپ نے دو سال تک شیخ الاسلام حضرت شیخ عفیف الدین عبداللہ کی شب و روز خدمت کی، جس سے متاثر ہو کر اس مردِ کامل نے آپ کو تمام علوم سے نوازا اور خرقہ بھی عطا کیا۔

جب آپ حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے تو آپ کی ملاقات مشہور بزرگ امام عبداللہ یافعیؒ سے ہوئی۔ رخصت کے وقت آپ سے حضرت امامؒ نے فرمایا ''جلال الدین، دہلی جا کر نصیرالدین چراغ'' دہلی کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دو۔ اس وقت ہندوستان میں وہی معرفت کے چراغ ہیں۔''

حضرت مخدومؒ دہلی آ کر حضرت چراغ دہلیؒ کے حضور میں حاضر ہوئے اور ان سے اس قدر فیض حاصل کیا کہ دل و دماغ کا ہر گوشہ روشن ہو گیا۔

ایک بار حضرت شیخ ابوالفتح ملتانی'' زینے سے اتر رہے تھے کہ حضرت مخدومؒ دوڑ کر راستے میں لیٹ گئے تا کہ ان کا مبارک قدم آپ کے سینے پر پڑ جائے۔ مگر حضرت شیخ ابوالفتح آگے بڑھنے کی بجائے ٹھہر گئے اور فرمایا ''سید تمھیں اس کی ضرورت نہیں۔ تم اپنے مرتبے کو پہنچ چکے ہو۔ اٹھو کہ تم مخدوم جہانیاں ہو۔'' یہ کہہ کر آپ نے آپ کو اپنے سینے سے لگا لیا اور بے شمار نعمتیں عطا کیں۔ اسی روز سے آپ مخدوم جہانیاں کے لقب سے مشہور ہوئے۔

حضرت جلال الدین پہلے مخدوم جہانیاں کہلائے اور پھر آپ کو جہاں گشت کا لقب ملا۔ جہاں گشت کا مطلب ہے دنیا کی سیر کرنے والا۔ آپ نے بہت سے ممالک کا سفر کیا اور اللہ کی زمین کے بے شمار حصوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

آپ کو حضرت غوث الاعظمؒ سے بے انتہا عقیدت تھی۔ آپ اکثر کہا کرتے تھے کہ غوث الاعظمؒ نے فرمایا ہے کہ خوشخبری اس کے لیے ہے جس نے مجھے دیکھا اور خوشخبری اس کے لیے بھی ہے جس نے میرے دیکھنے والے کو دیکھا۔

ایک مرتبہ آپ اپنے چند مریدوں کے ہمراہ سرہند شریف (مشرقی پنجاب) سے گزر رہے تھے کہ اچانک ٹھہر گئے۔ پھر مریدوں سے پوچھا کہ ''کیا تمھیں یہاں کوئی عجیب بات معلوم ہوئی؟'' مریدوں نے نفی میں جواب دیا۔ آپ نے پھر پوچھا کیا تم معطر ہواؤں کی خوشبو نہیں سونگھ

رہے ہو؟ مرید اس مرتبہ بھی خاموش رہے۔ وہ اپنے پیر و مرشد کی باتیں سمجھنے سے قاصر تھے۔ حضرت مخدومؒ نے فرمایا ''افسوس! تم بے خبر ہو، یہاں کی خاک مقدس ہے۔ یہاں کی ہوائیں جانفزا ہیں۔ ان میں خدا کے دوست کے کپڑوں کی خوشبو بسی ہوئی ہے، آنے والے کے روشن چہرے کو میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔ اس پر خدا کی بے شمار رحمتیں نازل ہوں گی۔ وہ کروڑوں بندگانِ خدا کو ایک فتنۂ عظیم سے نجات دلائے گا۔

کسی نے نہیں سمجھا کہ حضرت کا اشارہ کس کی طرف ہے، صدیاں گزر گئیں، آخر تین سو سال بعد سرہند شریف میں حضرت مجدد الف ثانی پیدا ہوئے اور آپ نے مغل شہنشاہ اکبر اعظم کے دینِ الٰہی کے فتنے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔

حضرت مخدومؒ کو خدا کے احکام اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت سے عشق تھا۔ جو مذہب کی حدود سے آگے نکل جائے۔ چاہے وہ کتنا بڑا بزرگ ہی کیوں نہ ہو آپ اس کو سخت ناپسند فرماتے تھے۔ آپ نے زندگی بھر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کی۔ جہاں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت پر عمل کرنے والا نظر آتا آپ اس کی بے حد عزت کرتے۔ آپ حافظ قرآن کا بھی بہت ادب کرتے تھے۔ اسی وجہ سے آپ نے کئی سال شیخ سراج الدین کے پیچھے نماز ادا کی۔ زمانہ جس کی امامت میں نماز پڑھنے کے لیے بے چین رہتا، وہ اپنے ایک مرید کے پیچھے ہاتھ باندھے نماز ادا کرتا تھا، اس لیے کہ وہ حافظ قرآن تھا۔

آپ کے مزاج میں حد درجے کی نرمی تھی۔ آپ نے کبھی اپنی تعریف پسند نہیں فرمائی اور نہ کبھی ارادتاً کوئی کرامت ظاہر کی۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ معرفت کے سورج تھے اور سورج کی روشنی کسی طرح بھی نہیں چھپ سکتی۔

۷۸ سال تک آپ نے خلقِ خدا کی خدمت کی۔ بے شمار لوگوں کو نیکی کی راہ دکھائی اور ان کے دلوں کو منور کر دیا۔ آخر ۷۸۵ھ (۱۳۸۳ء) میں یہ روحانی آفتاب غروب ہو گیا۔ آپ کا مزار اوچ شریف میں ہے۔

حضرت علاؤالدین صابر کلیریؒ

آپ کا نام علی احمد اور لقب علاؤالدین اور مخدوم صابر ہیں۔ آپ حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ کے بھانجے تھے۔ ۱۹ ربیع الاول ۵۹۲ھ کو جمعرات کے دن پیدا ہوئے اور سات ماہ کی عمر میں ماں کا دودھ پینا چھوڑ دیا۔ بچپن ہی میں۔ باپ کے سائے سے محروم ہو گئے اور پھر بے شمار مصیبتیں جھیل کر اللہ والے بزرگ بنے۔ آپ نے کبھی یہ نہ سوچا کہ آپ بے سہارا اور یتیم ہیں۔ اپنے معمولی اور پھٹے پرانے کپڑے دیکھ کر اداس ہوئے نہ کبھی فاقے میں بھوک سے بے قرار ہوئے۔ جب بھی آپ کو کسی محرومی کا احساس ہوتا تو آسمان کی طرف نظر کر کے بے اختیار کہہ اٹھتے:

''مجھے میرا رب کافی ہے۔ مجھے میرا رب کافی ہے۔''

آپ کے ماموں بابا فریدالدین گنج شکرؒ شہنشاہ ہندوستان کے داماد تھے۔ مگر انھوں نے اپنے بھانجے کی کوئی مالی مدد نہ کی۔ وہ چاہتے تھے کہ آپ مصائب کی بھٹی میں تپ کر کندن بنیں۔ جب آپ فقر و فاقہ کے عادی ہو گئے تو حضرت بابا صاحبؒ نے آپ کو اپنے پاس بلا لیا۔

حضرت باباؒ نے آپ کو لنگر خانے کا نگران مقرر کیا اور کہا فقیروں کی غذا کا اہتمام اس طرح کرو کہ کوئی بھوکا نہ رہے اور انھوں نے بجا طور پر حکم کی بجا آوری کی۔ کئی ماہ بعد حضرت صابرؒ کی والدہ آپ سے ملنے آئیں تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ آپ سوکھ کر کانٹا ہو گئے ہیں۔ وہ انھیں اپنے بھائی کے پاس لے گئیں اور شکایت کی کہ میں نے علاؤالدین کو آپ کے پاس اس لیے نہیں بھیجا تھا کہ اس کی صحت تباہ ہو جائے۔ حضرت باباؒ نے آپ کو تنہائی میں بلا کر پوچھا کہ تم لنگر خانے کے نگران ہوتے ہوئے بھی اتنے کمزور ہو۔ کیا کھانا نہیں کھاتے؟ آپ نے فرمایا'' آپ نے کھانا تقسیم کرنے کے لیے فرمایا تھا، مجھے کھانے کا حکم نہیں دیا تھا۔'' حضرت باباؒ نے آپ کو سینے سے لگاتے ہوئے کہا'' بے شک تو صابر ہے۔''

آپ کی والدہ چاہتی تھیں کہ اپنے لخت جگر کو اپنے ساتھ لیتی جائیں۔ جب حضرت باباؒ سے اپنے ارادے کا اظہار کیا تو آپ نے فرمایا'' اگر علاؤالدین صبر کی اس منزل سے نہ گزرا ہوتا تو شاید دنیا والوں کی محبت اسے اپنی طرف کھینچ لیتی۔ مگر اب وہ دنیا کے کسی کام کا نہ رہا۔ خدا اس سے کچھ اور ہی کام لینا چاہتا ہے۔ تو بھی صبر کر۔ اسی میں ہم سب کی بہتری ہے۔'' ماں کو مجبوراً اپنے دل کے ٹکڑے کو بھائی کے سپرد کر کے واپس جانا پڑا۔

جب آپ جوان ہو گئے تو آپ کی والدہ نے اپنے بھائی حضرت بابا فریدالدینؒ سے گزارش کی کہ وہ انھیں اپنی فرزندی میں لے لیں۔ حضرت باباؒ کی دونوں صاحبزادیاں جوان ہو چکی تھیں۔ بہن کی خواہش سن کر حضرت باباؒ سوچ میں گم ہو گئے۔ بہن نے کہا کہ شاید آپ علاءالدین کی غریبی اور یتیمی کی وجہ سے اس رشتے کو پسند نہیں فرماتے۔ آپ کی صاحبزادیاں شہنشاہ ہند کی نواسیاں ہیں اور علاءالدین ایک غریب ماں کا بچہ ہے۔

یہ سن کر حضرت باباؒ نے کہا'' خدا کی قسم، صابر یتیم سہی، مگر غریب نہیں۔ وہ ہندوستان کے شہنشاہوں سے بڑا شہنشاہ ہے۔ مگر وہ خدا کا ہو چکا، اس لیے کسی اور سے کیا رشتہ جوڑے گا۔''

لیکن بہن کی ضد کے آگے انھیں جھکنا پڑا اور انھوں نے حضرت علاءالدین صابرؒ کے ساتھ اپنی بڑی صاحب زادی کی شادی کر دی۔ جب آپ نے اپنی دلہن کو دیکھا تو ماں سے پوچھا'' یہ کون ہے؟'' والدہ نے بڑی محبت سے جواب دیا'' بیٹے یہ تیری شریک

حیات ہے۔'' حضرت مخدومؒ نے فرمایا'' میں تو ایک کا ہو چکا۔ پھر درمیان میں یہ دوسرا کون آ گیا؟'' یہ کہہ کر آپ نے دلہن کی طرف دیکھا۔ فوراً ہی ایک شعلہ سا بھڑکا اور ایک رات کی دلہن جل کر خاک سیاہ ہو گئی۔

آپ کی والدہ روتی دھوتی حضرت باباؒ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور تمام ماجرا کہہ سنایا۔ حضرت باباؒ کے لبوں پر مسکراہٹ ابھر آئی اور آپ نے فرمایا'' مجھے معلوم تھا کہ یہی کچھ ہونے والا ہے۔ اسی لیے میں نے تمھیں منع کیا تھا۔ اب تو تم نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ صابر کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔'' آپ کی بیوی کا مزار پاک پٹن شریف میں ہے اور وہاں کسی مرد یا عورت کو جانے کی اجازت نہیں۔ ۶۲۵ ھ میں حضرت باباؒ صاحب نے آپ کو خلافت عطا کی اور کلیر جانے کا حکم فرمایا۔ مشرقی پنجاب (ہندوستان) سے گزر کر بھارت کے سب سے بڑے صوبے یو پی کی سرحد میں داخل ہوں تو سب سے پہلے شہر سہارنپور آئے گا۔ رُڑکی اسی شہر کی ایک تحصیل ہے۔ کلیر شریف اس تحصیل کا ایک گاؤں ہے۔

اس علاقے کا حاکم بہت ظالم اور سنگ دل تھا۔ مخدوم پاکؒ ایک عرصے تک کلیر کی سرائے میں مقیم رہے۔ کلیر کے باشندے آپ کے پاس آ کر حاکم وقت کی شکایت کرتے۔ مگر آپ ہر مرتبہ یہ کہہ کر ٹال دیتے کہ صبر کرو ابھی انتظار کی گھڑیاں ختم نہیں ہوئیں۔ کچھ عرصے بعد جمعے کے روز، حضرت مخدوم پاکؒ جمعے کی نماز کے لیے جامع مسجد تشریف لے جانے لگے۔ جاتے ہوئے آپ نے سرائے کی بوڑھی مالکن سے فرمایا'' اپنے بیٹے کو ہدایت کر دینا کہ آج وہ جمعے کی نماز کو نہ جائے۔'' مگر وہ آپ کا مطلب نہ سمجھ سکی۔

مخدوم پاکؒ مسجد میں تشریف لے گئے اور اگلی صف میں امام کے قریب بیٹھ گئے۔ امام نے آپ سے کہا'' یہ جگہ حاکم کے لیے ہے، مخدوم پاکؒ نے نہایت نرمی سے فرمایا'' خدا کے گھر میں سب برابر ہیں۔'' مگر امام نے آپ کی ایک نہ مانی اور آپ کو مجبور کر دیا کہ آپ پچھلی صف میں چلے جائیں۔ مخدوم پاکؒ اپنی جگہ سے اٹھے اور مسجد کی چھت

کی طرف نظر ڈالتے ہوئے فرمایا'' حجت پوری ہو چکی۔ اب تو کسی کو کوئی شکایت نہ ہو گی۔''

لوگ آپ کی باتوں کو نہ سمجھ سکے اور آپ کا مذاق اڑانے لگے۔ حضرت خاموش ہو گئے اور مسجد کے دروازے پر آ کر کھڑے ہو گئے۔ اتنے میں حاکم بھی آ گیا۔ جیسے ہی وہ مسجد میں داخل ہوا۔ سب اس کے احترام میں کھڑے ہو گئے۔ مخدوم پاکؒ نے ایک سرد آہ بھر کر فرمایا'' افسوس! یہ لوگ خدا سے زیادہ آدمی کا احترام کرتے ہیں۔'' خطبے کے بعد نماز شروع ہوئی اور جب امام کے ساتھ دوسرے نمازی سجدے میں گئے تو آپ نے مسجد کے میناروں کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا'' تمام عالم اپنی بندگی کا اظہار کر رہا ہے۔ پھر تم کیوں سجدہ نہیں کرتے؟'' ابھی آپ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہی ہوئے تھے کہ مسجد گر گئی اور حاکم کے ساتھ تمام نمازی بھی دب کر ہلاک ہو گئے۔

سرائے کی مالکن کو اس واقعے کی اطلاع ملی تو وہ گھبرائی ہوئی مسجد میں پہنچی۔ اس کا بیٹا نمازیوں میں شامل تھا۔ اس نے مخدوم پاکؒ سے روتے ہوئے کہا'' یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا ہے۔ ہائے! میرا جوان بیٹا مر گیا۔'' آپ نے فرمایا'' میں نے تو پہلے ہی تجھے منع کر دیا تھا مگر بوڑھی عورت ایک نہ مانی اور آپ کو اپنے بیٹے کی موت کا ذمے دار ٹھہراتی رہی۔ آخر مخدوم پاکؒ سے برداشت نہ ہو سکا۔ آپ نے غصے سے فرمایا'' اگر میری وجہ سے تیرا بیٹا ہلاک ہوا ہے تو اینٹوں اور پتھروں کے ڈھیر میں اسے تلاش کر لے۔'' یہ کہہ کر آپ نے ایک طرف اشارہ کیا۔ عورت بے قرار ہو کر اس طرف دوڑی اور جب اس نے ملبہ اٹھایا تو اس کا بیٹا زندہ تھا۔ آج بھی اس جامع مسجد کے کھنڈر کلیر شریف میں موجود ہیں۔

آپ نے ۲۹۰ میں انتقال فرمایا اور کلیر شریف میں دفن ہوئے۔ آپ کی قبر مبارک صدیوں سے بے نشان تھی۔ حضرت شاہ عبدالقادر گنگوہیؒ نے اسے پختہ کروایا۔

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ

آپ کا نام بختیار اور قطب الدین لقب تھا۔ ۵۸۳ھ (۱۱۸۷ء) میں ترکستان کے قصبہ اوش میں پیدا ہوئے۔ آپ کی درگاہ سے لوگوں کو جو روٹی تقسیم ہوتی تھی اس کو ''کاک'' کہتے تھے۔ اس لیے لوگ آپ کا خواجہ کوکی کہنے لگے۔

آپ حضرت امام حسین علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے اور حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کے مرید خاص اور سب سے بڑے خلیفہ تھے۔ حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ آپ ہی کے مرید اور خلیفہ تھے۔

آپ کی عمر دو سال سے کم تھی کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ والدہ نے بڑی محنت سے آپ کی تربیت کی۔ ابتدائی تعلیم حضرت مولانا ابوحفص سے حاصل کی۔ جب حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اوش تشریف لائے تو آپ ان کے مرید ہو گئے اور سترہ سال کی عمر میں ان سے خلافت حاصل کی۔ آپ رات دن میں سو رکعت نماز ادا کیا کرتے تھے اور ہر رات تین ہزار مرتبہ درود شریف پڑھتے تھے۔

علم حاصل کرنے کی غرض سے آپ نے بہت سے ملکوں کی سیاحت کی بغداد پہنچ کر حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ اور شیخ اوحد الدین کرمانی سے فیض حاصل کیا اور حضرت خواجہ ابو یوسف چشتیؒ سے بھی ملاقات کہا جاتا ہے کہ جب آپ بغداد میں تھے تو آپ کو خبر ملی کہ خواجہ معین الدین چشتیؒ ہندوستان جا رہے ہیں۔ یہ سن کر آپ بھی ہندوستان چل پڑے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ آپ حضرت خواجہ اجمیریؒ کے ساتھ ہندوستان تشریف لائے۔ پھر انہی کے حکم پر اجمیر سے دہلی تشریف لے گئے۔

دہلی کے سفر کے دوران آپ ملتان پہنچے اور وہاں کے مشہور بزرگ حضرت بہاؤ الدین زکریا ملتانیؒ سے ملاقات کی۔ وہ آپؒ سے بڑی محبت سے پیش آئے۔ وہاں آپؒ نے کچھ دن قیام کیا۔ اس اثناء میں مغلوں نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ ملتان کے حاکم قباچہ نے آپ سے دعا کی درخواست کی اور آپ کی کرامت اور دُعا سے مغل شکست کھا کر فرار ہو گئے۔

جب آپ ملتان سے روانہ ہو کر دہلی کے قریب پہنچے تو سلطان شمس الدین التمش نے آپ کا استقبال کیا۔ وہ آپ کے قیام کا انتظام شہر کے اندر کرنا چاہتا تھا۔ آپ راضی نہ ہوئے اور کیلوکھیری میں قیام فرمایا۔ سلطان التمش ہفتے میں دو بار آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ آخر اس کے اصرار سے مجبور ہو کر آپ نے دہلی کے اندر ملک عین الدین کی مسجد میں قیام فرمایا۔

شیخ الاسلام حضرت جمال الدین بسطامیؒ کی وفات کے بعد التمش نے آپ کو ان کی جگہ پر مقرر کرنا چاہا۔ لیکن جب آپ نے انکار کر دیا تو شیخ نجم الدین صغریٰ کو اس عہدے پر مامور کیا۔ شیخ نجم الدین حضرت عثمان ہارونیؒ کے مرید تھے۔ جب حضرت خواجہ کی شکایت کی۔ اس پر حضرت خواجہ اجمیریؒ حضرت بختیار کو اپنے ساتھ اجمیر لے جانے لگے۔ دہلی کے باشندوں نے رونا پیٹنا شروع کر دیا۔ جس جگہ قطب صاحب قدم رکھتے، لوگ وہاں کی خاک اٹھا کر آنکھوں سے لگاتے تھے۔ یہ دیکھ کر خواجہ اجمیریؒ نے انھیں دہلی ہی میں رہنے کا مشورہ دیا اور آپ آخر وقت تک وہیں رہے۔

سلطان التمش کو حضرتؒ سے جو عقیدت تھی اس کا شاہی دربار پر بڑا اچھا اثر پڑا۔ التمش آپ کا ہر حکم مانتا تھا۔ وہ خود بھی بڑا عبادت گزار اور پرہیزگار بادشاہ تھا۔ بادشاہ ہونے کے باوجود اپنے اکثر کام خود کرتا اور نوکروں کو تکلیف نہ دیتا۔ رات کو بھیس بدل کر رعایا کی تکالیف معلوم کرتا اور انھیں دور کرتا۔ غریبوں اور حاجت مندوں کی مالی امداد کرتا

اور ہمیشہ انصاف کرتا۔ اس وجہ سے رعایا اس سے بہت خوش تھی۔

بادشاہ کی اس قدر عقیدت کے باوجود خود حضرت بختیار کے گھر میں ہمیشہ تنگ دستی رہتی۔ بعض اوقات پڑوسیوں سے قرض لے کر گزارہ کرنا پڑتا۔ خود سلطان التمش اور اس کے وزیر نے کئی مرتبہ کوشش کی کہ کچھ گاؤں آپ کے لیے وقف کر دیں۔ مگر آپ نے منع کر دیا۔ آپ فرماتے تھے کہ جب ہمارے بزرگوں نے کسی سے گاؤں قبول نہ کیے تو ہم کیسے کر لیں۔ اگر ہم نے ایسا کیا تو قیامت کے دن انھیں کیا منہ دکھائیں گے؟

۶۳۳ھ (۱۲۳۶ء) کی بات ہے ایک دن آپ قوالی کی محفل میں بیٹھے تھے کہ ایک شعر سن کر آپ پر وجد طاری ہو گیا اور آپ تڑپنے لگے اسی حالت میں شیخ حمید الدین ناگوری اور مولانا بدر الدین غزنوی آپ کو گھر لے گئے۔ تین دن اور تین رات وجد کی کیفیت رہی۔ نماز کے وقت ہوش آ جاتا تو وضو کرتے، نماز ادا کرتے اور پھر اسی عالم میں چلے جاتے یہاں تک کہ وفات پا گئے۔ وفات کے وقت سر مبارک حضرت خواجہ حمید الدین ناگوری کے زانو پر تھا اور پاؤں شیخ بدر الدین غزنوی کی آغوش میں۔ سلطان التمش نے آپ کی نماز جنازہ پڑھائی۔ آپ کا مزار جامع مسجد دہلی سے گیارہ میل دور قصبہ مہرولی (جہاں قطب مینار ہے)۔ یہ قصبہ عام طور پر قطب صاحب کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں بہت سے اولیا اللہ دفن ہیں۔

آپ فرماتے تھے کہ جو خدا سے محبت کا دعویٰ کرے اور مصیبت کے وقت چلائے وہ جھوٹا ہے۔ اگر راہ گیر ایک خاص راستے پر چلتا رہے اور دل میں یقین کامل رکھے تو وہ منزل کو پا سکتا ہے۔ بزرگوں کی مجلس میں جہاں جگہ پاؤ وہیں بیٹھ جاؤ۔ انسان کو چاہیے کہ جس چیز سے توبہ کر لے اسے ہمیشہ اپنا دشمن سمجھے۔ جب تک کوئی شخص دنیا میں مشغول رہتا ہے وہ اللہ والا نہیں بن سکتا۔ درویش وہ ہے جو دوسروں پر خرچ کرتا ہے، مگر خود فاقے کرتا ہے۔

حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ

آپ کا نام نصیر الدین محمود تھا اور آپ حضرت امام حسنؓ کی اولاد میں سے تھے۔ آپ کے والد سید مجتبےٰ کی پیدائش لاہور میں ہوئی تھی۔ پھر یہ خاندان اودھ چلا گیا۔ وہیں حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ پیدا ہوئے۔ آپ نو سال کی عمر میں یتیم ہو گئے اور آپ کے والدہ نے آپ کی پرورش فرمائی۔

بچپن میں بھی آپ کو کھیل کود سے نفرت تھی۔ ہمیشہ غور و فکر میں رہتے تھے جن دنوں میں روزہ رکھنا منع ہے ان کے علاوہ ہمیشہ روزہ رکھتے تھے شدید بیماری میں بھی با جماعت نماز ادا کرتے۔ چالیس سال کی عمر میں آپ دہلی تشریف لے گئے۔ اور حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاؒ کے مریدوں میں شامل ہو گئے۔ یہ حقیقت ہے کہ حضرت محبوب الٰہی کو امیر خسروؒ سے بے حد محبت تھی مگر وہ حضرت چراغ دہلیؒ سے بھی بہت محبت کرتے تھے۔

حضرت محبوب الٰہی کے انتقال کے بعد دہلی کے ایک بزرگ حضرت شیخ عبداللہ یافعیؒ نے کہا "دہلی کے تمام شیخ رخصت ہوئے اب صرف شیخ نصیر الدین باقی رہ گیا ہے، جو دہلی کا چراغ ہے۔" اس کے بعد آپ اسی لقب سے مشہور ہوئے۔ آپ کے مزار کے اطراف کا علاقہ بھی چراغ دہلی کہلاتا ہے۔

آپ کا معمول تھا کہ نماز عصر سے فارغ ہو کر اپنے حجرے میں ذکر الٰہی میں مشغول ہو جاتے۔ اس موقع پر خادموں کو حکم تھا کہ کوئی ملاقاتی آئے تو ایک تنکا (سکہ) دے کر رخصت کر دیا جائے۔ اگر وہ نہ مانے تو دو تنکے سے پچاس تنکے دے کر لوٹا دو۔ پھر بھی نہ مانے تو اس کو میرے

پاس بھیج دو۔

ایک روز ایک ملنگ حضرتؒ سے ملنے آیا۔ خادموں نے اس کو پیسے دینے کی بہت کوشش کی مگر وہ نہ مانا۔ آخر مجبور ہو کر انھوں نے اس کو آپ کے پاس بھیج دیا۔ ملنگ اندر پہنچا اور حضرت سے کوئی چیز مانگنے لگا۔ حضرت نے ملنگ کو اشارے سے سمجھایا کہ کچھ دیر صبر کرو۔ عبادت سے فارغ ہو کر اپنے ہاتھ سے میں وہ چیز تم کو دوں گا۔ لیکن ملنگ نہ مانا اور چھری نکال کر آپ کے جسم مبارک پر کئی وار کیے پھر حجرے سے نکل کر بھاگ گیا۔ اس کے ہاتھ سے خون آلود چھری دیکھ کر خادموں نے دوڑ کر اس کو پکڑ لیا اور کھینچتے ہوئے آپ کے پاس لائے حضرتؒ نے مریدوں سے فرمایا ''اسے چھوڑ دو پھر ملنگ کو پچاس اشرفیاں اور ایک گھوڑا دے کر فرمایا ''فوراً دہلی کی حدود سے نکل جا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے زخمی ہونے کی خبر عام ہو جائے اور میرا کوئی عقیدت مند تجھے ہلاک کر دے'' اس واقعے سے پتا چلتا ہے کہ آپ کس قدر رحم دل بزرگ تھے اور آپ کا روحانی مقام کیا تھا۔

جس زمانے میں جواہر سنگھ جاٹ نے دہلی کو لوٹا اور وہاں قتل و غارت کا بازار گرم کیا، اس وقت بستی چراغ دہلی میں ایک مال دار برہمن رہتا تھا۔ وہ اس لوٹ مار سے خوف زدہ ہو کر آپ کے مزار پر پہنچا اور بولا ''سرکار دہلی تباہ و برباد ہو رہی ہے اور تباہی کے شعلے بستی چراغ دہلی کو بھی اپنی لپیٹ میں لینے والے ہیں۔ ہم آپ کی رعایا ہیں۔ خدا کے لیے ہماری مدد کیجیے۔''

یہ کہہ کر برہمن اپنے مکان پر آیا اور دن بھر حضرتؒ سے لو لگائے بیٹھا رہا۔ رات کو وہ سویا تو خواب میں دیکھا کہ حضرت اس سے فرما رہے ہیں:

''تم اطمینان سے دروازہ بند کیے اندر بیٹھے رہو وہ تمھاری طرف آئیں گے تو اندھے ہو جائیں گے۔''

جیسے ہی برہمن کی آنکھ کھلی۔ اس نے فوراً اپنے گھر والوں کو یہ خوشخبری سنائی جو لوگ حضرت چراغ دہلی کے زیادہ عقیدت مند نہ تھے وہ دل میں مسکرانے لگے۔ خوں خوار جاٹ دہلی کو تہہ و بالا کرتے رہے۔ لوگوں کی پکار چراغ دہلی کے رہنے والوں تک پہنچتی رہی۔ ان کے چہروں پر موت کے سائے لرزنے لگے لیکن وہ برہمن اس طرح مطمئن تھا جیسے کسی محفوظ مقام پر ہو۔

آخر جاٹوں کے گھوڑوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ لیکن کچھ دیر بعد لوگوں کو ایسا محسوس ہوا کہ جاٹ واپس جا رہے ہیں۔ کئی مرتبہ یہی ہوا۔ جواہر سنگھ جاٹ کے آدمی چراغ دہلی کے علاقے پر حملے کے لیے آتے تھے اور ناکام ہو کر واپس چلے جاتے تھے۔ دور سے انھیں چراغ دہلی کا علاقہ صاف نظر آتا تھا مگر جیسے ہی وہ قریب پہنچتے یہ بستی ان کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی اور وہ بھٹک کر کسی اور طرف نکل جاتے۔

آخر مجبور ہو کر جاٹوں نے تمام واقعہ اپنے سردار جواہر سنگھ کو سنایا۔ پہلے تو اس کو بھی یقین نہ آیا مگر جب اس کے ساتھیوں نے قسمیں کھائیں تو یقین کرنا پڑا اور وہ حیرت کے سمندر میں ڈوب گیا۔ پھر وہ ان کے ساتھ چراغ دہلی کی طرف بڑھا۔ قریب پہنچنے کے بعد اس نے لوگوں سے پوچھا کیا اس علاقے میں کوئی خاص بات ہے؟ ایک بوڑھے شخص نے جواب دیا اس علاقے میں حضرت نصیر الدین محمود چراغ دہلیؒ کا مزار اقدس ہے۔ اور یہ بستی انھی کے نام پر بسائی گئی ہے۔

اس کے بعد جواہر سنگھ نے کسی سے کچھ نہ پوچھا چند قدم آگے بڑھا اور حضرت چراغ دہلیؒ کے مزار کی طرف منہ کر کے کہا حضرت میں اپنے ساتھیوں کی گستاخی پر شرمندہ ہوں اور مزار مبارک پر حاضر ہونا چاہتا ہوں۔ مجھے اجازت مرحمت فرمایئے۔

جواہر سنگھ کی زبان سے جیسے ہی یہ الفاظ ہوئے۔ چراغ دہلی کی پوری بستی اس طرح سامنے آ گئی جیسے اس کی آنکھوں پر پڑا ہوا پردہ ہٹا دیا گیا۔ تمام جاٹوں نے عقیدت سے اپنے سر جھکا دیے۔ پھر سنگدل اور لٹیرے جاٹوں کا یہ گروہ غسل کر کے پھولوں کی چادر کے ساتھ مزار اقدس پر حاضر ہوا۔

۱۸۵۷ء میں جب انگریزوں نے دہلی پر قبضہ کیا تو مسلمانوں پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ انگریز افسر مٹکاف مسلمانوں کے خون کا پیاسا تھا۔ بستی چراغ دہلی کے رہنے والوں نے ایک برہمن زادے سے درخواست کی کہ تو اس برہمن کے خاندان سے ہے جس کی دعا سے بستی پر آئی ہوئی بلا ٹل گئی تھی۔ تو مزار اقدس پر حاضر ہو کر بستی کے لوگوں کی سلامتی کی دعا کر۔'' اس نے ایسا ہی کیا اور دیکھنے والوں نے دیکھا کہ چراغ دہلی کی بستی سے ایک شخص بھی گرفتار نہ ہوا۔

حضرت چراغ دہلیؒ کا انتقال ۱۸ رمضان المبارک ۷۵۷ھ کو ہوا۔ وفات سے قبل آپ

نے وصیت فرمائی کہ سید محمد گیسو درازؒ مجھے غسل دیں اور وہی نماز جنازہ پڑھائیں۔ جو خرقہ مجھے حضرت محبوب الٰہی سے مرحمت ہوا ہے، اس میں میرا جسم لپیٹ کر دفن کر دیا جائے۔

حضرت چراغ دہلیؒ کے سوم کی فاتحہ کے بعد حضرت گیسو درازؒ پر وحشت سی طاری ہونے لگی۔ انھیں اپنے پیر و مرشد کے بغیر شہر ویرانہ معلوم ہونے لگا۔ انھیں اس بات کا بھی صدمہ تھا کہ انھیں حضرت چراغ دہلیؒ سے خرقہ عطا نہ ہوا تھا۔ جب وحشت حد سے بڑھی تو اس چارپائی کے قریب آئے جس پر پیر و مرشد کو غسل دیا گیا تھا۔ چند لمحے چارپائی کو دیکھتے رہے۔ پھر بے اختیار ہو کر آگے بڑھے اور چارپائی کے بان نکال کر اپنے گلے میں ڈال لیے اور کہا ''یہی میرا خرقہ ہے۔ یہی میرا سب کچھ ہے۔'' آپ نے کسی سے بات نہ کی اور دہلی سے نکل کر دکن کی طرف روانہ ہو گئے۔

حضرت نظام الدین اولیاؒ

حضرت خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی سے تقریباً ساڑھے سات سو سال پہلے ۶۳۶ھ میں بدایوں (یو پی بھارت) میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے والد حضرت سید احمد بخاریؒ اپنے زمانے کے ولی تھے۔ وہ ہمیشہ نوابوں اور بادشاہوں کے دربار سے دور رہے۔ اس لیے ان کی تمام عمر مفلسی میں گزری۔ ابھی حضرت نظام الدین کا بچپن ہی تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ آپ کی والدہ نے ہمت نہ ہاری اور تکلیفیں اٹھا کر محبوب الٰہی کی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ ابتدائی تعلیم آپ نے بدایوں کے مشہور عالم مولانا شاداں سے حاصل کی۔ تمام علوم سے فراغت حاصل کر کے پہلے دہلی تشریف لائے۔ پھر ایودھن (جو آج کل پاک پٹن شریف کہلاتا ہے) کی راہ لی اور وہاں پہنچ کر حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ کے خاص مریدوں میں شامل ہو گئے۔ حضرت باباؒ سلطان بلبن کے داماد تھے مگر آپ کی

غذا سوکھی ہوئی روٹیاں اور بغیر نمک ابلی ہوئی ترکاری تھی۔

حضرت نظام الدین کے ذمے حضرت باباؒ اور آپ کے مریدوں کے لیے سالن پکانے کا انتظام تھا۔ ایک دن پیرو مرشد کی محبت سے بے قرار ہو کر آپ نے پڑوسی بنیے سے نمک قرض لے کر ترکاری میں ڈال دیا۔

حضرت باباؒ پہلا نوالہ منہ میں لیتے ہوئے اچانک رک گئے اور فرمایا "آج میرا ہاتھ کچھ بھاری معلوم ہوتا ہے۔ سالن کس نے پکایا ہے؟" حضرت محبوب الٰہی نے تمام کیفیت بیان کر دی۔ حضرت باباؒ نے ناراضگی سے فرمایا نظام الدین درویش مرنا گوارا کر لیتا ہے، مگر کسی سے قرض لینا گوارہ نہیں کرتا۔ یہ کہہ کر آپ نے حکم دیا کہ آج کا کھانا فقیروں میں تقسیم کر دیا جائے۔ محبوب الٰہی کے دل پر اس واقعے کا اثر ہوا۔

کچھ عرصے بعد حضرت باباؒ نے محبوب الٰہی کو کرتوں کا ایک جوڑا دے کر دہلی جانے کا حکم دیا۔ آپ ایودھن سے دہلی تشریف لے آئے آپ کے ساتھ چالیس درویش بھی تھے جن کے پاس تن کے کپڑے کے سوا کچھ نہ تھا۔ دہلی پہنچ کر آپ نے غیاث پور میں قیام کیا۔

آپ دن رات میں پانچ نمازوں کے علاوہ پانچ سو نفل بھی پڑھتے تھے اور بے شمار مریدوں کو قرآن حکیم اور حدیث پاک کا درس دیتے۔ پھر جب ساری دنیا سو جاتی تو اللہ کے حضور میں اپنا سر جھکا کر اس قدر روتے کہ ڈاڑھی آنسوؤں سے تر ہو جاتی۔ صبح سے شام تک آپ کے دروازے پر ضرورت مندوں کی بھیڑ لگی رہتی۔ کوئی شخص آپ کے دروازے سے خالی ہاتھ نہ جاتا۔

آپ ہندوستان کے بے تاج بادشاہ تھے۔ دہلی کے تمام امیروں اور وزیروں کی ہمیشہ خواہش رہی کہ آپ کی صحبت میں رہیں، مگر آپ ان کو سخت ناپسند فرماتے۔ انتہا یہ ہے کہ علاؤ الدین خلجی جیسا بادشاہ بھی آپ کی قدم بوسی کے لیے ترستا رہا۔ آپ فرماتے کہ جس طرح زمین و آسمان آپس میں نہیں مل سکتے اسی طرح ایک فقیر اور بادشاہ میں بھی کوئی رشتہ نہیں ہو سکتا۔ جب شہنشاہ کا اصرار بہت بڑھا اور قدم بوسی کے لیے عرضی بھجوائی تو

آپ نے جواب میں لکھ بھیجا "فقیر کے گھر کے دو دروازے ہیں۔ تو ایک سے داخل ہوگا تو میں دوسرے سے نکل جاؤں گا۔ زیادہ تنگ کرے گا تو تیرا ملک چھوڑ دوں گا۔ کیوں کہ خدا کی زمین تنگ نہیں۔"

شہنشاہ نے جواب پا کر اپنا ارادہ ترک کر دیا اور درخواست کی کہ اس کی سلامتی کے لیے دعا فرمائیں۔ محبوب الٰہی نے کہلا بھیجا "تجھے یہاں آنے کی ضرورت نہیں۔ عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کر۔ میں تیرے لیے دعا کرتا رہوں گا۔"

ہندوستان کے چند بادشاہ ایسے بھی تھے جو حکومت کے نشے میں آپ کو تکلیفیں پہنچاتے تھے۔ سلطان غیاث الدین بلبن بھی انھیں میں سے ایک تھا۔ اس کو خوشامدیوں نے بتایا کہ ہندوستان عوام کے دلوں پر محبوب الٰہی کی حکومت ہے۔ وہ جب چاہیں سلطان کی حکومت کا تختہ الٹ سکتے ہیں۔ وہ آپ کی دشمنی پر اتر آیا اور حضرت کے خلاف سازشوں کا جال بچھانے لگا۔ ایک روز اچانک سلطان کا پیشاب رک گیا۔ شاہی طبیبوں نے بہت زور مارا مگر کوئی علاج نہ ہو سکا۔ یہاں تک کہ اس پر نزع کا عالم طاری ہو گیا۔

یہ دیکھ کر سلطان کی ماں حضرت نظام الدینؒ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور رو رو کر عرض کیا کہ اس کے بیٹے کے لیے دعا کریں۔ آپ نے فرمایا میں اس وقت دعا کروں گا جب وہ ہندوستان کی بادشاہت میرے نام لکھ دے اور اس معاہدے پر دربار کے امیروں کے دستخط ہوں۔" تکلیف سے مجبور ہو کر بادشاہ نے معاہدہ لکھ دیا۔ آپ نے معاہدے کا فیتہ بنا کر اس کی ماں کو دیا اور فرمایا کہ "اس فیتے کو طشت میں رکھ کر بادشاہ کو پیشاب کراؤ۔ خدا اسے تکلیف سے نجات دے گا۔" سلطان کی ماں نے ایسا ہی کیا اور سلطان کو اس اذیت ناک تکلیف سے نجات مل گئی۔ وہ معافی مانگنے آپ کے حضور آیا اور کہا کہ میں معاہدے کے تحت ہندوستان کی بادشاہت آپ کے حوالے کرنے آیا ہوں۔

جس بادشاہت کی قیمت انسانی پیشاب کے برابر ہے تو مجھے وہ غلیظ شئے دینے آیا ہے؟ جا اپنا کام کر اور خدا کی مخلوق کو ستانے سے باز آ۔"

ایسے ہی بدنصیب بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ غیاث الدین تغلق بھی تھا۔

اس عاقبت نا اندیش بادشاہ نے بنگال کی جنگ پر روانہ ہوتے ہوئے آپ کو حکم بھجوایا کہ نظام الدین میرے بنگال سے لوٹنے سے پہلے تیری بہتری اسی میں ہے کہ تو دہلی چھوڑ دے۔ ورنہ تجھے ایسی سزا دوں گا کہ ہندوستان کے لوگ قیامت تک یاد رکھیں گے۔

حضرتؒ نے بادشاہ کا خط پڑھ کر اس کی پشت پر لکھا۔ ہنوز دلی دور است (ابھی دلی دور ہے)۔

بنگال کی بغاوت کچلنے کے بعد غیاث الدین تغلق واپس لوٹا تو دہلی میں فتح کا جشن منانے کے لیے اس کے بیٹے جونا خان نے جمنا کے کنارے ایک محل تعمیر کروایا۔ جوں جوں بادشاہ دہلی کے قریب آرہا تھا، حضرت کے مریدوں کی بے چینی بڑھتی جارہی تھی مگر آپ مسکرا کر بار بار یہی کہتے رہے۔ کہ ہنوز دلی دور است۔

غیاث الدین تغلق جشن میں شرکت کرنے کے لیے محل میں داخل ہوا ہی تھا کہ اچانک پورا محل دھڑام سے گر پڑا اور بادشاہ اور اس کے ساتھی ملبے میں دب کر مر گئے۔

حضرت نظام الدین اولیاؒ نے ۷۲۵ھ میں انتقال فرمایا اور غیاث پور کی خانقاہ میں دفن کیے گئے۔ اب اس جگہ بستی نظام الدین آباد ہے۔

بے شمار لوگ آپ کے مرید تھے۔ لیکن آپ کو سب سے زیادہ محبت امیر خسروؒ سے تھی اور انھی کو آپ نے اپنا خلیفہ بنایا تھا۔

حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ

حضرت مولانا روم اسلامی فلسفے اور تصوف اور کے بہت بڑے عالم تھے۔ آپ کا نام محمد اور لقب جلال الدین تھا۔ آپ ۱۲۰۷ء میں خراسان کے ایک شہر بلخ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے دادا حضرت حسین بلخیؒ اپنے عہد کے صاحب کمال بزرگ تھے۔ بڑے بڑے بادشاہ ان کا ادب کرتے تھے۔

مولانا رومؒ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد شیخ بہاؤ الدین سے حاصل کی۔ پھر ۱۸۔۱۹ سال کی عمر میں والد کے ہمراہ ترکستان کے ایک شہر قونیہ تشریف لے گئے اور مشہور صوفی بزرگ حضرت شمس تبریزیؒ سے تصوف کا علم حاصل کیا۔ ترکستان کا علاقہ، ان دنوں روم کہلاتا تھا۔ اسی نسبت سے آپ مولانا روم کہلائے۔

والد کے انتقال کے بعد آپ نے مزید تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے ملک شام کا رخ کیا۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کے بیٹے ملک الظاہر نے حلب میں دینی مدرسے قائم کیے تھے۔ مولانا روم نے یہیں تعلیم حاصل کی اور دمشق کے مختلف بزرگوں سے فیض حاصل کیا۔ ۴۰ سال کی عمر میں آپ علم و دانش میں طاق ہو چکے تھے۔ آپ کا انداز بیان بے حد دلکش تھا۔ جو بات زبان سے نکلتی وہ سننے والے کے سینے میں اُتر جاتی۔

آپ کے بارے میں ایک واقعہ بہت مشہور ہے۔ ایک دن آپ کے چاروں طرف کتابیں بکھری ہوئی تھیں اور آپ لوگوں کو نصیحت فرما رہے تھے کہ اچانک مجلس میں ایک پریشان حال سا شخص داخل ہوا اور کتابوں کی طرف اشارہ کر کے پوچھا ''یہ کیا ہے؟''

مولانا رومؒ نے جواب دیا ''یہ وہ چیز ہے جسے تم نہیں جانتے۔''

اجنبی نے غور سے مولانا رومؒ کو دیکھا اور پھر کتابیں اٹھا کر حوض میں پھینک دیں۔ مولانا غصے سے کانپنے لگے آپ نے فرمایا ''یہ تم نے کیا غضب کیا؟ ان کتابوں کی قیمت کا تمھیں اندازہ نہیں۔ انھیں خریدنے کے لیے کسی بادشاہ کا خزانہ بھی ناکافی ہے۔''

اجنبی نے مسکراتے ہوئے پانی میں ہاتھ ڈال کر تمام کتابیں نکال لیں۔ تمام کتابیں خشک تھیں اور ان پر پانی کی ایک بوند بھی نہ تھی۔

مولانا رومؒ نے حیرت سے پوچھا ''یہ کیا ہے؟''

اجنبی یہ کہتا ہوا چلا گیا ''یہ وہ ہے جسے تم نہیں جانتے۔''

اجنبی کے جاتے ہی مولانا رومؒ کا برا حال ہوگیا۔ اور آپ اسی وقت اس اجنبی کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ دور دور تک تلاش کے بعد آخر آپ نے اسے پالیا۔ یہ اجنبی حضرت شمس تبریزیؒ تھے مولانا رومؒ حضرت تبریزیؒ کی صحبت میں کافی عرصہ رہے اور ان سے اس قدر فیض حاصل کیا کہ روحانی دنیا میں آپ کا مقام بہت بلند ہوگیا۔

آپ کبھی شب خوابی کا لباس نہ پہنتے تھے۔ بستر اور تکیہ نہ ہوتا تھا۔ نیند کی نیت سے نہ لیٹتے تھے۔ نیند غالب آتی تو بیٹھے بیٹھے سو جاتے، نماز کا وقت آتا تو قبلے کی طرف مڑ جاتے۔ عشا کی نماز کی نیت باندھتے تو صبح تک نماز ادا کرتے رہتے۔ بازار سے گزرتے تو بچے آپ کا ہاتھ چومتے مولانا بھی بچوں کو خوش کرنے کے لیے ان کے ہاتھ چومتے۔

قونیہ میں گرم پانی کا ایک چشمہ تھا۔ مولانا رومؒ غسل کے لیے کبھی کبھی وہاں جاتے تھے۔ ایک دن کچھ جذامی وہاں آکر نہانے لگے۔ آپ کے خادموں نے ان کو ہٹانا چاہا مگر آپ نے منع کر دیا اور اسی جگہ سے پانی لے کر نہانے لگے۔

ایک محفل میں شیرینی کے دو طباق رکھے تھے۔ اتفاق سے ایک کتا آیا اور ایک طباق میں منہ ڈال کر کھانے لگا۔ لوگوں نے اس کو مارنا چاہا تو آپ نے منع فرما دیا اور کہا

''اس کی بھوک تم سے زیادہ تھی۔ اس نے جو کچھ کھایا وہ اسی کا حق تھا۔''

ایک مرتبہ آپ بازار سے گزر رہے تھے کہ دو آدمی آپس میں لڑنے لگے۔ ان میں سے ایک کہنے لگا اگر تو ایک کہے گا تو دس سنے گا۔ مولانا رومؒ وہاں ٹھہر گئے اور فرمایا ''بھائی تمھیں جو کچھ کہنا ہے، مجھے کہہ لو۔ اگر ہزار کہو گے تو ایک بھی نہ سنو گے۔'' وہ دونوں سخت شرمندہ ہوئے اور آپس میں صلح کر لی۔

علم و دانش کا یہ آفتاب ۱۷ دسمبر ۱۲۷۳ء کو قونیہ میں غروب ہوگیا۔ جب جنازہ اٹھا تو ہر مذہب اور ہر فرقے کے لوگ چیخیں مار مار کر رو رہے تھے۔

آپ کا سب سے بڑا کارنامہ جو قیامت تک زندہ رہے گا، آپ کی مثنوی ہے جس میں آپ نے دل چسپ حکایتوں کے روپ میں، اخلاقی اور صوفیانہ مسائل بیان فرمائے ہیں۔ اس میں ۲۴ ہزار کے لگ بھگ شعر ہیں۔ دنیا کی تمام بڑی بڑی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔

حضرت بہاؤالدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ

حضرت بہاؤالدین زکریاؒ کے دربار میں ایک دفعہ ایک عورت اپنے قریب المرگ گوشۂ جگر کو لئے حاضر ہوئی اور حضرت شیخ سے طالبِ دعا ہوئی۔ حضرت کے دادا نے فرمایا کہ جو منظورِ خدا ہوگا وہی ہوگا۔ چنانچہ بچہ مرگیا اور وہ عورت مایوس و نامراد اپنے گھر کو جانے لگی۔ اتفاق سے گھر کے باہر حضرت رکن الدین بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ جب اس عورت کی یہ حالت دیکھی تو کھیل چھوڑ کر اس کے پاس پہنچے اور دریافت کیا کہ وہ اس طرح کیوں رو رہی ہے۔ عورت نے کہا کہ تمہارے دادا جان کے دربار میں گئی تھی کہ میرے اس مرتے ہوئے بچے کو دوبارہ زندگی حاصل ہو جائے۔ مگر افسوس کہ ناکام لوٹنا پڑا۔ حضرت نے فرمایا ''مگر دیکھو تو سہی مجھے تو بچہ زندہ لگتا ہے۔'' خدا کی شان ملاحظہ ہو کہ جب عورت نے بچے کے منہ سے کپڑا اٹھا کر دیکھا تو سچ مچ بچہ مسکرا رہا تھا۔ وہ عورت خوشی خوشی گھر چلی گئی۔ جب حضرت کے دادا نے یہ واقعہ سنا تو حضرت کو منع فرمایا کہ بیٹا اہلِ طریقت کے نزدیک ایسی دلیری پسندیدہ نہیں۔

حضرت کو خداوند پاک سے وہ بزرگی اور عظمت فطری طور پر حاصل ہوئی تھی کہ دس سال کی ہی مختصر سی عمر میں مجاہدہ و مراقبہ میں اس قدر جوش اور جفاکشی ظہور میں آئی کہ کشفِ قلوب، کشفِ قبور، طےِ لسانی، طےِ ارض کے رموز و نکات، حضرت پر بخوبی ظاہر ہو گئے۔ بارہ سال کی عمر میں قرآنِ پاک کو حفظ کر لیا۔ علمِ فقہ و تفسیر و حدیث پر اس قدر عبور حاصل ہوا کہ عام عقل و ہوش کے انسان کو میسر نہیں آ سکتا۔

حضرت کی طبیعت میں حلم، انکسار کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ خلقِ خدا کو حضرت کی ذاتِ بابرکات سے ہمیشہ فیض بے پایاں پہنچتا تھا۔ کوئی حاجت مند خدمتِ عالیہ میں حاضر ہوتا تو نامراد واپس نہ جاتا۔ اس کا مطلب حل ہو جاتا تھا۔ چنانچہ فرطِ حاجت روائی کے باعث مخلوق نے آپ کو حضرت قبلۂ حاجات مشہور کر دیا تھا۔ حضرت کی وضع اور روش حضرت شیخ ابوسعید ابوالخیرؒ کی وضع اور روش سے ملتی جلتی تھی۔ حضرت کی مجلس میں حاضرین کے دل میں جو بات ہوتی تھی۔ وہ سب حضرت پر روشن ہو جاتی تھی۔ سبحان اللہ! اس سے زیادہ اور کیا بزرگی ہوگی کہ حضرت کے مریدوں میں حضرت سید جلال بخاریؒ المعروف مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ جیسے جلیل القدر بزرگ بھی شامل ہیں۔

حضرت جب پہلی بار دہلی تشریف لائے تو عقیدت مند جوق در جوق حضرت کی خدمت میں آئے اور عوام و خواص کے علاوہ سلطان علاؤالدین جیسا متکبر شخص بھی حضرت کے استقبال کو گیا اور نہایت عزت و احترام کے ساتھ اپنے ہمراہ دہلی لایا۔ خیر مقدم کے روز دو لاکھ تنکہ زرِ نقد شکرانہ میں حضرت کی خدمت میں روانہ کئے اور پانچ لاکھ تنکہ رخصت کے وقت نذر کئے۔ حضرت ایسی رقم کو اسی وقت دست بدست جس طرح چاہتے فقراء میں تقسیم فرما دیتے۔ دوسرے دن کے لئے اس میں کچھ بھی اپنے پاس نہ رکھتے۔

حضرت کو شیخ نظام الدین اولیاءؒ سے بے حد محبت تھی۔ ۷۱۳ ہجری کا ذکر ہے کہ سلطان مبارک شاہ خلجی، حضرت محبوبِ الٰہی نظام الدین اولیاءؒ سے ناراض ہو گیا اور ان کے اثر و رسوخ کو کم کرنے کے لئے حضرت کو بلوا بھیجا۔ جب حضرت دہلی کے قریب پہنچے تو خود بادشاہ چند میل آگے چل کر حضرت کے قدم بوس ہوا۔ اس سے پہلے حضرت محبوب الٰہیؒ حضرت سے مل چکے تھے۔ بادشاہ نے پوچھا حدودِ دہلی میں داخل ہونے پر کون سا آدمی پہلے آپ کی ملاقات کو حاضر ہوا۔ حضرت نے جواب دیا جو اس وقت زمانہ میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ بادشاہ اس جواب سے بہت خوش ہوا اور حضرت محبوبِ الٰہیؒ سے اس کی ناراضگی دور ہو گئی۔ حضرت کو محبوبِ الٰہی سے اس قدر محبت تھی کہ بارہا یہ فرمایا کہ میں ملتان سے دہلی کا سفر

محض سلطان نظام الدین اولیاءؒ کی ملاقات ومحبت کے شوق کی وجہ سے اختیار کرتا ہوں۔

دہلی کی خاکِ پر انوار یوں تو ہمیشہ علم وایمان کا مرکز رہی ہے اور نہ صرف مملکتی امور کے لئے اس سرزمین کو پایۂ تخت تسلیم کیا گیا بلکہ مذہبی امور کے لئے بھی اس مرکز کو فروغ حاصل ہوتا رہا۔ یہی وہ خطہ ہے جہاں اسلام کے جری فرزندوں نے ایمان کی شمعیں روشن کیں جن کی حرارت ونور ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں دوڑ گئی۔ علمائے دین وفضلائے اسلام کے اس دیرینہ مرکز میں حضرت نے بھی قدم رنجہ فرمایا اور مشتاقانِ دین کو اپنی تبلیغ سے گرمیٔ عمل کے لئے ابھارا اور اسلام کے وہ جامع فلسفے اور نکات سمجھائے کہ جذبۂ ایمان میں اور زیادہ پختگی پیدا ہوئی۔ حضرت کا یہ وصف تو بزرگانِ دہلی بھی تسلیم فرماتے تھے پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل جہاں عقل انسانی مات اور شکست کھا جاتی تھی بکمال بے ساختگی ساتھ حل فرمادیتے تھے۔

☆☆☆

حضرت رابعہ بصریؒ

حضرت رابعہ بصریؒ ۹۵ ہجری (۷۱۳ء) کی ایک سرد اور تاریک رات کو بصرے میں اس وقت پیدا ہوئیں کہ ان کے گھر میں سردی سے بچنے کے لیے کوئی گرم کپڑا نہ تھا اور نہ جلانے کے لیے چراغ میں تیل۔ اُن کے غریب باپ کو پہلی بار اپنی مفلسی کا شدید احساس ہوا۔ وہ مسلسل سوچ رہے تھے۔ سوچتے سوچتے جب ان کی آنکھ لگ گئی تو انھوں نے خواب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''تیری بچی اندھیرے میں اس طرح آئی ہے جیسے رات کے بعد سورج نکلتا ہے۔ اس کی روشنی دُور دُور تک پھیلے گی۔''

اس کے بعد گھر میں کسی چیز کی کمی نہ رہی۔ ان کے والد جب تک زندہ رہے آرام سے گزر بسر ہوتی رہی۔ مگر جب حضرت رابعہؒ نے ہوش سنبھالا تو باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور بصرے میں دو برس تک ایسا قحط پڑا کہ مٹھی بھر اناج کے لیے جس کا جدھر منہ اٹھا۔ بھاگ کھڑا ہوا۔ اسی نفسا نفسی میں حضرت رابعہؒ بھی اپنی تینوں بہنوں کے ساتھ گھر سے نکل کھڑی ہوئیں۔ بصرے کے لوگ قافلوں کی شکل میں دمشق، بغداد، سمرقند اور بخارا کی طرف جا رہے تھے۔ ہر طرف لوٹ مچی ہوئی تھی۔ کسی کو کسی کا ہوش نہ تھا۔ اسی افراتفری میں گیارہ سالہ رابعہؒ اپنی بہنوں سے بچھڑ گئیں۔

وہ ایک چھوٹے سے قصبے کے پاس سڑک کے کنارے بیٹھی رو رہی تھیں کہ ایک شخص انھیں گھر لے گیا اور وہ بغداد میں دوسرے غلاموں کے ساتھ نیلام کر دی گئیں۔ ان کا مالک سخت سنگ دل اور جلاد تھا۔ وہ حضرت رابعہؒ سے اس قدر محنت لیتا کہ ان کی نمازیں

قضا ہو جاتیں۔ لیکن وہ صبر اور شکر سے سب کچھ برداشت کرتی رہیں۔ اسی عالم میں نوجوانی کو پہنچیں۔

ان کا مالک دن رات ان سے محنت لیتا تھا۔ ایک رات وہ کسی کام سے ان کی کوٹھری کی طرف گیا تو کیا دیکھتا ہے کہ آپؒ عبادت میں مصروف ہیں اور رو رو کر اللہ سے دعا مانگ رہی ہیں۔ ان کے اوپر نور سا چمک رہا تھا وہ یہ دیکھ کر خوف سے کانپ اٹھا اور اُلٹے قدموں واپس آ گیا۔ دوسری صبح اس نے حضرت رابعہؒ سے معافی مانگی اور انھیں آزاد کر دیا۔ وہ آبادی سے دور ایک سنسان مقام پر آ کر عبادت میں مشغول ہو گئیں۔ وہ ایک ہزار رکعت روزانہ پڑھتی تھیں۔ جب لوگوں نے ایک نوجوان لڑکی کو شب و روز عبادت میں غرق دیکھا تو ان کے گرد جمع ہونے لگے۔ ان کی عبادت کا چرچا دور دور تک پہنچا۔ بڑے بڑے بزرگ ان سے ملنے اور ان کی نصیحتیں سننے کے لیے آنے لگے اور وہ پاکیزگی میں مریم ثانی کہلانے لگیں۔

آخر طویل عبادت کے بعد آپ خانہ کعبہ کی زیارت کو روانہ ہوئیں اور گدھے پر سوار ہو کر ایک قافلہ کے ساتھ چل پڑیں۔ گدھا دو چار منزلوں کے بعد ہی مر گیا۔ رابعہ بصریؒ اپنا سامان کاندھے پر لاد کر سفر جاری رکھنا چاہتی تھیں۔ قافلے کے لوگ ان کے مرتبے سے واقف تھے اور ان کا سامان اٹھانے کی سعادت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ مگر حضرت رابعہؒ نے جواب دیا۔ ''میں نے یہ سفر تمھارے سہارے نہیں کیا۔ جس کے گھر جا رہی ہوں، اس کی مرضی یہی ہے۔'' قافلے والے انھیں چھوڑ کر چلے گئے۔

جب قافلہ کافی دور نکل گیا تو حضرت رابعہؒ نے جلال کے عالم میں اپنا سامان ریت کے ایک ٹیلے پر پھینک دیا اور آسمان کی طرف سر اٹھا کر کہا۔ ''اے اللہ میں نے جو کچھ قافلے والوں سے کہا وہ جھوٹ تھا۔ میرا شوق اپنی جگہ مگر میزبانی کے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں۔ کیا ایک کمزور اور عاجز عورت کے ساتھ یہی سلوک کیا جاتا ہے۔ تو نے مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دی، پھر راستے میں میرا گدھا مار ڈالا، اور اب تو نے مجھے بیابان میں تنہا چھوڑ دیا۔''

ابھی یہ شکوہ ختم نہ ہوا تھا کہ گدھے کے بے جان لاشے میں حرکت ہوئی اور وہ ایسی بے تابی سے اٹھا جیسے اسے کسی نے سوتے میں جھنجھوڑ کر کھڑا کر دیا ہو۔ حضرت رابعہؒ مسکرانے لگیں۔ آپؒ نے گدھے پر سامان رکھا اور اکیلی مکے کی سمت روانہ ہو گئیں۔

حضرت ابراہیم بن ادھمؒ اس زمانے کے ایک بہت بڑے بزرگ تھے۔ انھوں نے بادشاہت کو ٹھکرا کر عبادت الٰہی کو اپنایا اور درویشی اختیار کر لی تھی، وہ چودہ سال سے ہر قدم پر نماز شکرانہ ادا کرتے ہوئے کعبے کی طرف آ رہے تھے۔ جب وہ حرم میں داخل ہوئے اور آخری رکعت کے بعد کعبے پر نظر ڈالی تو کعبہ اپنی جگہ پر موجود نہ تھا۔ وہ سمجھے کہ چودہ سال کی عبادت میں شاید ان کی بینائی زائل ہو گئی ہے۔ وہ زار و قطار رونے لگے۔ اسی لمحے غیب سے ندا آئی۔ ''اے ابراہیم تیری بینائی زائل نہیں ہوئی بلکہ کعبہ ایک خاتون کا استقبال کرنے گیا ہوا ہے۔'' وہ خاتون تھیں حضرت رابعہ بصریؒ۔

ایک دن دو درویش رابعہ بصریؒ کے گھر پہنچے، وہ بھوکے تھے۔ انھوں نے کھانا طلب کیا۔ اس وقت گھر میں صرف دو روٹیاں تھیں۔ حضرت رابعہؒ نے انھیں عزت سے بٹھایا اور روٹیاں پیش کرنے والی ہی تھیں کہ دروازے پر کسی بھکاری نے آواز لگائی وہ بھی روٹی ہی کا سوال کر رہا تھا۔ حضرت رابعہؒ نے دونوں روٹیاں درویشوں کے بجائے اس فقیر کو دے دیں اور مہمانوں کے پاس جا کر بیٹھ گئیں۔

درویشوں نے کہا۔ ''ہم کئی دن سے بھوکے ہیں۔ اتنی طاقت نہیں کہ زیادہ دیر انتظار کریں۔''

رابعہؒ نے فرمایا۔ ''خدا کا وعدہ پورا ہونے میں دیر نہیں لگتی تھوڑی دیر انتظار کرو۔''

یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ ایک کنیز خوان لے کر حاضر ہوئی۔ اس میں مزے دار سالن اور روٹیاں رکھی ہوئی تھیں۔ حضرت رابعہؒ نے روٹیاں گنیں۔ کل اٹھارہ تھیں۔ آپ نے فرمایا، تمھیں غلطی ہوئی ہے یہ خوان ہمارا نہیں ہوسکتا۔ کنیز نے بار بار کہا کہ میری مالکن نے آپ ہی کے لیے بھجوایا ہے۔ درویشوں نے بھی بہتیرا کہا کہ خدا نے جو کچھ دیا ہے اسے

قبول کر لینا چاہیے، لیکن آپ راضی نہ ہوئیں اور خوان واپس کر دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد کنیز دوبارہ خوان لے کر آئی۔ حضرت رابعہؒ نے روٹیاں گنیں تو وہ پوری بیس تھیں۔ آپؒ نے خوان درویشوں کے سامنے رکھ دیا اور انھوں نے خوب سیر ہو کر کھایا۔

کھانے کے بعد درویشوں نے حضرت رابعہؒ سے خوان واپس کرنے کی وجہ پوچھی تو آپؒ نے فرمایا۔ ''درویشو، جب تم آئے تھے تو گھر میں صرف دو روٹیاں تھیں۔ میں نے دونوں خیرات کر دیں اور یہ بات ذہن میں رکھی کہ خدا نے ایک کے عوض دس دینے کا وعدہ کیا ہے۔ مگر جب پہلی بار خوان آیا تھا تو اس میں اٹھارہ روٹیاں تھیں اس لیے میں نے لوٹا دیا۔ جب بیس روٹیوں کا خوان آیا تو اسے رکھ لیا کیونکہ خدا نے اپنا وعدہ حرف بحرف پورا کر دیا تھا۔''

ایک دفعہ حضرت رابعہؒ کو عبادت کے دوران تھکن کی وجہ سے نیند آ گئی۔ ایک چور نے انھیں غافل دیکھا تو چادر اٹھا کر فرار ہونے لگا۔ لیکن اچانک اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ ایک بغیر دروازے کے کمرے میں بند ہو چکا ہے۔ جب اس نے چادر واپس رکھ دی تو دروازہ نظر آ گیا لیکن پھر اس کی نیت میں فتور آیا۔ چادر اٹھائی تو دروازہ غائب ہو گیا۔ اس طرح کئی مرتبہ ہوا آخری بار کمرے میں سے آواز آئی:

''اے شخص، کیا تجھے معلوم نہیں کہ چادر والی نے خود کو ہماری حفاظت میں دے رکھا ہے؟۔ ایک دوست سو رہا ہے تو کیا ہوا، دوسرا تو جاگ رہا ہے۔'' چور نے فوراً توبہ کی اور اسی وقت بھاگ کھڑا ہوا۔

ایک دفعہ ایک نوجوان حضرت رابعہؒ سے شادی کی درخواست کرنے آیا مگر جب ان کے پاس پہنچا تو اس کی زبان بند ہو گئی اور جب تک سچے دل سے توبہ نہ کی بات کرنے کے قابل نہ ہوا۔ اس کے بعد وہ بصرے کے بازاروں میں سالہا سال تک گرمی جاڑے اور برسات سے بے پروا ہو کر توبہ! کے نعرے لگاتا رہا۔

اسی زمانے میں ایک اللہ والے بزرگ حسن بصریؒ بھی گزرے ہیں۔ ایک دفعہ ان کی دریائے فرات کے ساحل پر حضرت رابعہؒ سے ملاقات ہوئی۔ اسی دوران میں

اذان کی آواز گونجی حضرت حسنؒ بصری نے فوراً دریا کی سطح پر مصلیٰ بچھاتے ہوئے کہا:

''رابعہؒ، نماز کا وقت ہے۔ آؤ نماز ادا کر لیں۔''

رابعہؒ بصری نے مسکرا کر کہا۔ ''اگر پانی پر جائے نماز مخلوق کو دکھانے کے لیے بچھائی ہے تو اچھا تماشا ہے، کیونکہ دوسرے لوگ ایسا کرنے سے قاصر ہیں۔''

یہ کہہ کر آپؒ نے اپنی جائے نماز ہوا پر بچھا دی اور حسن بصری سے کہا۔ ''آؤ حسن، ہم دونوں یہاں نماز ادا کریں تاکہ لوگوں کی نظروں سے محفوظ رہیں۔ نماز عبادت ہے۔ اسے شعبدہ کیوں بنائیں۔'' حسنؒ بصری سخت شرمندہ ہوئے اور حضرت رابعہؒ سے معافی مانگی۔

حضرت رابعہؒ کے پاس بڑے بڑے بزرگ آتے اور دینی گفتگو کرتے تھے۔ ایسی ہی ایک محفل میں حضرت رابعہ بصریؒ اور ان کے کئی معتقد بھی موجود تھے۔ رات کی تاریکی بڑھتی جا رہی تھی۔ گھر میں جلانے کو چراغ نہ تھا۔ رابعہؒ نے اپنا ہاتھ بلند کیا تو ان کی انگلیاں اس قدر روشن ہو گئیں کہ تمام کمرہ نور سے بھر گیا۔ آپؒ صبح تک ہاتھ بلند کیے رہیں اور اس کی روشنی میں تمام رات دینی باتیں ہوتی رہیں۔

آپؒ نے تمام عمر شادی نہ کی۔ آپ کی تعلیم بہت سیدھی سادی تھی۔ آپؒ سب کچھ اللہ سے اپنی محنت اور عبادت کے ذریعے حاصل کرتی رہیں۔ ان کے مختصر گھر میں ایک بانس پر ان کا کفن ہمیشہ لٹکا رہتا تھا۔ نیچے اینٹوں کا ایک چبوترا تھا۔ آپؒ اس پر نماز پڑھتیں اور تھک جاتیں تو وہیں تھوڑا سا اونگھ لیتیں۔ آخری دنوں میں آپؒ نے کھانا پینا بالکل چھوڑ دیا تھا۔

۱۸۵ ہجری (۸۰۱ء) میں موت سے دو دن قبل آپؒ بے حد خوش نظر آنے لگیں۔ لوگ سمجھے کہ آپؒ کی حالت بہتر ہو رہی ہے۔ آپؒ نے اپنی خادمہ کو بتایا کہ اللہ نے میری بات مان لی ہے۔ اب دوری ختم ہونے والی ہے۔ موت کے بعد مجھے عام آدمیوں کی طرح خاموشی سے زمین میں اتار دینا اور میری قبر کو دنیا کی نظروں سے بچانا۔ جو چادر اس وقت میرے جسم پر لپٹی ہوئی ہے اسی میں مجھے ڈھانپ دینا۔''

اس کے دو دن بعد چند بزرگ آپؒ کے کمرے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ آپ گفتگو کرتے کرتے اچانک خاموش ہوگئیں۔ پھر آپؒ نے آہستہ سے کہا۔ ''یہاں جگہ کم ہے، آپ لوگ فرشتوں کے لیے جگہ چھوڑ دیں۔'' سب لوگ باہر آگئے اور کمرے کا دروازہ خود بخود بند ہوگیا۔ کچھ دیر بعد لوگوں نے اندر جا کر دیکھا تو حضرت رابعہؒ اپنے حقیقی مالک سے جا ملی تھیں۔

اصحاب السبت

سنیچر والے

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مچھلیوں کو بھی ضد ہے۔ سنیچر کا دن ہوا اور ان کے غول کے غول پانی کے اوپر تیرنے لگے۔ کوئی چاہے تو بغیر جال کے یوں ہی ہاتھ سے پکڑ لے۔ اور یوں دیکھو تو ہفتے بھر غائب۔ کوئی دیکھے تو سمجھے کہ شاید سمندر کے اس حصے میں مچھلیاں رہتی ہی نہیں ہیں۔ عجب بات تھی!

مگر عجب بات تو وہ ہوتی ہے جو خواہ مخواہ ہوتی ہو۔ یہ بات اللہ تعالیٰ کے حکم اور ارادے سے ہوتی تھی۔ بات یہ تھی کہ سمندر کے کنارے ایک ایسی قوم آباد تھی جس نے کسی زمانے میں خود فرمائش کر کے ہفتے کا ایک دن صرف عبادت کرنے کے لیے مخصوص کرا لیا تھا۔ یہ دن سنیچر کا دن تھا۔ اس دن ان کے لیے اللہ تعالیٰ کا حکم تھا کہ وہ پورے دن عبادت میں مشغول رہیں۔ دنیا کا کوئی کام نہ کریں۔ مچھلیاں پکڑنا ان لوگوں کا پیشہ تھا لیکن سنیچر کے دن ان کو مچھلیاں پکڑنے کی بھی ممانعت تھی۔

جب تک یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے فرماں بردار رہے، یہ سنیچر کا دن سچ مچ عبادت ہی میں گزارا کرتے تھے۔ دنیا کا کوئی کام نہ کرتے حد یہ کہ شکار کو بھی نہ جاتے۔ لیکن رفتہ رفتہ ان کی زندگی میں بگاڑ شروع ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کی طرف سے بے پروائی برتنے لگے۔ حلال اور حرام میں تمیز کرنا چھوڑ دیا۔ دل کی خواہشات کے غلام ہو گئے۔ ان کی طبیعتوں میں لالچ، خود غرضی اور مال کی محبت سما گئی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ اب ان میں سنیچر کے دن کی عزت کا خیال باقی نہیں رہا۔ اب انھیں اس دن عبادت کرنا بھی بار ہوتا تھا۔ بڑے بوڑھوں کے پاس اور لحاظ سے یا یوں ہی رسم و رواج کی شرم سے کچھ وقت عبادت کر لی تو کر لی نہیں تو نہ سہی۔

اللہ تعالیٰ کسی کی عبادت کا بھوکا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرماں برداری کرنے سے اس کو کچھ فائدہ نہیں پہنچتا۔ وہ تو اس سے بے نیاز ہے کہ کسی کی عبادت یا نماز سے اس کو کوئی نفع پہنچ جائے یا اس کی شان بڑھ جائے۔ ہماری عبادت، ہماری نماز اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی فرماں برداری خود ہمیں فائدہ پہنچاتی ہے۔ اس سے ہمیں اس دنیا میں بھلے آدمیوں کی طرح رہنا آجاتا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اپنی زندگی میں ہم جو راستہ اختیار کرتے ہیں، ہمیں اسی پر چلنا آسان ہوجاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قانون یہی ہے۔

اگر ہم نیک کام کرنا اختیار کریں گے تو ہمارے لیے بھلائی کے راستے کھلتے چلے جائیں گے۔ ایک نیکی کے بعد دوسری نیکی کرنا آسان ہوتا چلا جائے گا۔ یہاں تک کہ پھر ہماری پوری زندگی نیکی کی زندگی ہوجائے گی۔ یہی حال برائی کا ہے۔ برائی اختیار کرنے سے طبیعت کا لگاؤ برائی سے ہی بڑھتا چلا جاتا ہے۔ انسان ایک برائی کے بعد دوسری برائی کو یہ سوچ کر کر لیتے ہیں کہ چلو ایک برائی میں کیا حرج ہے اس کے بعد نیک بن جائیں گے، ان کے لیے برائی کی طرف دوسرا قدم اٹھانا خواہ مخواہ آسان ہوجاتا ہے اور بھلائی اختیار کرنے کے لیے وہ اکثر ارادہ ہی کرتے رہ جاتے ہیں۔ ان کی زندگی میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید برائیاں خود بخود چلی آرہی ہیں اور انھیں چاروں طرف سے گھیرے لے رہی ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے بھلائی کی راہ روز بروز مشکل ہی ہوتی چلی جاتی ہے۔

کچھ ایسا ہی حال سنیچر والوں کا بھی تھا۔ جب انھوں نے اپنی پوری زندگی میں اللہ تعالیٰ کے احکام سے بے پروائی برتنا شروع کردی تو ان کے لیے نیکی پر قائم رہنا دشوار ہوگیا اور ان کے سامنے قدم قدم پر ایسے موقعے آنے لگے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں اور بھی زیادہ پھنس جائیں۔ یہی وجہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے مچھلیاں اس دن اُبھرا اُبھرا کر آتی تھیں جس دن ان کا پکڑنا گناہ تھا۔ اب جن لوگوں کے دل اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتے کرتے سخت اور نڈر ہوگئے تھے، وہ اس گناہ کے لیے بھی تیار ہوگئے اور انھوں نے سنیچر کے دن شکار کی ممانعت کے باوجود مچھلیاں پکڑنا شروع کردیں۔ اسی طرح انھوں نے

اپنے گناہوں کی فہرست میں اضافہ کرلیا۔ اور اللہ تعالیٰ کے عذاب کے پورے پورے مستحق ہوگئے۔

یوں تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاید پوری کی پوری بستی اللہ تعالیٰ کی باغی اور نافرمان ہوگئی ہے۔ بھلے لوگ دکھائی ہی نہ دیتے تھے۔ جدھر دیکھو برائیاں ہی برائیاں تھیں۔ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور ظلم وفساد سے کسی کی زندگی پاک نہ تھی۔ لیکن اس بستی میں کچھ بھلے لوگ بھی باقی تھے۔ ان کی زندگیاں ان گندگیوں سے پاک تھیں جن میں ساری بستی والے پھنسے ہوئے تھے۔

بھلے لوگوں میں دو قسم کے لوگ تھے۔ ایک تو وہ تھے جو بستی والوں کی اصلاح سے بالکل ناامید ہوچکے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اب یہ لوگ کوئی اچھی بات سن کر ہی نہ دیں گے۔ ان کی اصلاح ناممکن ہے۔ اسی لیے انہوں نے ان برے لوگوں کو منہ لگانا ہی چھوڑ دیا تھا۔ یہ خود اللہ تعالیٰ کے فرماں بردار تھے۔ حلال اور حرام کا لحاظ رکھتے تھے۔ سنیچر کے دن کا بھی پورا پورا احترام کرتے تھے اور اس دن عبادت میں مشغول رہتے تھے۔ کچھ لوگ ایسے تھے جو خود تو نیک تھے ہی اور برابر اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کا خیال بھی رکھتے تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ برداشت نہیں کرسکتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے بندے غفلت اور نافرمانی میں پھنسے رہیں گے۔ وہ لوگوں کی برائیاں دیکھ دیکھ کر کڑھتے تھے۔ اور ان کے برے انجام کا خیال کرکے انھیں بڑا دکھ ہوتا تھا۔ یہ لوگ اس موقع پر صرف خود نیک بن جانے پر مطمئن نہ تھے اور نہ اپنی نجات کے لیے ہر وقت اللہ تعالیٰ کی عبادت کو کافی سمجھتے تھے۔ بلکہ یہ لوگ بستی والوں کو برابر نصیحت کرتے رہتے تھے۔ انہیں بتاتے رہتے تھے کہ ان کی زندگی میں کیا کیا برائیاں گھس آئی ہیں، ان کے برے کاموں پر انہیں ٹوکتے تھے اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈراتے تھے۔

بستی کے لوگوں کو اپنے برے کام کچھ ایسے پسند تھے کہ وہ اپنی مرضی کے خلاف کوئی بات سننا ہی پسند نہ کرتے تھے، بلکہ بھلی بات بتانے والے کے اُلٹے دشمن ہوجاتے تھے۔

اس حالت کو دیکھ کر ان نیک لوگوں نے جو بس خود ہی نیک بن جانا کافی سمجھتے تھے، ان نصیحت کرنے والوں سے کہا کہ ”بھئی ایسے لوگوں کو نصیحت کرنے سے کیا فائدہ جو کسی بات کو سننے کے لیے تیار ہی نہیں اور جن کی برائیاں اتنی بڑھ چکی ہیں کہ اب عنقریب اللہ تعالیٰ یا تو انہیں بالکل ہی ہلاک کر دے گا یا ان پر کوئی سخت عذاب نازل فرمائے گا۔“

بات بڑی سیدھی سادی تھی۔ ہر شخص کی سمجھ میں آ سکتا ہے کہ جو مریض دوا پینے کے لیے تیار ہی نہ ہو بلکہ علاج کرنے والے کو اُلٹا بُرا بھلا کہے اور جس کا مرض اتنا بڑھ چکا ہو کہ اس کی موت یقینی ہو، اسے دوا پلانے کی کوشش کرنا بے کار نہیں تو کیا ہے۔

لیکن جو نیک لوگ نصیحت کر رہے تھے انہوں نے عجیب جواب دیا بولے:

”ہم کو تو تمہارے رب کے حضور اپنا عذر پیش کرنے کی فکر ہے، اس نے اگر کل قیامت کے دن یہ سوال کیا کہ تم برائیاں پھیلتے دیکھ کر خاموش کس طرح بیٹھے رہے، تو ہم کم از کم یہ جواب دے سکیں کہ ہم نے تو اپنا فرض ادا کر دیا تھا۔ اور پھر یہ بھی کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ شاید ہماری نصیحت کچھ کام ہی کر جائے اور ان کے دل میں اللہ تعالیٰ کا ڈر پیدا ہو جائے۔“

اُن لوگوں کی بات کتنی سچی تھی۔ اس کا ذمہ دار کوئی بھی نہیں ہے۔ کہ وہ برائیوں کو روک ہی دے۔ حد یہ کہ انبیاء علیہم السلام پر بھی لوگوں کو سیدھے راستے پر لگا دینے کی ذمہ داری نہیں تھی۔ وہاں ہر شخص اس کا جواب دہ ضرور ہے کہ جہاں تک اس کا بس چلتا تھا اس نے برائیوں کو روکنے کی کوشش کی یا نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے سب سے آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: ”جو شخص دنیا میں کوئی برائی دیکھے تو اس کو چاہیے کہ اسے ہاتھ سے روک دے اور جو اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو وہ زبان سے روکے اور اس کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو تو وہ دل سے اسے برا جانے۔ اور یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔“

اور پھر دلوں کا حال جاننے والا اور آئندہ ہونے والے واقعات سے باخبر تو اللہ تعالیٰ ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ آج جو لوگ حق کے دشمن ہیں کل وہی اسے قبول کر کے

اللہ تعالیٰ کے فرماں بردار نہیں بن جائیں گے۔ وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے سیدھے راستے پر چلنے کی توفیق بخشی ہے۔ اور جس کی عقل نے حق قبول کر لیا ہے، اسے اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا عملی شکریہ ادا کرنا چاہیے اور وہ یہ ہے کہ سیدھے راستے سے بھٹکے ہوئے انسانوں کو صحیح راستے پر چلانے کی کوشش کی جائے اور تمام انسانوں کو ان دکھوں سے بچایا جائے جو زندگی کی غلط راہ اختیار کرنے کے بعد انھیں جھیلنا ہی پڑتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی مکمل تابعداری خود کرنا اور کرانا دراصل یہی زندگی کا سب سے اونچا مقصد ہے۔

جب انہوں نے نصیحت کرنے والوں کی بھلی باتوں پر کوئی دھیان ہی نہ دیا، ان کی ساری باتوں کو بھلا دیا جو انہیں نصیحت کرنے کے لیے کہی گئی تھیں اور اپنی زندگی کی روش بدلنے کے لیے تیار ہی نہ ہوئے تو انھیں اللہ کے عذاب نے آ لیا۔ اس وقت اس بستی میں سے صرف وہ لوگ بچا لیے گئے جو دوسروں کو اچھے راستے کی طرف بلایا کرتے تھے۔ اور جن کا طریقہ یہ تھا کہ چاہے کوئی قبول کرے یا نہ کرے، وہ لوگوں تک بھلی باتیں برابر پہنچاتے رہتے تھے۔ رہ گئے وہ لوگ جو خود تو نیک تھے لیکن دوسروں کو بھلائی کی طرف بلانے کو بے کار سمجھتے تھے۔ وہ بھی اللہ کے عذاب سے نہ بچ سکے۔

اللہ تعالیٰ کا مستقل قانون ہے کہ وہ گنہگاروں اور نافرمانوں کو اس حد تک مہلت دیتا ہے جب تک کہ ان کی اصلاح کا کچھ بھی امکان ہوتا ہے۔ سب سے پہلے کچھ معمولی عذاب آتے ہیں اور اس بات کا پورا پورا موقع دیا جاتا ہے کہ سرکش لوگ اگر اب بھی آنکھیں کھول لیں تو انہیں بچا لیا جائے۔ کبھی کبھی یہ خبردار کر دینے والے عذاب بار بار آتے ہیں لیکن جب ان عذابوں کو بھی ”زمانے کے اُلٹ پھیر“ اور ”اتفاقات“ ہی سمجھ لیا جاتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی مہلت کے قانون کی مدت ختم ہو جاتی ہے اور برے کاموں کے نہ ٹلنے والے نتیجے سامنے آ جاتے ہیں جنہیں ہر حال میں بھگتنا ہی پڑتا ہے۔

یہی حال سنیچر والوں کا ہوا، ان کی آنکھیں نہ تو نصیحت سے کھلیں اور نہ عذاب ہی انھیں چوکنا کر سکا۔ چنانچہ ان کی تباہی اور بربادی کا آخری فیصلہ ہو گیا۔ ان کی صورتیں مسخ ہو گئیں۔ ان کے چہرے بندروں جیسے ہو گئے اور تین دن کے اندر اندر یہ سب کے

سب انتہائی ذلت اور خواری کی حالت میں مر گئے۔

شاید حیرت ہوگی کہ آدمی بندر کس طرح بن گئے ہوں گے۔ ہاں ہے تو بڑی انوکھی بات لیکن ناممکن نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت بہت بڑی ہے۔ اس کے لیے کوئی کام ناممکن نہیں۔ اس کے ارادے کی دیر ہوتی ہے جو چاہتا ہے آن کی آن میں وہی ہو جاتا ہے۔

ایک بہت بڑے طبیب گزرے ہیں زکریا رازی۔۔ انہوں نے مرض کوڑھ کی تحقیقات کے سلسلے میں لکھا ہے، کہ کوڑھ کی ایک سب سے زیادہ خراب قسم وہ ہوتی ہے جس میں مرض کے اثر سے جسم میں کچھ ایسا زہریلا خون پھیل جاتا ہے کہ اس سے تمام جسم کے رگ پٹھوں میں اینٹھن شروع ہو جاتی ہے اور مریض کا چہرہ اور جسم بہت ہی گھناؤنے بندر کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس درجے پر پہنچنے کے بعد مرض لا علاج ہو جاتا ہے اور مریض چند دن میں ہی مر جاتا ہے۔ سچ ہے اللہ تعالیٰ کے عذاب کی سیکڑوں صورتیں ہیں کتنے ہی مرض آج ایسے ہیں جن کا پرانے زمانے میں کوئی نشان نہیں پایا جاتا تھا۔ اور معلوم نہیں اس وقت کتنے دوسرے مرض ایسے رہے ہوں گے جنہیں آج ہم جانتے بھی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے عذاب کی شکلیں بدلتی رہتی ہیں۔ لیکن اس کے عذاب کا قانون ایک ہی ہے۔ اس کی نافرمانی اور اس سے بغاوت کی سزا ضرور ملتی ہے چاہے وہ کتنے ہی دنوں میں ملے اور کیسی ہی شکل میں ملے۔

یہ واقعہ اللہ تعالیٰ نے ہماری نصیحت، کے لیے قرآن شریف میں بیان فرمایا ہے۔
آؤ ذرا سوچیں، اس سے ہمیں کیا سبق ملتا ہے۔

۱۔ جب تم بُری باتیں اختیار کرو گے تو تم اور زیادہ برائیوں میں پھنسنے پر مجبور ہو جاؤ گے۔ برے کام برے ہی راستے کی طرف لے جاتے ہیں۔

۲۔ اگر تم پر اللہ تعالیٰ کا یہ فضل ہے کہ تم نیکی اور بھلائی کے راستے کو جانتے ہو تو تمہارا کام صرف یہی نہیں ہے کہ تم خود ہی اس راستے پر چلتے رہو۔ تمہیں چاہیے کہ تم دوسرے بھٹکے ہوئے انسانوں کو سیدھی راہ دکھاؤ۔ جو لوگ ایسا نہیں کرتے انہیں اپنے رب کے حضور اس کوتاہی کا جواب دینا پڑے گا۔

۳۔ لوگوں کو نیک راستے کی طرف اس لالچ سے مت بلاؤ کہ وہ تمہاری بات سن ہی لیں گے۔ یہ کوشش ضرور کرو کہ تمہاری بات لوگوں کی سمجھ میں آ جائے اور وہ اسے قبول کر لیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو تمہیں رنجیدہ ہونے یا مایوس ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ کام صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے اور اپنا فرض ادا کرنے کے لیے کرنا چاہیے۔ چاہے اس کام کی ابتدا ہو اور تم لوگوں کو سمجھا بجھا کر نیکی کی طرف بلا رہے ہو، یا یہ کام اپنی آخری منزلوں میں ہو اور تم مجبوراً قوت اور طاقت کی مدد سے بدی، ظلم اور فساد کو دنیا سے دور کر رہے ہو۔

۴۔ دنیا میں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نجات پانے کے لیے اور آخرت میں اس کی پکڑ اور سزا سے بچنے کے لیے صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ خود اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری کا راستہ اختیار کیا جائے اور دوسروں کو اس راستے کی طرف بلایا جاتا رہے۔ یہاں تک کہ یہ زندگی اور اس کی مہلتیں ختم ہو جائیں۔

اصحاب الکہف

غار والے

تھے تو وہ چار پانچ ہی لیکن جب ان کی سمجھ میں آ گیا کہ ان کا پیدا کرنے اور پالنے والا صرف ایک اللہ ہے، وہی ان کا مالک ہے اور وہ اس بات کا حقدار ہے کہ تنہا اس کی ہی بندگی کی جائے تو انہوں نے صاف کہہ دیا کہ ہمارا آقا اور مالک تو بس وہی ہے جس نے زمین اور آسمان کو پیدا کیا ہے اور ہم ہرگز ایسی بے وقوفی نہیں کریں گے کہ اسے چھوڑ کر کسی اور کے سامنے سر جھکا دیں۔ پہلے تو انہوں نے اپنی قوم کے لوگوں کو بہت سمجھایا کہ بھئی دیکھو تمہارے پاس کوئی ایسی دلیل تو ہے نہیں کہ جس سے تم اللہ تعالیٰ کے علاوہ دوسروں کی غلامی کرنے کا کوئی ثبوت دے سکو اور یہ تو بڑا ظلم ہے کہ تم جھوٹ بات کہو، اور وہ بھی اپنے پیدا کرنے والے اور پالنے والے کے خلاف!۔۔۔لیکن ان کی بات کسی نے نہ مانی اور اُلٹا یہ کہہ دیا کہ اللہ تعالیٰ کی بندگی سے انکار کرو نہیں تو پتھر مار کر تمہیں ہلاک کر ڈالیں گے۔

جب بات یہاں تک بگڑ گئی اور یہ یقین ہو گیا کہ ان میں سے کوئی بھی اللہ تعالیٰ کی اطاعت قبول نہیں کرے گا تو اللہ تعالیٰ کے ان نیک بندوں نے جنگل کی راہ لی اور ایک غار میں اس لیے داخل ہو گئے کہ وہاں اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کرتے کرتے اپنی باقی زندگی گزار دیں۔

یہ لوگ غار میں جا کر سو رہے۔ ان کے ساتھ ان کا وفادار کتا بھی تھا۔ وہ بھی غار کے منہ کے پاس پاؤں پھیلا کر لیٹ رہا۔۔۔ اللہ تعالیٰ کا کرنا دیکھو، یہ لوگ سوتے رہے، سوتے رہے، نہ کھانا نہ پینا۔ بس کبھی کبھی سوتے میں ادھر سے اُدھر کروٹ لے لیتے۔ غار ان کا ایسا تھا کہ اس میں دھوپ نہیں آتی تھی۔ یہ لوگ آرام سے سوتے رہے۔ اللہ تعالیٰ کی

قدرت ہے وہ جسے چاہے اور جس طرح چاہے زندہ رکھے۔ زندگی اور موت اسی کے ہاتھ ہے۔

ادھر یہ ہوا کہ ان کے پیچھے شہر کا رنگ ہی بدل گیا۔ وہی لوگ جو اللہ تعالیٰ کی عبادت سے اور اس کی غلامی اور اطاعت سے بھاگتے تھے۔ اور جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے چار پانچ نیک بندوں کا اپنے شہر میں رہنا برداشت نہیں کیا تھا، اُن کی اولادوں نے اللہ تعالیٰ کے دین کو قبول کیا اور اب اس شہر میں اللہ تعالیٰ کے نافرمانوں اور باغیوں کی جگہ اس کے تابعدار اور نیک بندے بسنے لگے۔

بہت دنوں بعد اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان کی آنکھ کھلی اور یہ سب کے سب اُٹھ بیٹھے ایک بولا۔

''بھلا ہم کتنی دیر سوئے ہوں گے؟''

دوسرے نے جواب دیا۔ ''بس یہی کوئی دن بھر یا کچھ کم۔''

پھر ایک بولا۔ ''اچھا چھوڑو اس بات کو اللہ ہی جانے ہم کتنی دیر سوتے رہے۔ اب بھوک لگ رہی ہے ذرا جلدی سے ایک آدمی روپیہ لے کر بازار چلا جائے اور دیکھ کر کچھ صاف ستھرا کھانا لے آئے۔ مگر اس کا خیال رہے کہ کہیں کوئی پہچان نہ لے، نہیں تو پھر وہی مصیبت ہو گی۔''

اس مشورے کے بعد ایک آدمی گیا۔ اس نے کھانا تو خرید لیا مگر اب جو روپیہ دیا تو دوکان دار نے ہاتھ پکڑ لیا کہ سینکڑوں برس کا پرانا سکہ تمہارے پاس آیا کہاں سے؟ ضرور تمہیں کہیں خزانہ ملا ہے۔ میرے ساتھ ذرا کوتوالی چلو۔''

عجیب مصیبت آئی۔ وہ ہزار کہتا کہ ''بھائی! کل ہی تو میں یہاں سے گیا ہوں یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ لیکن بھلا اس کی کون سنتا۔ آخر بے چارے کو بادشاہ کے سامنے جانا پڑا۔ وہاں دیکھا تو ایک اور ہی جھگڑا درپیش تھا۔ کچھ لوگوں کی سمجھ میں یہ بات آ ہی نہیں رہی تھی کہ آخر اللہ تعالیٰ ہزاروں برس بعد مردوں کو کیسے زندہ کر دے گا؟ اور اتنے دنوں کے بعد وہ کیسے دوبارہ اٹھ کھڑے ہوں گے؟'' کہ اتنے میں یہ بے چارہ غار والا شخص

پیش کیا گیا۔ بادشاہ نے اس کی کہانی سنی۔ اس کے ساتھ جا کر اس کے دوسرے ساتھیوں کو بھی دیکھا۔ اور جب لوگوں نے اپنی آنکھوں سے قدرت کا یہ تماشا دیکھ لیا کہ یہ غار والے سینکڑوں برس سوتے رہے۔ نہ مرے، نہ گلے نہ سڑے، تب ان کی سمجھ میں آیا کہ واقعی اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ بات کچھ مشکل نہیں ہے کہ جب چاہے انسان کو دوبارہ زندہ کر دے۔

ان لوگوں کے سامنے غار والوں کا واقعہ ایسا عجیب تھا کہ انہوں نے اس سے بڑا سبق حاصل کیا، اور غار والوں کی یادگار کے طور پر غار کے پاس ایک مسجد بنادی تا کہ لوگ یہاں اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں اور اس کی قدرت کو یاد کریں۔

کہ یہ غار والے کون تھے؟ یہ کتنے دنوں تک سوتے رہے؟ ان کا غار کہاں تھا؟۔ اور خدا جانے کتنے سوال دل میں آئیں گے اور آنا بھی چاہئیں واقعہ بھی تو بہت ہی عجیب ہے۔۔ لیکن! یہ باتیں جاننا اتنا ضروری نہیں ہے جتنا یہ سمجھنا ضروری ہے کہ اس واقعے میں ہمارے لیے کیا سبق ہے؟۔ اور مسلمان کی زندگی کا صحیح طریقہ کیا ہونا چاہیے؟۔

اگر حالات بگڑ جائیں، ہر طرف خدا کے قانون پر چلنا دوبھر ہو گیا ہو تو مسلمان کے لیے۔ ایسے مسلمان کے لیے جس نے سوچ سمجھ کر خدا کے دین کو اختیار کیا ہو، اور جو صرف نام اور قوم کا مسلمان نہ ہو۔۔ سب سے پہلے اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بندوں کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی طرف بلائے، انہیں اللہ کی ہدایت سے خبردار کرے۔ اس کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کا راستہ دکھائے۔ اور یہ کام اس وقت تک کرتا رہے جب تک اس کے دم میں دم رہے اور جب تک اس کام کو بند کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کے باغی قوت اور طاقت سے کام نہ لینے لگیں۔ اب اگر وہ اس طاقت کے مقابلے میں طاقت نہ رکھتا ہو۔ اس کے ساتھی گنے چنے، نہتے اور کمزور ہوں تو ایسی حالت میں اس کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ اللہ کے ان باغیوں کو چھوڑ کر کہیں چلا جائے جہاں وہ اللہ تعالیٰ کے احکام پر چلتے ہوئے زندگی گزار سکے جو اللہ تعالیٰ کی غلامی قبول کر لے، اس سے کسی دوسرے کی اطاعت اور فرماں برداری ہو ہی نہیں سکتی۔

اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ کوئی قوم جو اس سے بغاوت کرتی ہے، ہمیشہ باقی نہیں رہ سکتی۔ یا تو اس کو ہلاک کر دیا جاتا ہے پھر اس کو ہدایت ہی نصیب ہو جاتی ہے۔

اصحاب القریہ

گاؤں والے

اب تک تو وہ دو ہی تھے۔ لیکن اب تیسرے ساتھی کو آ جانے سے ان کی بات کا وزن اور بھی بڑھ گیا تھا۔ انھوں نے گاؤں والوں کو کیسا کیسا سمجھایا کہ دیکھو جب اس ساری کائنات کا پیدا کرنے والا ایک اللہ تعالیٰ ہی ہے تو پھر یہ کہاں تک درست ہے کہ تم اطاعت اور تابعداری دوسروں کی کرو۔ تمہارے لیے اچھا یہی ہے کہ تم اس سچے مالک کے سوا کسی دوسرے کو اپنا مالک اور آقا تسلیم نہ کرو۔ اپنی پوری زندگی کے لیے وہی طریقہ پسند کر لو جو اللہ تعالیٰ کی ہدایات کی روشنی میں ہم تمہیں بتاتے ہیں۔

لیکن گاؤں والوں نے ایک بات بھی نہ سنی۔ انہوں نے کہا کہ۔ ''تم بھی آدمی، ہم بھی آدمی۔ آخر ہم کس طرح مان لیں کہ تم کو اللہ تعالیٰ نے بھیجا ہے؟۔ ہم تو جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی بھی ہدایت تمہارے پاس نہیں ہے یوں ہی جھوٹ موٹ کچھ باتیں گڑھ لی ہیں۔'' ان تینوں نے کہا کہ ''ہمارا اور تمہارا مالک اس بات کو اچھی طرح جانتا ہے کہ ہم سچ مچ اسی کے بھیجے ہوئے ہیں۔ ہمارا کام تو بس اتنا ہی ہے کہ یہ سیدھی اور سچی بات پوری صفائی کے ساتھ تم تک پہنچا دیں۔ تم جانتے ہو کہ یہ سارا عالم تمہارا پیدا کیا ہوا نہیں ہے۔ تمہارا دل بھی اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اس عجیب وغریب عالم کو بنانے والا کوئی بڑا زبردست حکمت والا ہونا ہی چاہیئے۔ پھر تم ہی فیصلہ کرو کہ اس کے سوا دوسروں کی غلامی قبول کرنا، دوسروں کے آگے سر جھکانا اور دوسروں کے احکام پر چلنا کہاں تک ٹھیک ہے؟۔

ان صاف اور سلجھی ہوئی باتوں کو سننے کے بعد گاؤں والوں کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔۔۔ اور ہو بھی کیا سکتا تھا۔۔۔ لیکن برا ہو ہٹ دھرمی کا جس کی وجہ سے انسان

کی آنکھیں سیدھی راہ دیکھنے کے لیے بند ہو جاتی ہیں۔ کان سچی بات سننے کے لیے بہرے ہو جاتے ہیں۔ دل حق کو قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ گاؤں والوں نے کہا ۔۔۔ ''ہم تو تم کو نحوست کا سبب سمجھتے ہیں۔ تم نے آ کر خواہ مخواہ ایک نئی بات شروع کر دی ہے۔ دیکھو اگر تم اپنی ان باتوں سے باز نہ آئے تو ہم تم کو پتھر مار مار کر ہلاک کر دیں گے اور ہمارے ہاتھوں تمہیں بڑی مصیبتیں اٹھانا پڑیں گی۔''

وہ بولے۔ ''تمہاری نحوست تو تمہارے اپنے ہاتھوں لائی ہوئی ہے۔ انسان کی سب سے بڑی بدنصیبی اور اس کے لیے سب سے بڑی نحوست یہی ہے کہ وہ اپنے پیدا کرنے والے، پالنے والے، اور رزق دینے والے کو چھوڑ کر دوسروں کی غلامی اور بندگی اختیار کرے۔ اس کے بتائے ہوئے طریقے کو چھوڑ کر اپنی زندگی کے لیے قوانین خود بنانے لگے۔۔ اصل بات تو یہ ہے کہ تم لوگ اپنی حد سے گزرے جا رہے ہو تمہیں معلوم نہیں کہ تمہارے پیدا کرنے والے نے جو اختیارات بخشے ہیں ان کو تمہیں کس حد تک کام میں لانا چاہیے۔''

گاؤں کے ایک کنارے پر ایک نیک آدمی رہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اللہ تعالیٰ کے رسول جو بات کہہ رہے ہیں وہی حق ہے۔ وہ یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ گاؤں والے کیسی ہٹ دھرمی کر رہے ہیں۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ گاؤں والوں کی خیر اسی میں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق اپنی زندگی کا رخ پلٹ لیں۔ لیکن جب اس نے سنا کہ گاؤں والے کسی طرح اللہ تعالیٰ کے رسولوں کی بات مانتے ہی نہیں تو اس نے یہ سمجھ لیا کہ اب خاموش بیٹھنے کا وقت نہیں ہے۔ اب تو سچی بات کہنا ہی پڑے گی، چاہے گاؤں والوں کو اچھی لگے یا بری وہ دوڑا ہوا ان کے پاس آیا اور کہنے لگا۔

بھائیو! تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق اپنی زندگی کا رخ پلٹ لو، اور اللہ تعالیٰ کے یہ رسول جو کچھ کہتے ہیں اسے مان لو۔ بات سچی وہی ہے جو یہ کہہ رہے ہیں۔ ذرا تم یہ تو دیکھو کہ آخر اللہ تعالیٰ کے یہ بندے تم سے کچھ مانگتے بھی تو نہیں، تم خوب اچھی طرح جانتے ہو کہ انھیں تم سے کوئی لالچ نہیں ہے۔ یہ دولت اور

حکومت کے بھوکے نہیں ہیں پھر ان کی اپنی زندگیاں دیکھو، ان کی ہر ہر بات سے پتہ چلتا ہے کہ واقعی سچے راستے پر یہی ہیں۔ ایسے لوگوں کی بات نہ مانو گے تو اپنا ہی نقصان کرو گے۔۔ رہ گیا میں تو بھلا میں اس کی تابعداری کیوں نہ کروں، جس نے مجھے پیدا کیا ہے، یہ زندگی ہمیشہ رہنے والی تو نہیں، ایک دن بہر حال مرنا ہے۔ مرنے کے بعد اس مالک کے سامنے جانا ہے اور اس کو اپنی زندگی کا حساب دینا ہے۔ کیا میں اس مالک کو چھوڑ کر کسی اور کو اپنا مالک بنا بیٹھوں؟ ۔ یا اپنی خود مختاری کا اعلان کر دوں؟ ۔ یہ مجھ سے نہ ہو گا۔۔۔ کون نہیں جانتا کہ اگر وہ اللہ تعالیٰ ارادہ کر لے کہ مجھے کوئی نقصان پہنچ جائے تو ان جھوٹے آقاؤں اور معبود میں ایک بھی ایسا نہیں جو اس کی بھیجی ہوئی تکلیف اور مصیبت کو ٹال سکے۔ ان میں سے تو کوئی اس قابل بھی نہیں کہ اللہ کے حضور سفارش کر کے ہی میرا کام بنوا دے، یا تو وہ میری نافرمانیوں پر مجھے سزا دے تو مجھے اس کی پکڑ سے چھڑا لیں۔ ان باتوں کے ہوتے ہوئے بھی اگر میں اس کی آقائی کو تسلیم نہ کروں، اس کے آگے سر نہ جھکاؤں تو بھلا مجھ سے زیادہ گمراہ اور کون ہو گا؟۔ سن رکھو میں تو اسی پر ایمان لے آیا جو تمہارا سب کا حاکم، مالک اور آقا ہے۔

اس نیک آدمی کا یہ کہنا تھا کہ لوگ اس پر ٹوٹ پڑے۔ اور اس کو وہیں قتل کر دیا۔ سچ ہے جب انسان اپنی بات کی پچ کرنے لگتا ہے اور کھلے دل سے حق اور ناحق کے پہچاننے کی کوشش نہیں کرتا تو اسے ہر سچی بات کڑوی لگتی ہے۔ نصیحت قبول کرنا اس کے لیے بہت مشکل ہو جاتا ہے اور وہ بھلائی اور نیکی کا خود ہی دشمن ہو جاتا ہے۔

اس نیک آدمی کا قتل ہونا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور جیسے ہی اس نے دوسری دنیا میں آنکھیں کھولیں اپنے آپ کو نعمتوں بھری جنت میں پایا۔ اس وقت بھی اس کو اپنی قوم کے لوگ یاد تھے اور وہ نہایت حسرت کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ کاش میری قوم کو یہ معلوم ہو جاتا کہ میرے رب نے میری کوتاہیوں کو کس طرح معاف فرما دیا اور سچی بات کا اعلان کرنے کی وجہ سے مجھے کیسے بلند مرتبے عطا فرمائے۔

ادھر اس قوم کا حال سنو۔ ان لوگوں کو نافرمانی اور ہٹ دھرمی کی سزا دینے کے

لیے اللہ تعالیٰ نے آسمان سے کوئی فوج نہیں بھیجی۔۔۔ نہ اللہ تعالیٰ کو کسی ایسی فوج کے بھیجنے کی ضرورت ہی تھی۔ اس کے سزا دینے کے طریقے بہت سے ہیں۔ اس کا عذاب کسی ایک خاص شکل میں نہیں آتا۔ اس کی پکڑ بہت سخت ہے۔ چنانچہ بستی والوں نے ایک دل ہلا دینے والی بہت سخت آواز سنی۔۔۔ ایسی سخت آواز جس کی تاب ان میں سے کوئی بھی نہ لا سکا اور سب مر کر رہ گئے۔

افسوس ہے ایسے لوگوں کے حال پر جو اپنی مشکلات دور کرنے کے لیے دوسروں کا سہارا تکتے ہیں۔ زندگی کے اس قانون کے بجائے جو اس جہان کے مالک نے ہر زمانے میں اپنے سچے رسولوں کے ذریعے انسان کی رہنمائی کے لیے بھیجا ہے۔۔۔ کچھ دوسرے قاعدے اور قانون تلاش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہدایات کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قانون زندگی کو پرانا اور ناکارہ بتاتے ہیں۔ انہیں چاہیے کہ وہ آنکھیں کھولیں اور اپنے سے پہلے گزری ہوئی قوموں کی تاریخ پڑھیں انہیں معلوم ہو جائے گا کہ ان سے پہلے سچی کامیابی ان ہی قوموں کو ملی ہے جنھوں نے اپنی زندگی کا قانون خدا پرستی کی بنیاد پر بنایا۔ جنھوں نے اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہدایت کو اپنے راستے کا چراغ جانا اور جنھوں نے اپنی خواہش یا دوسروں کی خواہشات کی تابعداری سے بالکل انکار کر دیا۔

سچی بات یہی ہے کہ جو لوگ پہلے گزر رے یا اب موجود ہیں اور جو آئندہ اس زمین پر زندگی بسر کریں گے، ان سب کو اپنے اسی مالک کے سامنے حاضر ہونا ہے جو ان کا پیدا کرنے والا، پالنے والا اور مالک ہے اور اپنی پوری زندگی کے کاموں کا پورا پورا حساب دینا ہے۔

اب ہر شخص کو اختیار ہے، چاہے وہ سچی کامیابی، ابدی آرام اور اپنے مالک کی رضامندی کا راستہ اختیار کرے یا اپنے نفس اور اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کی خواہشات کی غلامی میں اپنا وقت گزار دے۔

ان گاؤں والوں کا حال آپ نے پڑھ لیا۔ یہ ساری باتیں پڑھ کر آپ کے دل

میں بہت سے سوال آ رہے ہوں گے۔ یہ گاؤں والے کون تھے؟ ان کا گاؤں کہاں تھا؟ یہ رسول کون تھے؟ نیک آدمی کون تھا؟ یہ کس زمانے کا قصہ ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن دراصل اس واقعے کے بارے میں یہ باتیں اتنی اہم نہیں ہیں جتنی اہم وہ نصیحت ہے جو ہمیں اس سے حاصل کرنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں اوپر لکھے ہوئے سوالوں میں سے ہمیں کسی کا بھی جواب نہیں ملے گا۔۔۔ اس واقعے میں جو باتیں یاد کر لینے کے قابل ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ جب کسی بستی والے اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہدایت کو جانتے بوجھتے ٹھکرا دیتے ہیں۔ اور باوجود سمجھانے کے اسے قبول نہیں کرتے تو ایسے لوگوں کا ہٹ جانا یقینی ہوتا ہے۔ ان کے تباہ کرنے کو کبھی کوئی آتش فشاں پہاڑ پھٹ پڑتا ہے اور ان پر آسمان سے آگ اور پتھروں کی بارش ہو جاتی ہے۔ کبھی زلزلہ آ جاتا ہے اور ان کی ساری بستی اُلٹ کر رہ جاتی ہے۔ کبھی طوفان اُمنڈ آتا ہے اور سب کو ڈبو دیتا ہے۔ کبھی بجلی کی سخت کڑک اور چمک ان کے لیے موت کا پیام ثابت ہوتی ہے۔ غرض کہ اللہ تعالیٰ جس طرح چاہتا ہے ان کو تباہ کر دیتا ہے۔۔۔ رہ گیا آخرت کا ہمیشہ رہنے والا عذاب تو وہ اس کے بعد بھگتنا پڑتا ہے۔

۲۔ اگر کسی کی سمجھ میں یہ بات آ جائے کہ حق کیا ہے اور ناحق کیا، تو پھر اس کے لیے خاموش بیٹھنا مناسب نہیں۔ چاہے اس میں جان کی بازی ہی کیوں نہ لگانا پڑے۔

۳۔ مومن یہ نہیں دیکھتا کہ حق قبول کرنے کے بعد اس کی دنیا بنے گی یا بگڑے گی اس کے سامنے اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور آخرت کی کامیابی ہوتی ہے۔ اس قوت پر وہ کبھی کبھی لاکھوں کے مقابلے میں تنہا حق کا جھنڈا بلند کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

اصحاب الجنّہ

باغ والے

کہتے ہیں کسی زمانے میں ایک بہت مال دار اور نیک شخص تھا۔ اس کا ایک باغ تھا۔ بہت بڑا باغ خوب پھل دینے والا۔ باغ میں جب پھلوں کی فصل تیار ہوتی تو یہ نیک آدمی اس میں سے غریبوں کو بھی دیتا۔ اس کی بستی کے غریب لوگ فصل پکنے کی آس لگائے رہتے۔ جب پھل تیار ہو جاتے تو سب باغ میں جاتے۔ نیک آدمی سب کو تھوڑا تھوڑا پھل دیتا۔ سب خوش ہوتے، اسے دعائیں دیتے۔

نیک آدمی کا یہ کام اللہ تعالیٰ کو بہت پسند تھا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے باغ میں خوب پھل لگتے اور باغ والا ہر سال مالا مال ہو جاتا۔ سچ ہے اللہ تعالیٰ کی خوشی کے لیے مال خرچ کرنے سے گھٹتا نہیں ہے، بلکہ اس میں اور زیادہ برکت ہوتی ہے۔

باغ والے کے کئی لڑکے تھے۔ جب باغ والے کا انتقال ہوا تو یہی لڑکے اس کے وارث ہوئے۔ یہ لڑکے اتنے نیک نہیں تھے، جتنا ان کا باپ تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد جب باغ میں پھل آئے تو ان لڑکوں نے آپس میں کہا:

''ابا جان تو کچھ زیادہ سمجھدار آدمی نہیں تھے۔ انھیں اس بات کا ذرا خیال نہیں تھا کہ مال کس محنت سے حاصل ہوتا ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ باغ میں سال بھر محنت تو ہم کریں، اور جب فصل تیار ہو تو بہت سے ننگے بھوکے آ کر حصہ بٹانے کے لیے جمع ہو جائیں۔ اس طرح مال لٹانا تو ٹھیک نہیں، اس کا مطلب تو یہ ہے کہ آج تو ہمارے پاس دولت ہے، لیکن کل ہم بھی دوسروں کی طرح غریب ہو جائیں گے اپنا سب مال دوسروں کو بانٹ کر بیٹھ جائیں گے۔''

ان میں سے ایک بولا۔ ''مگر بھئی اس کا کیا علاج کرو گے؟ تم جانتے ہو کہ بستی

کے غریب غربا تو آس لگائے بیٹھے ہیں جس دن ہم پھل توڑنے جائیں گے سب کے سب آ کر موجود ہو جائیں گے۔ کس کس کو منع کرو گے؟''

یہ بات بڑی اہم تھی بہت سے خیر خیرات کرنے والے اپنی بدنامی کے ڈر سے بھی غریبوں کو کچھ دے دیا کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے دلوں میں خدا کو خوش کرنے کا خیال تو نہیں ہوتا، لیکن ان میں اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ وہ مانگنے والوں کو دھتکار دیں۔ کچھ ایسا ہی حال ان لڑکوں کا بھی تھا، ان کے دلوں میں خدا کا ڈر اور اس کے خوش کرنے کا خیال تو تھا نہیں لیکن وہ اپنی بدنامی سے ضرور ڈرتے تھے اس لیے انھیں اس کی فکر ہوئی کہ جب پھل توڑتے وقت غریب مسکین لوگ جمع ہو جائیں گے۔ دنیا کی بدنامی کے ڈر سے انھیں کچھ نہ کچھ دینا ہی پڑے گا۔''

کچھ دیر سوچنے کے بعد ان میں سے ایک نے تدبیر بتائی وہ بولا:

''ہم پچھلی رات میں آ کر سارے پھل توڑ لیں گے۔ صبح ہوتے ہوتے باغ بالکل صاف کر دیں گے۔ اس وقت نہ کوئی فقیر آئے گا نہ مسکین، سارے پھل ہم چپکے سے گھر لے آئیں گے۔''

یہ بات سب کو پسند آئی۔ سب خوش ہو گئے۔ سب نے وعدہ کیا کہ کل ہی سویرے یہ کام کر ڈالیں گے۔ یہ سب بھائی خدا کو اتنا بھولے ہوئے تھے کہ انھوں نے اس موقع پر انشاءاللہ بھی نہیں کہا۔

''انشاء اللہ'' کا کیا مطلب ہے؟ ''انشاء اللہ'' کا مطلب ہے ''اگر خدا نے چاہا۔'' مسلمان کو چاہیے کہ جب وہ یہ کہے کہ میں یہ کام کل کروں گا۔ تو اسے ''انشاء اللہ'' ضرور کہنا چاہیے۔ کیونکہ آدمی کوئی کام اس وقت تک نہیں کر سکتا جب تک اللہ تعالیٰ نہ چاہے، مسلمان کا یہی عقیدہ ہے۔ اسے یہ بات ہر وقت یاد رکھنا چاہیے۔ جب بھی کوئی کام کرنے کا فیصلہ یا ارادہ کرو تو ضرور ''انشاء اللہ'' کہو۔ جو لوگ خدا کو بھول جاتے ہیں وہی یہ سمجھتے ہیں کہ سب کچھ ہم کرتے ہیں اور کر سکتے ہیں۔ یہ ان کی بہت بڑی بھول ہے۔ مسلمان کو ایسی غلطی نہ کرنا چاہیے۔

باغ والے اس وقت خدا کو بھولے ہوئے تھے۔ انھیں اپنی سوچی ہوئی اسکیم پر بڑا بھروسہ تھا۔ اسی لیے وہ یہ کہنا بھی بھول گئے کہ۔۔۔ ''اگر خدا نے چاہا۔''

رات کو یہ سب بھائی بھائی اپنے گھر پڑے سو ہی رہے تھے کہ باغ میں آگ لگ گئی۔ آگ کیا تھی خدا کا عذاب تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارا باغ جل گیا۔ نہ پھل رہے نہ درخت۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے سارے درختوں کو جڑ سے کاٹ کر پھینک دیا ہے۔ سارا باغ اجڑ گیا۔

جب پچھلی رات ہوئی تو ایک بھائی نے دوسرے بھائیوں کو جگایا۔ اور کہا!

''اگر پھل توڑنا ہیں تو جلدی چلو۔'' سب بھائی اٹھ کر چل دیئے۔ راستے میں چپکے چپکے باتیں کرتے جاتے تھے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پھل توڑتے وقت فقیر آ کر گھیر لیں اور ان کو بھی کچھ دینا پڑے۔

یہ جب اپنے باغ کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ ایک اجڑا ہوا میدان پڑا ہے۔ بولے:

''یہ ہمارا باغ نہیں ہے۔ ضرور ہم راستہ بھول گئے۔ کہیں اور نکل آئے۔''

لیکن جب غور کیا اور ادھر اُدھر دیکھا تو سمجھ میں آیا کہ نہیں راستہ نہیں بھولے ہیں۔

اب تو سب چلا اٹھے۔ ''ہائے ہم لٹ گئے۔ یہ کیا ہو گیا؟''

ان بھائیوں میں ایک کچھ نیک تھا۔ وہ پہلے بھی ان کے مشوروں کو پسند نہیں کر رہا تھا، لیکن یہ دیکھ کر اس کی بات نہ چلے گی، چپ تھا اب اس موقع پر وہ بولا:

''دیکھو نا! میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا شکر ادا کرو۔ فقیروں اور مسکینوں کو دینے سے جی نہ چراؤ۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے سے مال گھٹتا نہیں ہے۔ دینے والا تو اللہ تعالیٰ ہے وہ جس کو جتنا چاہتا ہے دیتا ہے لیکن تم نے میری ایک نہ سنی۔ آخر دیکھ لیا نا۔ کہ سب ختم ہو گیا اور تم خالی ہاتھ رہ گئے۔''

اب سب کی آنکھیں کھلیں۔ ہر ایک دوسرے پر الزام رکھنے لگا۔ آخر میں

بولے:

''اللہ پاک ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم نے خود اپنے اوپر ظلم کیا، اپنے ہاتھوں اپنے پیر میں کلہاڑی ماری۔''

سب کی سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ یہ ہماری بری نیت کا پھل ہے۔ ہم نے غریبوں کا حق کاٹنا چاہا اور یہ نہ سوچا کہ اصل مالک تو اللہ تعالیٰ ہے، اسی نے دیا ہے وہی جب چاہے چھین بھی سکتا ہے۔ اس کے نام پر خرچ کرنا ہمیں اچھا نہ معلوم ہوا اور ہم کو اس کا یہ پھل ملا۔

سب بھائیوں نے توبہ کی۔ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی۔ بولے:

''اے مالک! ہم سے غلطی ہو گئی۔ اب ہم تیری طرف جھکتے ہیں، ہمیں امید ہے کہ تو ہمیں معاف فرما دے گا اور اس باغ سے اچھا بدلہ ہم کو دے گا۔''

یہ ایک چھوٹا سا قصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ قصہ قرآن پاک میں بیان فرمایا ہے۔ قرآن پاک میں جتنے واقعے بیان ہوئے ہیں ان سب میں ہمارے لیے نصیحت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بندوں کی نصیحت ہی کے لیے پچھلے واقعات کا ذکر فرمایا ہے۔

باغ والوں کا یہ واقعہ ہے تو چھوٹا سا مگر اس میں ہمارے لیے بہت بڑی نصیحتیں موجود ہیں۔

ا۔ اللہ تعالیٰ نے سب انسانوں کو ایک سا نہیں پیدا کیا ہے۔ کوئی طاقتور ہے تو کوئی کمزور۔ کوئی عقل اور سمجھ میں بہت زیادہ ہے تو کوئی کم سمجھ ہے۔ کوئی ایک کام اچھا کر سکتا ہے تو کوئی دوسرا۔ غرض یہ کہ ہر انسان میں کام کرنے کی قابلیت الگ الگ ہے۔ اسی لیے کوئی زیادہ دولت کماتا ہے اور کوئی کم۔ پھر کوئی تو ایسا ہے کہ اپنے بعد اپنی اولاد کے لیے روپیہ، زمین، جائیداد اور باغ چھوڑ جاتا ہے۔ اور کوئی کچھ نہیں چھوڑتا، اس کی اولاد کو خود محنت کرنا ہوتی ہے۔ اس طرح کوئی بہت زیادہ مالدار ہو جاتا ہے اور کوئی غریب۔ اس مالداری اور غریبی میں بندوں کا امتحان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کھاتے پیتے لوگوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنے غریب بھائیوں کی مدد کریں۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو اللہ

تعالیٰ ان سے خوش ہوگا اور انھیں جنت میں اپنی نعمتیں دے گا۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی دولت کو فضول کاموں میں اڑاتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو پسند نہیں کرتا۔ ایسے لوگوں کو آخرت میں سزا دی جائے گی۔ اس طرح اللہ تعالیٰ لوگوں کو مال دے کر ان کا امتحان لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ دیکھنا چاہتا ہے کہ ان لوگوں کے دلوں میں اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کے لیے کوئی محبت ہے یا نہیں۔ یہ لوگ آخرت پر پکا ایمان رکھتے ہیں یا نہیں انھیں جنت میں اللہ تعالیٰ کی نعمتیں پانے کا شوق ہے یا نہیں۔ اگر انسان میں یہ باتیں ہوں گی تو وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی دولت کو نہ تو جوڑ جوڑ کر رکھے گا اور نہ فضول کاموں میں اڑائے گا۔ وہ دوسرے لوگوں کا حق پہچانے گا اور ان کی مدد کرے گا۔

دوسری طرف غریبی کی حالت میں بھی لوگوں کا امتحان ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ میرے غریب بندے غریبی کی حالت میں کسی کے آگے ہاتھ تو نہیں پھیلاتے تنگی اور مصیبت میں گھبرا تو نہیں اٹھتے مال کی خاطر اپنی عزت، آبرو اور ایمان کو خطرے میں تو نہیں ڈالتے، جو لوگ مصیبتوں میں صبر کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کا سہارا نہیں تکتے، اللہ تعالیٰ ان سے خوش ہوتا ہے ان کے لیے جنت میں بڑی بڑی نعمتیں ہیں۔ جس بندے کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت اور جنت کا شوق ہوگا، وہی ہر مصیبت کو آسانی سے جھیل لے گا اسے تو یقین ہے کہ دنیا کی زندگی تھوڑے ہی دنوں کی ہے۔ اصل زندگی تو آخرت کی ہے۔ ایسا آدمی نہ کسی کے مال کو تکتا ہے، نہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلاتا ہے، نہ کسی سے شکایت کرتا ہے اور نہ کسی کا مال چھینتا ہے، وہ جانتا ہے کہ اصل دینے والا تو اللہ تعالیٰ ہے۔ اسی لیے وہ برابر محنت کرتا رہتا ہے اور امید رکھتا ہے کہ جو کچھ ملے گا اللہ تعالیٰ کے فضل سے ملے گا۔

اسلام ایسے ہی آدمی چاہتا ہے، اگر وہ مال دار ہوں تو اپنا مال ٹھیک خرچ کریں اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر غریبوں کی مدد کریں اور اگر غریب ہوں تو خوب محنت کریں اور اللہ تعالیٰ کے فضل پر بھروسہ رکھیں۔

۲۔ انسان کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کی قدر کرے یعنی یہ

کہ ان کو ٹھیک اسی طرح کام میں لائے جس طرح اللہ تعالیٰ کی مرضی ہو۔ فضول خرچی کرنا یا دولت کو جوڑ جوڑ کر رکھنا اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر نہیں کرتے، اللہ تعالیٰ ان سے ناخوش ہوتا ہے۔ کبھی تو یہ دولت دنیا میں ہی چھن جاتی ہے اور آخرت میں تو یہ ان کے لیے عذاب ہی عذاب ہوگی۔

اصحاب الاخدود

کھائی والے

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے سچے نبی تھے۔ انھوں نے لوگوں کو اسلام کی باتیں بتائیں۔ اللہ تعالیٰ کے بندوں کو اللہ تعالیٰ کی بندگی کرنے کا طریقہ سکھایا۔ ان کے حکموں کو ماننے والے سچے مسلمان تھے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اللہ کے سچے نبی تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کوئی ساڑھے چھ سو برس بعد دنیا میں تشریف لائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تشریف لانے سے کئی سو برس پہلے کی بات ہے کسی ملک میں سچے مسلمانوں کی ایک جماعت تھی۔ یہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا سچا نبی مانتے تھے۔ ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے خود بھی نیکی کا کام کرتے اور دوسروں کو بھی بھلائی کے راستے کی طرف بلاتے۔ یہ صرف اللہ تعالیٰ کو ماننے والے تھے۔ اسی کو اپنا آقا، مالک اور معبود جانتے تھے۔ اسی کی عبادت کرتے تھے۔ اسی کے حکموں پر چلتے تھے اور دوسروں کو بھی اسی سچے مالک کی تابعداری کرنے کو کہتے تھے۔

جس طرح بھلے لوگ خود بھلا بننے کے ساتھ دوسروں کو بھی نیک بنانے کی کوشش کرتے ہیں، اسی طرح برے لوگ بھی دوسروں کو برائی کے راستے پر چلانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں اور جب کوئی اللہ کا بندہ خود نیکی کے راستے پر چلتا اور دوسروں کو چلاتا ہے تو برے لوگ اس کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ بھلے اور برے لوگوں کی یہ دشمنی ہمیشہ سے چلی آئی ہے۔

یہی حال ان لوگوں کا بھی ہوا۔ جب انہوں نے اپنے بھائیوں سے کہا کہ دیکھو

خدا کے سوا دوسروں کی عبادت نہ کرو، اس کے سوا کسی دوسرے کو اپنا مالک اور آقا نہ بناؤ۔ اس کے حکموں کو چھوڑ کر دوسروں کو اپنا حاکم نہ سمجھو تو ان کی یہ باتیں سن کر لوگ بگڑ بیٹھے اور ان نیک لوگوں کو ستانے لگے، برے لوگ کہتے تھے کہ ان باتوں کو چھوڑ دو۔ باپ دادا سے جو کچھ ہوتا آیا ہے وہ ٹھیک ہے۔

سچے مسلمانوں نے ان برے لوگوں کا کہنا نہیں مانا اور مان بھی کیسے سکتے تھے انہوں نے جس اللہ کو اپنا رب مانا تھا کیا وہ اس کے حکموں سے منہ موڑ لیتے؟۔ ان کو تو یقین تھا کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا، جب وہ اپنے مالک کے سامنے حاضر کیے جائیں گے، اگر آج وہ برے لوگوں سے ڈر کر نیکی اور بھلائی کا راستہ چھوڑ دیں تو کل اس مالک کو کیا منہ دکھائیں گے ان کو تو یہ یقین تھا کہ اگر ہمارا اللہ ہم سے خوش ہو گیا تو ہم کو مرنے کے بعد جنت ملے گی۔ ایسی جنت جہاں آرام ہی آرام ہوگا۔ پھل میوے اور ہر طرح کی اچھی اچھی چیزیں ہوں گی۔ وہ بھلا کوئی ایسا کام کیسے کر لیتے جس سے ان کا اللہ ناخوش ہو جاتا۔

اب ایک طرف تو یہ سچے مسلمان تھے جو چاہتے تھے کہ ہم اللہ کے بتائے ہوئے حکموں پر چلیں اور دوسرے بھی اسی راستے کو اختیار کر لیں۔ دوسری طرف وہ برے لوگ تھے جو چاہتے تھے کہ ہم اپنے دل کے کہنے پر چلتے رہیں، کوئی روکنے والا نہ ہو۔ ان لوگوں کو ان سچے مسلمانوں کی باتیں کڑوی لگتی تھیں۔

مسلمانوں کی باتیں بالکل صاف اور سمجھ میں آنے والی تھیں۔ جن لوگوں کے دلوں میں کچھ نیکی ہوتی وہ ان کی بات مان لیتے۔ برے لوگ ان مسلمانوں کی باتوں کے مقابلے میں کوئی زیادہ اچھی بات پیش نہیں کر سکتے تھے، اس لیے وہ اور بھی چڑتے تھے۔

جب برے لوگوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی باتوں کا اثر بڑھتا جاتا ہے تو انہوں نے بادشاہ سے شکایت کی۔ بادشاہ بھی مسلمانوں کا دشمن تھا۔ وہ کہتا تھا کہ حکم چلے تو میرا چلے، اللہ تعالیٰ کے حکموں کی اسے ذرا پروا نہ تھی۔

بادشاہ نے سوچا، اگر لوگ اسی طرح مسلمان ہوتے گئے تو پھر وہ اللہ تعالیٰ کے حکموں کے مقابلے میں میرا حکم کیسے مانیں گے؟۔ اللہ تعالیٰ کو اپنا مالک اور حاکم ماننے کے

بعد مجھے کیوں اپنا بادشاہ سمجھیں گے۔ یہ سوچ کر بادشاہ نے سب مسلمانوں کو پکڑ والیا اور فیصلہ کیا کہ ان کو ایسی سزا دینی چاہیے کہ پھر کوئی اللہ تعالیٰ کی بادشاہی کا نام نہ لے۔

بادشاہ نے بڑی بڑی کھائیاں کھدوائیں، بہت گہری اور خوب چوڑی۔ ان میں سوکھی لکڑیاں بھروائیں، اور ان میں آگ لگا دی۔ جب آگ خوب بھڑک اٹھی تو مسلمانوں کو وہاں لایا گیا اور ان سے کہا گیا کہ یا تم اپنی باتوں کو چھوڑ و نہیں تو ہم تم کو اسی آگ میں جلا کر بھسم کر دیں گے۔

اب مسلمانوں نے جو یہ حالت دیکھی تو بولے۔ ''ہم اپنے رب کا انکار کیسے کر دیں جس نے یہ سارا جہان پیدا کیا ہے۔ وہی اس کا مالک بھی ہے، وہی ہمارا بھی مالک ہے۔ ہم اس کے حکموں کو چھوڑ کر کسی دوسرے کی غلامی کیسے اختیار کر لیں۔ یہ زندگی تو چند روز کی ہے آخر ہمیں اسی کے پاس لوٹ کر جانا ہے وہ اگر ہم سے راضی ہو گیا ہو تو پھر ہمیں کیا غم؟۔ وہ ہم کو جنت دے گا۔ جنت میں ہر طرح کا آرام ہو گا۔''

مسلمانوں کی یہ باتیں سن کر بادشاہ آگ بگولہ ہو گیا اور حکم دیا کہ ان کو ایک ایک کر کے آگ میں جھونک دو۔

اللہ تعالیٰ کے یہ نیک بندے آگ میں جھونک دیئے گئے۔ بادشاہ اور اس کے ساتھی تماشا دیکھتے رہے۔۔ ان لوگوں کا قصور اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ یہ کہتے تھے:

''ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے ہیں، اسی کو اپنا آقا اور معبود جانتے ہیں۔

وہی سب سے بڑا اور طاقت والا ہے۔ ہر قوم کی تعریف کا حقدار وہی ہے آسمان اور زمین کی بادشاہی اسی کے لیے ہے۔

دنیا میں جو کچھ ہے، اسی کا ہے۔ مالک اور بادشاہ صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ ہر چیز اس کے سامنے ہے۔ وہ سب کچھ جانتا ہے اور سب کچھ کر سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے نہ ماننے والے خدا کے ماننے والوں کے کیسے دشمن ہو جاتے ہیں اور اپنی دشمنی میں کیا کچھ کر ڈالتے ہیں۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کا ذکر فرمایا ہے۔ اور فرمایا ہے کہ

''مارے گئے کھائیاں کھودنے والے۔''

آپ کہو گے'' یہ کیا بات ہوئی؟۔ کھائیاں کھودنے والے تو بادشاہ اور اس کے ساتھی تھے وہ کہاں مارے گئے؟۔ بے چارے مسلمان ہی آگ میں جلا ڈالے گئے۔''

بات یہ ہے کہ مسلمان کی نظر میں اصلی کامیابی آخرت کی کامیابی ہے۔ اس دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے وہ نہ تو اچھے کاموں کا بدلہ ہوتا ہے اور نہ برے کاموں کی سزا یہ تو امتحان کی جگہ ہے۔ اصل بدلہ تو مرنے کے بعد اللہ تعالیٰ آخرت میں دے گا۔

اب آپ سمجھ گئے ہو گے کہ یہ کیا بات ہوئی؟۔۔۔ جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے ان نیک بندوں کو آگ میں جلایا۔ ان کو مرنے کے بعد دوزخ میں جلایا جائے گا۔ ان کے لیے وہاں بہت ہی سخت عذاب ہو گا، ہمیشہ کا عذاب۔۔۔ اور جو لوگ یہاں آگ میں ڈالے گئے ان کو اللہ تعالیٰ جنت دے گا جس میں نہریں ہوں گی۔ جہاں وہ ہمیشہ آرام سے رہیں گے۔

اب کون کامیاب رہا اور کون ناکام؟۔ کون ہارا اور کون جیتا؟۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ کامیاب وہی رہا جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا، جس نے اس زندگی میں اچھے اچھے کام کیے، کسی وقت بھی اللہ تعالیٰ کے حکموں سے منہ نہ موڑا۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو اپنا آقا نہ جانا۔ اور ناکام وہ رہا جس نے اللہ تعالیٰ کو بھلا دیا، جس نے اس کے حکموں کو سچا نہ جانا۔ اللہ کی بندگی کے بدلے کسی اور کی بندگی کی۔

اس دنیا میں اکثر ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندے تکلیفیں اٹھاتے ہیں، طرح طرح سے ستائے جاتے ہیں اور اسی راہ میں مارے بھی جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے نہ ماننے والے برے لوگ خوب مزے اُڑاتے ہیں اور چین سے رہتے ہیں۔۔۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ماننے والے ناکام ہو گئے، اور اس کے نہ ماننے والے جیت گئے۔ اصل ہار جیت آخرت کی ہار اور جیت ہے۔ وہ زندگی سدا رہنے والی ہے، جو کوئی دوزخ سے بچ گیا اور جنت میں داخل ہو گیا۔ بس سمجھو وہی جیت گیا۔ اس زندگی کا دکھ کوئی دکھ نہیں۔

اللہ کی مار اور اس کی پکڑ بہت سخت ہے۔ وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔

انسان کو چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو خوش کر لے۔ یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

اے اللہ! ہم سے ایسے کام کرنا جن سے تو راضی ہو جائے۔ اے اللہ! ہم کو دوزخ کی آگ سے بچا۔ تو معاف کرنے والا ہے اور بہت محبت کرنے والا ہے۔

اصحاب الفیل

ہاتھیوں والے

ملک عرب میں مکہ ایک شہر کا نام ہے۔ کوئی ساڑھے چار ہزار برس ہوئے مکہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کی عبادت کے لیے ایک گھر بنایا تھا۔ اسی گھر کا نام ہے کعبہ۔ ہم اسی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں۔

پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیدا ہونے سے پہلے بھی عرب کے لوگ کعبے کی بہت عزت کرتے تھے۔ اس کی زیارت کے لیے جاتے اور وہاں جا کر عبادت کیا کرتے تھے۔

جس سال پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیدا ہونے والے تھے، اسی سال کا ذکر ہے، یمن کے بادشاہ ابرہہ نے چاہا کہ وہ اللہ کے اس گھر (کعبہ) کو ڈھا دے۔ ابرہہ عیسائی تھا۔

ابرہہ نے اپنے شہر میں ایک بہت بڑا گرجا بنوایا تھا۔ عیسائی لوگ جس جگہ جمع ہو کر عبادت کرتے ہیں اسے گرجا کہتے ہیں۔

ابرہہ نے یہ گرجا بہت خوب صورت بنوایا تھا۔ جب گرجا بن کر تیار ہو گیا تو ابرہہ نے چاہا کہ عرب کے لوگ کعبہ کے بدلے اس گرجا کی زیارت کرنے آیا کریں۔ اس بات کے لیے اس نے بہت کوشش کی لیکن لوگوں نے کعبہ کی زیارت کرنا نہ چھوڑی۔ یہ دیکھ کر ابرہہ نے ایک تدبیر سوچی۔

ابرہہ نے سوچا کہ لاؤ اس کعبہ ہی کو ڈھا دیں۔ جب کعبہ نہ ہوگا تو لوگ میرے گرجا کی زیارت کرنے کے لیے آیا کریں گے۔ یہ سوچ کر اس نے ایک بہت بڑی فوج تیار کی۔ اس فوج میں بہت سے ہاتھی بھی تھے۔ ابرہہ ان ہاتھیوں اور اپنی فوج کو لے کر

کعبہ کو ڈھانے کے لیے چلا۔

جب یہ فوج مکہ کے قریب پہنچی تو فوج کے سپاہیوں نے مکہ والوں کے بہت سے جانور پکڑ لیے۔ ان جانوروں میں دوسو اونٹ پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دادا کے بھی تھے۔ ان کا نام عبدالمطلب تھا۔ عبدالمطلب صاحب مکہ کے ایک بڑے سردار تھے اور کعبہ کی دیکھ بھال بھی ان کے ذمے تھی۔

مکہ والوں نے جو دیکھا کہ ابرہہ کی بڑی فوج بڑھتی چلی آرہی ہے تو وہ گھبرا گئے۔ بڑے لوگ ایک جگہ جمع ہوئے۔ آپس میں مشورہ کیا کہ کیا کرنا چاہیئے؟۔ سب نے یہی کہا کہ ہماری طاقت نہیں کہ اتنی بڑی فوج کا مقابلہ کرسکیں۔ ہمیں تو اپنی جان بچانے کی فکر کرنا چاہیئے۔ یہ سوچ کر سب مکے کے قریب کی پہاڑیوں میں جا کر چھپ گئے اور کعبہ کو یوں ہی چھوڑ گئے۔

ابرہہ بھی مکہ والوں سے لڑنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ کعبہ کو ڈھانے آیا تھا۔ اس نے اپنے ایک آدمی کو عبدالملطب کے پاس بھیجا۔ اس نے آکر کہا۔ ''ہمارے بادشاہ تم لوگوں سے لڑنا نہیں چاہتے، وہ تو کعبہ کو ڈھانے آئے ہیں۔ اگر تم لوگ کچھ نہ بولو گے تو ہم بھی تم سے کچھ نہ کہیں گے اور اگر تم ہمیں کعبہ ڈھانے نہ دو گے تو پھر ہم تم سے لڑیں گے اور تمہیں مار بھگائیں گے۔''

بادشاہ کا یہ پیغام سن کر عبدالمطلب بولے۔ ''ہم بھی تمہارے بادشاہ سے لڑنا نہیں چاہتے۔ ہماری اتنی طاقت نہیں کہ ہم تمہارا مقابلہ کرسکیں۔ رہ گیا کعبہ کا ڈھانا تو بھائی یہ تو اللہ تعالیٰ کا گھر ہے۔ اس کے پیارے دوست حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بنایا ہوا۔ اگر اللہ اس گھر کو باقی رکھنا چاہے گا تو وہ خود اس کی حفاظت کا انتظام فرمادے گا۔ ہمیں کعبہ کی کوئی فکر نہیں ہے۔''

عبدالمطلب کی بات سن کر بادشاہ کے آدمی نے کہا کہ آپ چل کر ہمارے بادشاہ سے مل لیجئے۔ عبدالمطلب ابرہہ سے ملنے گئے۔ ابرہہ نے ان کی بڑی عزت کی اور اپنے پاس بٹھایا۔

جب بات چیت شروع ہوئی تو عبدالمطلب نے کعبہ کے بارے میں کچھ نہ کہا، اپنے دوسو اونٹوں کو چھڑانے کی کوشش کی۔ یہ دیکھ کر ابرہہ کو بڑا تعجب ہوا۔ اس نے کہا میں تو سنتا تھا کہ تم لوگوں کی نظر میں کعبہ کی بڑی عزت ہے، تم اس کو اپنی جان سے پیارا جانتے ہو مگر بڑے تعجب کی بات ہے کہ میں اسے ڈھانے کے لیے آیا اور تم نے اس کے بارے میں ایک لفظ بھی نہ کہا، بس اپنے اونٹوں کی شکایت لے کر بیٹھ گئے۔

یہ سن کر عبدالمطلب بولے:

''اے بادشاہ! اونٹ تو میرے ہیں، اس لیے میں نے ان کو چھوڑنے کے لیے کہا، کعبہ میرا نہیں ہے اللہ تعالیٰ کا ہے، وہ خود اپنے گھر کی حفاظت کرنے والا ہے، اگر اس کا فیصلہ اس کو باقی رکھنے کا ہوگا تو پھر کوئی اسے ڈھا نہیں سکتا۔ وہ خود اس کی حفاظت کرے گا۔''

ابرہہ نے یہ بات سن کر عبدالمطلب کے اونٹ واپس کر دیئے، اور کعبہ پر چڑھائی کے لیے تیار ہوگیا۔

عبدالمطلب نے ابرہہ کے پاس سے واپس آکر سب بات چیت مکے کے سرداروں کو سنادی۔ سب لوگ بہت غمگین ہوئے لیکن کیا کرتے، نہ تو ان میں اتنی طاقت تھی کہ ابرہہ کی فوج کو مار بھگا دیتے اور کعبہ کی حفاظت کرتے، نہ ان کے دل میں کعبہ کی اتنی محبت تھی کہ اس کو بچانے کے لیے اپنی جان پر کھیل جاتے اور اپنے جیتے جی کسی کو کعبہ کی ایک اینٹ بھی نہ اکھاڑنے دیتے۔ مکہ چھوڑ کر بھاگنے سے پہلے سب سردار کعبے میں آئے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کی۔

''اے اللہ! ہم تیرے گھر کی حفاظت نہیں کرسکتے، تو خود اس کی حفاظت فرمانا۔ تیرا فیصلہ اگر نہ ہوگا تو کوئی بھی کعبے کو نہ ڈھا سکے گا۔ اور اگر تو ہی یہ چاہتا ہے کہ تیرا مقدس گھر ڈھایا جائے تو پھر ہم کون؟۔ جو تیرا فیصلہ ہو وہی کر۔''

اگلے دن صبح ابرہہ اپنی فوج لے کر آگے بڑھا۔ آگے آگے ہاتھی تھے اور ان کے پیچھے پیچھے سپاہی۔ ابھی یہ فوج مکہ تک پہنچی نہیں تھی کہ ایک دم آسمان پر بہت سے پرندے

دکھائی دیئے۔ ان پرندوں کے غول کے غول اڈے چلے آرہے تھے۔ ہر پرندے کی چونچ اور پنجوں میں کنکریاں تھیں۔ پرندوں نے آتے ہی ان کنکریوں کو فوج پر پھینکنا شروع کر دیا۔

کنکریاں کیا تھیں اللہ تعالیٰ کا عذاب تھا، یا یوں سمجھیں کہ زہر میں بجھی ہوئی گولیاں تھیں۔ جس سپاہی کے کنکری پڑ جاتی بدن کو پھوڑ کر باہر نکل آتی اور دیکھتے دیکھتے اس کا سارا بدن سڑنے لگتا۔ یہی حال ہاتھیوں کا ہوا۔ تھوڑی ہی دیر میں سارا لشکر ڈھیر ہو گیا۔ ہاتھی تو ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے گلے ہوئے بھوسے کے ڈھیر ہوں۔

سچ ہے اللہ تعالیٰ کو بڑی قدرت ہے۔ وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ اس کے مقابلے میں کوئی جیت نہیں سکتا۔

اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کا ذکر قرآن میں فرمایا ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیدائش سے چالیس یا پچاس دن پہلے یہ واقعہ ہو چکا تھا۔ یوں سمجھنا چاہیئے کہ ایک طرح اللہ تعالیٰ نے مکہ والوں کو یہ بتایا تھا کہ جس اللہ تعالیٰ نے اس طرح اپنی قدرت سے کعبہ کو دشمنوں سے بچایا ہے اسی طرح اب وہ کعبہ کے بنانے والے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لائے ہوئے دین کو بھی اس کے دشمنوں سے بچائے گا اور یہی ہوا، اللہ تعالیٰ نے مکہ میں اپنے آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پیدا فرمایا:

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لائے ہوئے دین اسلام کو پھر سے زندہ کیا۔ کعبہ کو بتوں کی گندگی سے پاک کیا اور اسے پھر اللہ تعالیٰ کی خالص عبادت کا سب سے بڑا مرکز بنا دیا۔

یہی کعبہ آج اسلام کا قبلہ ہے، اسی کی طرف منہ کر کے ہم نماز پڑھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو بڑی قدرت ہے، وہ جو چاہے کرتا ہے۔
